حکمت کا قرآنی تصور: قدیم وجدید تفسیری اطلاقات کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

عرفان قیصر

پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

رجسٹریشن نمبر: 795-PhD/IS/F18

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

نومبر، 2023ء

حکمت کا قرآنی تصور: قدیم وجدید تفسیری اطلاقات کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

عرفان قیصر

پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر، شعبہ اسلامی فکر وثقافت

رجسٹریشن نمبر 795-PhD/IS/F18

نگران مقالہ

ڈاکٹر نور حیات خان

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبہ اسلامی فکر وثقافت

نمل، اسلام آباد

شعبہ اسلامی فکر وثقافت، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن (2018ء-2023ء)

© عرفان قیصر، 2023ء

بسم الله الرحمن الرحيم

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، فیکلٹی آف سوشل سائنسز

منظوری فارم برائے مقالہ ودفاع مقالہ

(Thesis and Defence Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **حکمت کا قرآنی تصور: قدیم وجدید تفسیری اطلاقات کا تجزیاتی مطالعہ**

Qur'anic Concept of Al-Hikma: Analytical study of Ancient and Modern applications of Tafsir

نام ڈگری: ڈاکٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: عرفان قیصر

رجسٹریشن نمبر: 795-PhD/IS/F-18

ڈاکٹر نور حیات خان
(نگران مقالہ) — ____________ دستخط نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی
(صدر، شعبہ اسلامی فکر وثقافت) — ____________ دستخط صدر، شعبہ اسلامی فکر وثقافت

پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) — ____________ دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی (ہلال امتیاز ملٹری)
(ریکٹر نمل) — ____________ دستخط ریکٹر نمل

تاریخ: ____________

حلف نامہ فارم
(Candidate Declaration Form)

میں عرفان قیصر   ولد نور الٰہی

رجسٹریشن نمبر: 795-PhD/IS/F-18

طالب علم، پی ایچ ڈی، شعبہ اسلامک تھاٹ اینڈ کلچر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ

مقالہ بعنوان: **حکمت کا قرآنی تصور: قدیم وجدید تفسیری اطلاقات کا تجزیاتی مطالعہ**

Qur'anic Concept of Al-Hikma: Analytical study of Ancient and Modern applications of Tafsir

پی ایچ ڈی اسلامک فکر اور ثقافت کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے اور **ڈاکٹر نور حیات خان** کی زیر نگرانی تحریر کیا گیا ہے، یہ راقم الحروف کا اصل کام ہے اور مزید یہ کہ مذکورہ کام کہیں اور جمع کرایا گیا ہے نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: عرفان قیصر

دستخط مقالہ نگار: ____________________

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Abstract

Qur’anic Concept of Al-Hikma: Analytical study of Ancient and Modern applications of Tafsir

The term al-Ḥikmah is used twenty times in Holy Qur’ān, in different meanings and contexts. Its linguistic and connotative concepts invite scholars and intellectuals to grasp the real meaning and interpretation of the term. The rationale, philosophy, reason and purpose for repeatedly using this term al-Ḥikmah are central to know. Mufassirīn have mentioned different meanings and interpretation of term al-Ḥikmah according to their knowledge and understandings. Allah has demonstrated his wisdom everywhere now it’s up to the intellectuals to conduct research, find results and conclude from it. The trait of al-ḥikma contains many features and attributes that are not exclusive for prophets. Understanding of al-Qur’ān is not possible without wisdom and al-Ḥikmah. This research work presents opinions of Mufassirīn regarding the linguistic and connotative meanings of term al-Ḥikmah and also discusses the findings and conclusions.

The term of Tadbīr-i manzil is related to al-Ḥikmah and Strategy.This term is also a type of strategy in which issues are discussed which are related to a limited group i.e. the members of the household. They include husband, wife, children and subordinates. The Mufassirīn have described the interpretive applications of wisdom in these areas, that is, how should their entire reformation be done according to the Holy Quran.

There is also a term of Siyāsat-i madanī to al-Ḥikmah. This is also a type of strategy. It discusses issues related to the wider scope of the community and the public interest of being a city or citizens. It specifically includes the rights and responsibilities of the ruler and the people under him.

Both these debates have been discussed in this article. In these discussions, these exegetical applications are described by the commentators and the strategies employed by those within these categories are described and analyzed.

فہرست موضوعات

نمبر شمار	موضوعات	صفحہ
۱.	مقدمہ	ii
۲.	باب اول: حکمت کا قرآنی تصور اور تفسیری اطلاقات	۱
۳.	فصل اول: حکمت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم	۲
۴.	فصل دوم: قرآن کریم میں صیغہ حکمت کے مشتقات اور تفسیری اطلاقات	۱۶
۵.	فصل سوم: حکمت کے تصورات اور تفسیری اطلاقات	۴۱
۶.	مبحث اول: مفسرین کے نزدیک حکمت کا تصور	۴۱
۷.	مبحث دوم: صوفیاء کے نزدیک حکمت کا تصور	۵۸
۸.	فصل چہارم: حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاحات اور تفسیری اطلاقات	۶۷
۹.	باب دوم: قرآن کریم میں حکمت کی جہات اور مفسرین کی آراء کا تجزیہ	۱۳۲
۱۰.	فصل اول: اللہ تعالیٰ کی صفت الحکیم کے قرآنی اطلاقات	۱۳۳
۱۱.	فصل دوم: قرآن کریم کی صفت حکمت	۱۵۵
۱۲.	فصل سوم: نبی کریم ﷺ کی صفت حکمت	۱۶۳
۱۳.	فصل چہارم: انبیاء علیہم السلام کی صفت حکمت	۱۷۵
۱۴.	فصل پنجم: صالحین کی صفت حکمت	۱۹۷
۱۵.	باب سوم: دعوت دین اور تدبیر منزل میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور اطلاقات	۲۰۷
۱۶.	فصل اول: دعوت دین میں حکمت اور اس کے اطلاقات	۲۰۸
۱۷.	مبحث اول: دعوت دین میں سبیل ربك کا مفہوم	۲۰۸
۱۸.	مبحث دوم: داعی کے لحاظ سے قرآنی حکمت کے مظاہر	۲۱۶
۱۹.	مبحث سوم: مدعو کے لحاظ سے قرآنی حکمت کے مظاہر	۲۲۷
۲۰.	فصل دوم: معاشرتی و سماجی زندگی میں حکمت اور اس کے اطلاقات	۲۳۱
۲۱.	مبحث اول: تہذیب نفس میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور اطلاقات	۲۳۱
۲۲.	مبحث دوم: تدبیر منزل میں میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور اطلاقات	۲۴۲
۲۳.	مبحث سوم: زوجین کے حقوق میں توازن کی حکمت کی قرآنی تعلیمات	۲۶۱

۲۴.	**فصل سوم: معاشرتی زندگی میں حکمت کی قرآنی تعلیمات**	۲۶۵
۲۵.	مبحث اول: ذوی القربی کے حقوق اور صلہ رحمی میں حکمت کے اطلاقات	۲۶۵
۲۶.	مبحث دوم: ہمسایہ کے حقوق میں قرآنی حکمت کے اطلاقات	۲۷۰
۲۷.	**باب چہارم: سیاست مدن اور معاش میں حکمت کے تصورات اور اطلاقات**	۲۷۶
۲۸.	**فصل اول:** سیاست مدن میں حکمت کے اطلاقات	۲۷۷
۲۹.	مبحث اول: سیاست مدن کا مفہوم، خلافت کی ضرورت اور حاکم کی ذمہ داریاں	۲۷۷
۳۰.	مبحث دوم: قانون وعدالت کا نفاذ اور اس کی حکمت	۲۹۸
۳۱.	مبحث سوم: تدریج وتنفیذ کی حکمت عملی اور اس کے اطلاقات	۳۰۵
۳۲.	**فصل دوم: معیشت میں حکمت قرآنی کے اطلاقات**	۳۱۰
۳۳.	مبحث اول: اکتساب مال میں حدود قیود کی حکمت	۳۱۰
۳۴.	مبحث دوم: صرف مال میں حدود وقیود کی حکمت	۳۲۱
۳۵.	**خلاصہ مقالہ**	۳۲۶
۳۶.	**نتائج**	۳۳۰
۳۷.	**سفارشات**	۳۳۱
۳۸.	**فہارس**	۳۳۲
۳۹.	فہرست آیات قرآنی	۳۳۲
۴۰.	فہرست احادیث مبارکہ	۳۴۰
۴۱.	فہرست اعلام	۳۴۳
۴۲.	فہرست اصطلاحات	۳۴۳
۴۳.	فہرست مصادر ومراجع	۳۴۴

اظہار تشکر و امتنان

الحمدللہ حمدا کثیرا والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین وحبیب رب العالمین

ہر طرح کی حمد وثناء اللہ تعالیٰ کے لیے جو ہر ابتداء سے اول اور ہر انتہاء سے آخر ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لا متناہی درود اور لا متناہی سلام ہو اللہ تعالیٰ کے حبیب مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم پر جو حکمت کا شہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں ہیں تمام صحابہ کرامؓ پر جنھوں نے اپنی مال وجان سے بڑھ کر اسلام کی خدمت کی اور اللہ تعالیٰ کو راضی کیا اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا۔

میں بہت زیادہ شکر گزار ہوں اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر نور حیات خان کا جنہوں نے ہر لمحہ اپنی قیمتی مصروفیات سے وقت نکال کر اس تحقیقی کام میں میری رہنمائی فرمائی۔ جہاں جہاں اور جب جب بھی مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت پڑتی آپ تب ہی مشکل سے مشکل کام کو آسان بنانے میں مدد فراہم کرتے۔ یقیناً انہی کی بدولت یہ تحقیق کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔

میں ممنوں ہوں پروفیسر ڈاکٹر خالد سلطان (ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز)، پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی (ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ شعبہ اسلامی فکر وثقافت)، ڈاکٹر سید عبدالغفار بخاری (سابق صدرِ شعبہ) اور شعبہ اسلامی فکر وثقافت کے تمام اساتذہ جنہوں نے علمی امور اور تحقیق وتدریس کے کٹھن مراحل میں ہر اعتبار سے میری ہر مقام پر حوصلہ افزائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ اس جامعہ کو اور اس شعبہ کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطاء فرمائے۔ آمین

میرے اہل خانہ کے تمام افراد خصوصا والدین، بھائی، بہنیں، میری زوجہ محترمہ اور بچے بھی میرے شکریہ کے بہت زیادہ مستحق ہیں جن کا مالی تعاون اور دعاؤں کو ساتھ رہا۔ میرے والدین ہر لمحہ میری اس ڈگری کے لیے دعا گو رہتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیراً کثیراً عطاء فرمائے۔ آمین

میں اپنے رفقاء کرام، تمام لائبریریوں کے متعلقہ سٹاف کا، سافٹ ویئر بنانے والوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس تحقیقی کام کو مکمل کرنے میں اِن کی معاونت بھی شامل حال رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو جائے اور دنیا اور دین میں ان کو خیر کثیر عطاء فرمائے۔ آمین یا رب العالمین بجاہ سید المرسلین وخاتم النبیین

عرفان قیصر

پی ایچ ڈی سکالر، نمل، اسلام آباد

انتساب(DEDICATION)

میں اپنی اس کاوش کو

اللہ تعالیٰ کے حبیب مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کرتا ہوں جن کے

بدولت ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوئی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَولَانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَ صَحْبِہٖ وَ بَارِکْ وَ سَلِّم

مقدمہ

الحمد للہ و کفی و الصلوۃ و السلام علی من لا نبی بعدہ و علی الہ و اصحابہ و بارک وسلم

موضوع تحقیق کا تعارف اور ضروت و اہمیت (Introduction)

اسلام کے نقطہ نظر سے حکمت تمام اقدار کی اساس ہے اور اس کے بر عکس جہل و نادانی تمام سماجی و انفرادی مفاسد کی جڑ ہے۔ انسان اپنے تمام حرکات و سکنات میں اس حکمت کا محتاج ہے جو اس کو اللہ تعالی کی طرف سے عطیہ کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ انسان کے عقائد و اخلاق اور اعمال و کردار کو عطا کردہ حکمت کے اصولوں کے تحت استوار کرنا چاہیے۔

'حکمت' دانائی کی باتوں کے لیے ایک معروف لفظ ہے اور نہایت کثیر الاستعمال ہے، لیکن مختلف علوم کے ماہرین اور اہل لغت اس کی تعبیر اتنے مختلف طریقوں سے کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک عام لفظ کے اندر کتنا جہان معانی آباد ہے۔ صوفیا اپنی کاوشوں کو حکمت کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اہل لغت اس کا مفہوم کچھ اور بیان کرتے ہیں، اہل تاویل کے مابین قرآن کے اندر لفظ 'حکمت' کے معانی کے تعین میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں یوں تو لفظ 'حکمت' متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کے بیان میں تعلیم حکمت کی تکرار اس قدر نمایاں ہے کہ آدمی اس کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید کے ایک طالب علم کے لیے حکمت کے مفہوم کو سمجھنا ازبس ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم کی ہر آیت حکمت سے مزین ہے۔ ان آیات کے اتنے وسیع مفاہیم ہیں کہ چودہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ بیت گیا مفسرین ان الفاظ کی تفسیر مختلف انداز سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، قرآن کریم کا یہ اعجاز تا قیامت جاری رہے گا اس لیے کہ اللہ تعالی نے اس کتاب کو حکیم کے نام سے موسوم فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یس. وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ﴾[1]

یسن۔ حکمت سے معمور قرآن کی قسم

حکمت سے متعلق اسلامی نظریات کو پیش کرنے میں یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ دین اسلام حکمت کے کن اصولوں کی پاسداری کا تقاضا کرتا ہے، حکمت کے کس گوشہ میں انسان کی رہنمائی و نجات ہے، کس حکمت کے بارے

۱۔ یٰسین ۳۶:۲

میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مومن کی گمشدہ میراث قرار دیا ہے، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

''الْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا''[2]

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حکمت کی بات مومن کی گمشدہ چیز ہے جہاں کہیں بھی اسے پائے وہ اسے حاصل کر لینے کا زیادہ حق رکھتا ہے''۔)

دین اسلام نے حکمت کے تحت سرانجام دیئے ہوئے امور کو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ امور فرمایا ہے۔ حکمت جہالت اور بُرے اخلاق سے دور رکھتی ہے اور اس کا اطلاق ہر قسم کے نقص سے خالی علم اور ایسے ٹھوس و مستحکم امر پر ہوتا ہے جس میں خطا و غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

قرآن کریم میں لفظ حکمت کا مادہ (احکم) ۱۲۳ بار مختلف صیغوں سے استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں لفظ حکمت ۲۰ بار استعمال ہوا ہے، جب کہ ۹۱ ایسے مقامات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے لفظ حکیم کے ذریعے اپنے وصف بیان فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں لفظ حکیم لفظ علیم کے ساتھ ۳۶ بار، لفظ عزیز کے ساتھ ۴۷ بار، خبیر کے ساتھ ۴ بار اور تواب، حمید اور علی اور واسع کے ساتھ ایک ایک بار استعمال ہوا ہے۔

حکمت کا مصدر احکام ہے جس کے معنی علم و عمل یا ان سارے امور میں استحکام کو پیش نظر رکھنا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں بھی لفظ حکمت استعمال ہوا ہے، غور و فکر اور تدبر و تعقل کرنے سے اس لفظ حکمت کے وسیع معانی سامنے آتے ہیں۔ حکمت گویا انسانوں کو انسانیت کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچنے کے لیے علمی و عملی اور روحانی اسباب اور بنیادی فراہم کرنا ہے۔

قرآن کریم میں لفظ حکمت کا استعمال مختلف وجوہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

۱۔ صفات باری تعالیٰ کے لیے

۲۔ موعظت و نصیحت کے لیے

۳۔ سنت اور طریقہ

۴۔ علم و فہم

۵۔ نبوت

۲۔ ابن ماجہ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی، سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الحکمۃ، رقم الحدیث ۴۱۶۹

زیر نظر موضوع قرآن کریم میں لفظ حکمت اور اس کے مادہ نیز تمام مدلولات کا قرآنی تصور تفاسیر کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس کے عصری اطلاقات کا جائزہ بھی قدیم و جدید مفسرین کی آرا کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

مقاصد تحقیق

موضوع تحقیق کے چند مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ حکمت کا معنی اور مفہوم بیان کرتے ہوئے قرآن کریم میں اصطلاح حکمت والی آیات کو جمع کرنا

۲۔ حکمت کے قریب المعنی اصطلاحات قرآنی کو واضح کر کے ان کی تفصیل مفسرین کرام کی آراء کی روشنی میں واضح کرنا

۳۔ مفسرین کرام کے نزدیک حکمت کے اطلاقات کے واضح کرنا

۴۔ انبیاء کرام بالخصوص نبی کریم ﷺ کی صفت حکمت کی تفصیل مفسرین کرام کی آراء کی روشنی میں واضح کرنا

۵۔ حکمت عملیہ کے اُصول قرآن کریم اور مفسرین کرام کی آراء کی روشنی میں واضح کرنا

تحدید موضوع

حکمت کا قرآنی تصور: یہ موضوع قدیم و جدید تفسیری اطلاقات اور علوم القرآن کی مباحث تک محدود رہے گا۔

موضوع تحقیق کے بنیادی سوالات

۱۔ حکمت سے کیا مراد ہے؟ قرآن کریم کا تصور حکمت کیا ہے؟

۲۔ حکمت کی قریب المعنی اصطلاحات قرآن مجید میں مذکور ہیں؟ ایسی صفات ذکر کی گئی ہیں جن پر حکمت کا اطلاق کیا جا سکے؟

۳۔ مفسرین کرام نے اصطلاح حکمت سے کیا کیا معانی مراد لیے ہیں؟

۴۔ حکمت عملیہ کے اُصول قرآن کریم میں مذکور ہیں؟ مفسرین کرام نے ان پر حکمت کا اطلاق کس طرح کیا ہے؟

۵۔ قرآن کریم میں انبیاء کرام بالعموم اور نبی کریم ﷺ کی سیرت و تاریخ ذکر کرتے ہوئے حکمت کے کن عملی مظاہر کا ذکر کیا ہے؟ ان انبیاء کرام نے حکمت پر مبنی کیا اقدامات اٹھائے ہیں جن کو مفسرین کرام نے ذکر فرمایا ہے؟

سابقہ کام کا جائزہ

۱۔ حکمۃ القرآن : حکمت قرآن : علامہ حمید الدین فراہی

آپ نے اپنی کتاب میں مختصراً حکمت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کو بیان کرنے کے بعد امام شافعی کے اس قول پر تفصیلا نقد کیا ہے جس میں انہوں نے حکمت سے سنت مراد لی ہے۔اس کے علاوہ آپ نے تفسیر بالماثور میں سے مفسرین کے اقوال بیان کیے ہیں اور حکمت کے مختلف مفاہیم کو بیان کر کے ان پر اپنی رائے کے مطابق نقد وارد کیا ہے۔اسی طرح آپ نے اپنی رائے کو تفصیلا بیان کرتے ہوئے حکمت کی مختلف جہات کو بیان کیا ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں حکمت کا تصور : قرآن مجید کا تصور حکمت (سہ ماہی تحقیقات اسلامی' علی گڑھ 'جولائی تا اکتوبر ۱۹۸۳ء)'صفحات :۲۱

اس مقالہ میں حکمت کے مختلف پہلوؤں پر طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ حکمت اور سنت میں فرق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ حکمت عملی پر مختصر بحث کی گئی ہے۔

منہج تحقیق

۱۔ اس تحقیقی مقالہ کا منہج تجزیاتی اور استنباطی رہا ہے۔

۲۔ طریقہ تحقیق میں معیاری تحقیق (Qualitative Research) کو اختیار کیا گیا ہے۔

۳۔مقالہ بنیادی طور پر تفسیر اور اصول تفسیر سے متعلق ہے۔اس لیے اصطلاحات کی وضاحت کے لیے علوم القرآن کی کتب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۴۔لغوی معانی و اصطلاحات کے لیے لغات القرآن کر پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۵۔قرآن کریم میں جن آیات میں اصطلاح حکمت وارد ہوئی ہیں ان آیات کی تفسیر میں اصول تفسیر کو مد نظر رکھا گیا ہے۔یعنی تفسیر القرآن بالقرآن، تفسیر القرآن بالحدیث، تفسیر القرآن باقوال الصحابہ کے ساتھ ساتھ تفسیر بالماثور کی کتب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۶۔ اس موضوع پر کام کرنے کے لیے قرآن کریم کی قدیم تفاسیر میں

۱۔ جامع البیان فی تفسیر القرآن /الطبری (ت ۳۱۰ھ-)

۲۔ تأویلات اہل السنۃ ــــ ابو منصور الماتریدی (ت 333ھ-)

۳۔ بحر العلوم /ابو اللیث السمرقندی (ت ۳۷۵ھ-)

۴۔ الکشف والبیان /ابو اسحاق الثعلبی (ت ۴۲۷ھ-)

۵۔ النکت والعیون /ابو الحسن الماوردی (ت ۴۵۰ھ-)

۶۔ معالم التنزیل /البغوی (ت ۵۱۶ھ-)

۷۔ المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز /ابن عطیۃ الاندلسی (ت ۵۴۶ھ-)

سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جدید تفسیری ادب میں مفاتیح الغیب، التحریر والتنویر، فی ظلال القرآن، علامہ حمید الدین فراہی کی تفسیر کے ساتھ ساتھ برصغیر کے جدید تفسیری ادب میں تدبر قرآن، تفہیم القرآن، معارف القرآن، ضیاءالقرآن سے بھی استفادہ کیا گیا ہے نیز صوفیانہ تفاسیر کی بنیادی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

جدید تحقیق کے ذرائع (انٹرنیٹ، سافٹ ویئر) سے استفادہ کیا گیا، جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

https://www.britannica.com/topic/tafsir

https://kitabosunnat.com/

https://wordpress.org/themes/hikma/

https://hadith.net/

https://www.asjp.cerist.dz/en/

مقالہ کی تحریر و تسوید اور حوالہ جات کے لئے NUML کے منظور شدہ فارمیٹ کو اختیار کیا گیا۔

- مقالہ میں آنے والے غیر معروف اسماء واماکن وغیرہ کا مختصر تعارف بھی حواشی میں دیا گیا ہے۔
- احادیثِ نبویہ کے حوالے میں مصنف کا مشہور نام' اور پھر مکمل نام' کتاب کا نام'' ناشر' مقام اشاعت' سن اشاعت' طبع' کتاب اور باب کا نام' حدیث نمبر اور آخر میں جلد اور صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔
- دیگر کتب کے حوالہ جات میں مصنف کا مشہور نام اور پھر مصنف کا مکمل نام' کتاب کا نام' ناشر' مقامِ اشاعت' سن اشاعت' طبع' اور اخر میں جلد اور صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔
- مقالہ میں آیات قرآنی کے ترجمے کے لیے مفتی شفیع علیہ الرحمہ کا ترجمہ لیا گیا ہے تاہم مختلف مقامات پر درج ذیل تراجم سے بھی استفادہ کیا گیا ہے:

ا۔ ترجمہ سید ابوالاعلی مودودیؒ

۲۔ ترجمہ پیر محمد کرم شاہؒ

۳۔ ترجمہ علامہ ادریس کاندھلویؒ

اِعتِذار

میں نے اپنی پوری کاوش سے مقالہ کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے اور امکانی حد تک تحقیق کے اصولوں کے پیش نظر بنیادی ماخذ و مراجع تک رسائی حاصل کی گئی ہے اور حوالہ جات کا درست اندراج کیا گیا ہے۔ موضوع کے لوازمات کا احاطہ کرنے کے لیے تحقیقی اسلوب اختیار کیا گیا ہے تاہم انسان کے ہونے کے ناطے بشری کمزوریوں کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس تحقیقی کاوش میں جو درست اور صواب ہے وہ من جانب اللہ ہے اور جو کمی یا کمزوریاں ہیں وہ راقم کی جانب سے ہیں۔ لہٰذا محققین اساتذہ کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس تحقیقی مقالہ میں جہاں کمی یا غلطی دیکھیں تو اس کی نشاندہی فرما کا اصلاح فرمائیں۔ راقم آپ کا احسان مند رہے گا۔ جزاکم اللہ خیرا

عرفان قیصر

باب اول
حکمت کا قرآنی تصور اور تفسیری اطلاقات

فصل اول: حکمت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

فصل دوم: قرآن کریم میں صیغہ حکمت اور اس کے مشتقات اور تفسیری اطلاقات

فصل سوم: حکمت کے تصورات اور تفسیری اطلاقات

مبحث اول: مفسرین کے نزدیک حکمت کا تصور اور تفسیری اطلاقات

مبحث دوم: صوفیاء کے نزدیک حکمت کا تصور اور تفسیری اطلاقات

فصل چہارم: حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاحات اور تفسیری اطلاقات

مبحث اول: **الإصلاح**	مبحث دوم: **التدبر**	مبحث سوم: **التذکر**
مبحث چہارم: **التفکر**	مبحث پنجم: **السدید**	مبحث ششم: **العقل**
مبحث ہفتم: **الفرقان**	مبحث ہشتم: **القسط**	مبحث نہم: **المتوسم**
مبحث دہم: **النُّھَی**	مبحث یازدہم: **أولو الالباب**	مبحث دوازدہم: **أولی الابصار**
مبحث سیزدھم: **الحلم**		

فصل اول

حکمت کا لغوی واصطلاحی مفہوم

قرآن کریم کی اصطلاح (الحکمة) کا اصل مادہ (ح ک م) ہے قرآن کریم میں یہ مادہ (حُکّمَ، حُکْم، حَکَم) کے ساتھ آیا ہے جس کا معنیٰ حاکم، حکم کرنا اور فیصلہ کرنے والا کے آتے ہیں۔اسی طرح یہ مادہ (حِکْم)(حِکْمَةٌ) اور (اَلْحِکْمَةُ) بھی ذکر کیا گیا ہے جو کہ ہمارے مقالہ کا موضوع ہے۔ یہ ثلاثی مجرد کے دو باب، باب نَصرَ يَنْصُرُ (حَکَمَ يَحْکُمُ) اور باب فَتَحَ يَفْتَحُ (حَکَمَ يَحْکَمُ) سے آتا ہے۔ امام فراہیدی (۷۱۸ء-۷۹۰ء) لکھتے ہیں:

”حكم: الحِكمةُ: مَرْجِعُها إلى العَدْل والعِلْم والحِلْم. ويقال: أحْكَمَتْه التَجارِبُ إذا كانَ حكيماً. وأَحْكَمَ فلانٌ عنّي كذا، أي: مَنَعَه وكلُّ شيء مَنَعْتَه من الفَساد“[1]

الحکمۃ حکم سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ عدل (معاملات کی درستگی)، علم اور حلم (نرمی) کے ہیں، کہا جاتا ہے، جو وسیع تجربات رکھتا ہو اس کو حکیم کہا جاتا ہے اور حَکَمَ کا معنیٰ ہے منع کرنا یعنی فلاں شخص کو اس کام سے منع کیا، ہر وہ چیز جو فساد سے روکے حکمت کہلاتی ہے۔

لغت کے امام ابن فارس (۹۴۱ء-۱۰۰۴ء) نے بھی حکمت کا یہی معنیٰ لکھ کر اس پر مزید اضافہ لکھا ہے:

”الْحَاءُ وَالْكَافُ وَالْمِيمُ أَصْلٌ وَاحِدٌ، وَهُوَ الْمَنْعُ. وَأَوَّلُ ذَلِكَ الْحُكْمُ، وَهُوَ الْمَنْعُ مِنَ الظُّلْمِ. وَسُمِّيَتْ حَكَمَةُ الدَّابَّةِ لِأَنَّهَا تَمْنَعُهَا، يُقَالُ حَكَمْتُ الدَّابَّةَ وَأَحْكَمْتُهَا. وَيُقَالُ: حَكَمْتُ السَّفِيهَ وَأَحْكَمْتُهُ، إِذَا أَخَذْتَ عَلَى يَدَيْهِ“[2]

حکمت السّفیہ کا معنیٰ جہل پن سے روکنا ہے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کا (ظلم) سے ہاتھ پکڑ لے۔

اہل عرب کے ہاں حکمت کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے ابو ہلال عسکری (۹۲۰ء—۱۰۵۰ء) ابن جریر بن عطیہ (۶۵۳ء—۷۲۸ء) کا ایک شعر اس طرح نقل کرتے ہیں:

أبَني حنيفة أحكموا سُفهاءكم ... إني أخافُ عليكمُ أن أغضبا[3]

اے قوم حنیفہ اپنے سفہاء (جہلا) کے منہ میں لگام دو (ان کو روکو)۔ مجھے ڈر ہے کہ میں تم پر غضب ناک نہ ہو جاؤں۔

اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ حکمت کا ایک معنیٰ روکنا اور منع کرنے کے بھی آتے ہیں۔ برہان الدین خوارزمی المطرزی (۱۱۴۳ء-۱۲۱۳ء) حکمت کا لغوی معنیٰ لکھتے ہیں:

” (وَالْحِكْمَةُ) مَا يَمْنَعُ مِنْ الْجَهْلِ وَأُرِيدَ بِهِ الزَّبُورُ فِي (قَوْله تَعَالَى) {وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ} [ص: ٢٠] وَقِيلَ كُلُّ كَلَامٍ وَافَقَ الْحَقَّ وَأَحْكَمَ الشَّيْءُ فَاسْتَحْكَمَ وَهُوَ مُسْتَحْكِمٌ “[4]

۱۔ فراہیدی، الخلیل بن احمد بن عمرو، **کتاب العین** (بیروت: مکتبہ الھلال، ۱۴۱۲ھ)، ۳۴/۲

۲۔ ابن فارس، احمد بن فارس بن زکریا، **مقاییس اللغۃ** (بیروت: دارالفکر، ۱۳۹۹ھ)، ۹۹/۳

۳۔ العسکری، الحسن بن عبد اللہ بن سہل، **دیوان المعانی** (بیروت: دارالجیل، ۱۹۹۱ء)، ۹۱/۱

۴۔ خوارزمی، ناصر بن عبد السید ابی المکارم ابن علی المطرزی، **المُغرِب فی ترتیب المُعرِب** (بیروت: دارالکتب العربی، ۱۴۱۰ھ)، ۱۲۵/۱

حکمت کا معنی جہل پن سے رکنا۔ قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق اسی معنی میں ارشاد ہے اور ہم نے ان کو حکمت (زبور) عطا فرمائی۔ ہر وہ کلام جو حق اور حقیقت کے موافق ہو اسے حکمت کہا جاتا ہے نیز حکمت کا معنی کسی چیز کو پختہ اور مضبوط کرنے کے بھی ہیں۔

ابن اثیر الجزری[1] (۱۱۶۰ء - ۱۲۳۳ء) لکھتے ہیں:

"هُوَ الَّذِي يُحْكِم الْأَشْيَاءَ ويُتْقِنُها وَيُقَالُ لِمَنْ يُحسِنُ دَقَائِقِ الصِّناعات ويُتْقِنُها: حَكِيم[2]

قرآن میں حکم اور حکیم کا معنی حاکم ہے، اور یہ صفت ایسے شخص کی ہے جو اشیاء یا امور کو احسن طریقے سے انجام دینے والا ہو اور جو چیزوں کو بے عیب، بے داغ اور مناسب طریقے سے تخلیق کرے اس کو حکیم کہا جاتا ہے۔

زین الدین رازی (م ۱۲۶۱ء) نے قرآن کریم میں (حکم) کا معنی اس طرح لکھا ہے:

"(الْحُكْمُ) الْقَضَاءُ وَقَدْ (حَكَمَ) بَيْنَهُمْ يَحْكُمُ بِالضَّمِّ (حُكْمًا) وَ (حَكَمَ) لَهُ وَحَكَمَ عَلَيْهِ. وَ (الْحُكْمُ) أَيْضًا الْحِكْمَةُ مِنَ الْعِلْمِ. وَ (الْحَكِيمُ) الْعَالِمُ وَصَاحِبُ الْحِكْمَةِ. وَالْحَكِيمُ أَيْضًا الْمُتْقِنُ لِلْأُمُورِ"[3]

حکم کا معنی فیصلہ کرنا اور اس کے صیغہ حَكَمَ يَحْكُمُ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ حَكَمَ کا معنی اس نے اس پر فیصلہ مسلط کیا، اس کا ایک صیغہ (حَكُمَ) کے ساتھ بھی آتا ہے جو حکمت سے مشتق ہے جس کا معنی علم ہے عالم کو بھی حکیم اور صاحب حکمت کہا جاتا ہے اور امور میں پختگی اور استحکام والا کو بھی حکیم کہا جاتا ہے۔

امام قرطبیؒ (۱۲۱۴ء - ۱۲۷۳ء) حکمت کا معنی روکنے، منع کرنے کے معنی میں لیتے ہیں، اسی کی وضاحت آپ یوں کرتے ہیں:

"الْحِكْمَة مِنْ هَذَا ; لِأَنَّهَا تَمْنَع صَاحِبهَا مِنْ الْجَهْل .وَيُقَال : أَحْكَمَ الشَّيْء إِذَا أَتْقَنَهُ وَمَنَعَهُ مِنْ الْخُرُوج عَمَّا يُرِيد ."[4]

اسی طرح (یعنی روکنے اور منع کرنے کے معنی میں) حکمت بھی ہے اس لیے کہ وہ ایسے شخص کو جس کے پاس حکمت ہے جہالت سے روکتی ہے، اسی معنی میں احکم الشی ہے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کام کا مضبوط ارادہ کر لے اور جو چیز اس کے مقصد کو حاصل ہونے میں رکاوٹ بنے اس کو وہ دور بھی کرے۔

---

۱ ۔ ابن اثیر کے نام سے دو بھائیوں نے شہرت پائی! ایک مجد الدین مبارک صاحب النہایہ فی غریب الحدیث والآثر (م۶۰۶ ہجری) دوسرے عزالدین صاحب اسد الغابہ (م ۶۳۰ھ)۔ مجد دین ابن اثیر الجزری کا نام مبارک بن محمد تھا۔ اور کنیت ابو السعادات ۵۴۴ ہجری میں جزیرہ ابن عمر میں پیدا ہوئے۔ علامہ ابن اثیرؒ شافعی المذہب تھے۔ صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ مصطفٰی (م ۱۰۶۷ھ) نے آپ کی تصنیفات کی تعداد بارہ لکھی ہے۔ تفسیر میں "کتاب الانصاب فی الجمع بین الکشاف"، أسماء الرجال میں کتاب الازواو الذوات، نحو میں کتاب الباہر فی الفروق فی النحو۔ کتاب البدیع، حدیث و متعلقات میں "کتاب الشافعی فی شرح مسند الشافعی"، جامع الاصول فی احادیث الرسول، النہایہ فی غریب الحدیث والاثر، غریب الحدیث میں علامہ ابن اثیرؒ کی یہ کتاب بہت مشہور اور متداول کتاب ہے۔ علامہ ابن اثیرؒ ۶۰۶ ہجری میں ۶۲ سال کی عمر میں موحل میں انتقال کر گئے۔ (سیوطی بغیۃ الوعاۃ ص ۳۸۵۔)

۲ ۔ ابن الاثیر، مجد الدین المبارک بن محمد بن محمد جزری، **النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر**، (بیروت: المکتبہ العلمیہ، ۱۳۹۹ھ)، ۳۲/۴

۳ ۔ رازی، زین الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر، **مختار الصحاح** (بیروت: المکتبہ العصریہ، ۱۴۲۰ھ)، ۷۷/۶

۴ ۔ قرطبیؒ، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، (ریاض، دار عالم الکتب، ۱۴۲۳ھ)، ۲۸۶/۱

اس سے واضح ہوا کہ امام قرطبیؒ کے نزدیک حق بات یا کسی چیز کی حقیقت تک رسائی کے لیے مضبوط وسائل کام میں لانے اور اس حقائق حاصل ہونے کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کا سد باب کرنے کا نام حکمت ہے۔

قرآن کریم میں حَكَمَ اور أحكم کے جو الفاظ آئے ہیں۔ فیروز آبادی[۱] (۱۳۲۹ء - ۱۴۱۴ء) اس کے بارے میں لکھا ہے :

"أتْقَنَه فاسْتَحْكَمَ، ومَنَعه عن الفَسادِ"[۲]

کسی کام یا امر میں مضبوط اور مستحکم (پختہ) ہونا اور ظلم وفساد سے روکنا ہے۔ گویا سمجھداری کے ساتھ کسی نقصان دہ چیز سے رکنا حکمت کہلاتا ہے۔

ابن منظور افریقی[۳] (۱۲۳۰ء -۱۳۱۱ء) نے حکمت کا معنی (العدل) سے کیا ہے،[4] آپ نے لکھا ہے کہ حدیث مبارکہ میں اشعار کے لیے حکم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، آپ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :

"إن فِي الشِّعْرِ كَلَامًا نَافِعًا يَمْنَعُ مِنَ الْجَهْلِ والسَّفَهِ والحكمة هذا قياسها؛ لأنها تمنع من الجهل، والمحكّم: المجرب المنسوب إلى الحكمة"[۵]

---

۱ ۔ آپ کا پورا نام أبو طاهر مجيد الدين محمد بن يعقوب بن محمد بن إبراهيم الشيرازي الفيروزآبادي ہے۔ جو محمد بن يعقوب الفيروزآبادي کے نام سے معروف ہیں۔ نسبتی نام "الشیرازی" اور "الفیروزآبادی" بالترتیب فارس کے دو شہر شیراز اور فیروزآباد کے شہروں کی طرف نسبت کرتے ہوئے ہے۔ آپ کی پیدائش ۷۲۹ھ (۱۳۲۹ء) کو "کارزین" میں ہوئی جو شیراز کا ایک علاقہ ہے۔ مجد الدین فیروزآبادی (۱۳۲۹ء—۱۴۱۴ء) ایک فرہنگ نویس تھے اور القاموس (القاموس المحیط) کے مرتب تھے، یہ تقریباً پانچ صدیوں تک سب سے زیادہ استعمال ہونے والیں عربی لغات میں سے ایک ہے۔ آپ نے حافظ ابن القیم، شیخ تقی الدین ابوالحسن السبکی، محمد بن یوسف الزرندی اور ابن نباتہ رحمہم اللہ سے استفادہ کر کے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ کے تلامذہ میں جمال مراکشی، ابن عقیل، صفدی اور حافظ بن حجر کا نام قابل ذکر ہے۔ حافظ بن حجر نے براہ راست "قاموس" کی کتاب آپ سے پڑھ کر ان کی تمام کتابوں کی روایت کی اجازت حاصل کی۔ آپ کی کی مشہور تصنیفات کی تعداد پچاس کے قریب ہے جو عربی لغت، تفسیر اور حدیث کے بارے میں لکھی جاچکی ہیں۔ آپ کی مشہور تصانیف القاموس المحیط، تحبیر الموشّین فی التعبیر بالسین والشین، شرح قصیدہ بانت سعاد، الروض المسلوف فیمالہ اسمان الی الوف، الدُّرر المبثّثۃ فی الغرر المثلثۃ؛ المثلث الکبیر، انواع الغیث فی اسماء اللیث، الجلیس الانیس فی اسماء الخندریس، مقصود ذوی الالباب فی علم الاعراب ہیں۔ امام فیروزآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھاسی (۸۸) سال عمر پائی اور ۸۱۷ھ (۱۴۱۵ء) کو یمن کے شہر زبید میں اس فانی دنیا سے اس حال میں کوچ کر گئے۔ (محمد بن علی الشوکانی، البدر الطالع، ص ۸۳۶)

۲ ۔ فیروزآبادی، مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب، **القاموس المحیط**، (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ للطباعۃ والنشر والتوزیع، ۱۴۲۶ھ)، ۱۶/۹

۳ ۔ آپ کا پورا نام محمد بن مکرم بن علی، أبو الفضل، جمال الدین ابن منظور الانصاري الرويفعي الإفريقي ہے۔ آپ قاہرہ میں ۶۳۰ ھجری میں پیدا ہوئے۔ آپ کے مشہور شیوخ میں مرتضیٰ، ابن المقیر، یوسف بن المخیلی ابن طفیل شامل ہیں۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں سے علامہ ذھبی، علامہ سبکی، ابن سعید المغربی، علم الدین البرازیلی، خلیل بن صفدی اور قطب الدین ابن المکرم شامل ہیں۔ لغت کے مشہور ترین کتاب السان العرب کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں سینکڑوں لغت کی کتابوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ آپ نے اپنی کتاب حروف تہجی یعنی الف بائی ترتیب میں مدون فرمائی۔ ابواب کی تقسیم آخری حرف پر جب کہ فصول کی ترتیب پہلے حرف پر رکھی۔ مثلاً اگر کلمہ شرب تلاش کرنا ہو تو اس کو کتاب الباء اور فصل الشین میں دیکھنا ہوگا۔ آپ نے تمام حروف کو ان کے مادہ اصلی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ ابن منظور نے ۷۱۱ ھجری میں وفات پائی۔ (ڈاکٹر احسان الحق، اردو عربی کے لسانی رشتے، کراچی یونیورسٹی، ۲۰۰۵، ص ۱۶)

۴ ۔ ابن منظور، محمد بن مکرم بن علی، **لسان العرب** (بیروت: دار صادر، ۱۴۱۴ھ)، ۱۴۰/۱۲

۵ ۔ ایضاً، ۱۴۱/۱۲

اشعار میں ایسی کلام جو نافع ہو اور جو جہل اور حماقت سے بچائے اس کو حکمت کہا جاتا ہے، اسی معنی پر قیاس کرتے ہوئے حکمت کا معنی ہے جو جہالت سے روکے، لفظ مُحکّم ایسے تجربہ کار شیخ کے لیے بولا جاتا ہے جو حکمت جانتا ہو۔

ان اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ حکمت کا لغوی معنی روکنا، باز رکھنا، منع کر دینے کے ہیں یعنی جو صلاحیت، جہالت اور سفاہت وغیرہ سے روکے اس کو حکمت کہا جاتا ہے۔

عبدالقاہر بغدادی (۱۶۳۰ء –۱۶۸۲ء) نے بھی حکمت کا لغوی معنی کی وضاحت اس شعر کے ساتھ اور اس قول کے ساتھ کی ہے (كَفه وَمنعه. وَمِنْه سمي القَاضِي حَاكما لِأَنَّهُ يمْنَع النَّاس من الظُّلم)[1] حکمت کا معنی ہاتھ پکڑ لینا، روک لینا، باز رکھنا، قاضی کو بھی حاکم کہنے کہ وجہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے ظلم سے روکتا ہے۔

سید مرتضیٰ زبیدی (۱۷۳۲ء-۱۷۹۱ء) نے (حِکم) حکمت کو سے مشتق لکھا ہے جس کا معنی روکنا اور منع کرنے کے ہیں کیونکہ یہ صفت صاحب حکمت کو رزائل اخلاق سے بچاتی ہے۔[2]

علامہ قونوی حنفی (۱۵۷۰ء) نے بھی الحکمۃ کا معنی (المتقن للأمور)[3] سے کیا ہے یعنی جس شخص میں خود اعتمادی ہو، کسی کام کو کو معتبر اور پختہ طریقے سے انجام دینے والے کو صاحب حکمت کہا جاتا ہے۔

لویس معلوف (۱۸۶۷ء -۱۹۴۶ء)[4] کی عربی سے اردو لغت کی کتاب میں حکمت کے معانی طریقہ، ڈھنگ، مطلب، انتظام، کفایت شعاری، معجزہ، راز اور بھید کے بھی مذکور ہوئے ہیں۔[5]

معجمع اللغة العربية قاھرہ کے زیر اہتمام (۱۹۶۰ء) میں طبع کی گئی لغت کی کتاب المعجم الوسيط میں (الحِكمة) کا معنی علم و فہم کے ذکر کیے گئے ہیں۔[6]

اہل عرب اصلاً لفظ (حکم) کا اطلاق لوہے کے اس ٹکڑے پر کرتے ہیں جس کو گھوڑے پر سوار ہوتے وقت اس کے منہ میں بطور لگام دے دیا جاتا ہے تاکہ گھوڑا ہوشیار اور چوکس رہے۔ یہ عمل حیوان کی پوری توجہ سے اس راستے پر رہنے کے لیے کیا جاتا ہے جس راستے کے لیے اس کا مالک تقاضا کر رہا ہوتا ہے۔ اس طرح گھوڑے کے منہ میں لوہے کی یہ لگام اس

۱۔ بغدادی، عبدالقادر بن عمر، خزانة الادب (قاھرہ: مکتبہ الخانجی، ۱۹۹۷ء)، ۲۳۶/۹

۲۔ زبیدی، محمّد بن محمّد بن عبدالرزاق، **تاج العروس من جواهر القاموس** (مصر: دارالھدیہ، ۱۴۰۶ھ)، ۵۱۴/۳۱

۳۔ قونوی، قاسم بن عبد اللہ بن امیر علی، **أنيس الفقهاء في تعريفات الألفاظ المتداولة بين الفقهاء** (بیروت: دارالکتب العلمیہ ۱۴۲۴ھ)، ۸۶/۱

۴۔ لوئس بن نکولس ظاہر نجم معلوف الیسوعی عرب کا ایک نامور عیسائی ادیب و ماہر لسانیات جو لبنان کے شہر زحلہ میں سنہ ۱۸۶۷ میں ایک عیسائی مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا، اس کا والد چرچ کے مذہبی عہدے پر تھا، لوئس ملفوف ایک با اثر، پر اعتماد و مالی وسعت والی زندگی گزارنے والے گھرانے میں پیدا ہوا تھا، ابتدائی تعلیم بیروت کے الیسوعیہ کالج سے اور پھر تعلیم کے حصول کے لئے تین بار یورپ گیا، پہلے برطانیہ سے فلسفے کی تعلیم اور چونکہ مذہبی گھرانے کی نسبت کی وجہ سے فرانس سے الھیات میں تھیولوجی کی تعلیم حاصل کی۔ سنہ ۱۹۰۸ میں بیروت کے کیتھولک پریس سے شائع ہونے والی آپ کی یہ کتاب اس عہد سے لے کر آج تک عربی زبان کی لغت میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ عربی زبان میں اس کے ہزار ہا ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ لوئس معلوف کی وفات سنہ ۱۹۴۶ میں ہوئی۔

۵۔ لویس معلوف، المنجد (مترجم: عبدالحفیظ بلیاوی)، لاہور، مکتبہ قدسیہ، ۲۰۰۹ء

۶۔ إبراہیم مصطفیٰ/ احمد الزیات/ حامد عبدالقادر/ محمد النجار، **المعجم الوسيط** (قاھرہ: مجمع اللغة العربية بالقاھرۃ، ۱۹۹۷ء)، ۸۸/۸

کے مالک کی مکمل اطاعت اور فرمانبرداری میں اضافہ کرتی ہے۔اس سے واضح ہوتاہے کہ حکمت کا معنی یہ ہے کہ وہ عمل کیا جائے جو آپ کے لیے اچھا ہو اور آپ کو برائی سے روکے۔ تو گویا یہ اصطلاح (حکم) لغت کے مطابق اس لوہے کی طرح ہے جس کو گھوڑے کے منہ میں رکھا جاتاہے تاکہ چلنے پھرنے اور کھڑے ہونے میں اس کی حرکت کو قابو میں رکھا جاسکے اور اس کی ہر حرکت اس کا ایک مقصد بن جاتی ہے۔[1]

ادارہ فروغ برائے قومی زبان[2] نے (۲۰۱۷ء) میں اردو کی پہلی مکمل آن لائن لغت مرتب کی ہے اس کے مطابق انگریزی میں حکمت کے مترادفات یا قریب المعنی الفاظ میں ایک لفظ (Diplomacy) ہے جس کے مطلب فن سفارت اور سیاست کاری، قوموں اور اداروں کے درمیان مذاکرات کرنے کا فن، کسی بھی قسم کے مذاکرات کرانے کا بندوبست کرنے کی ذہانت یا مہارت، موقع شناسی، جوڑ توڑ کا نام حکمت ہے،اسی طرح ایک لفظ (Expedience) بھی ہے جس معنی مصلحت، حکمت، ضرورت، مناسب حال، مقصد کے پیش نظر بہترین مصلحت کی صورت ہے۔اسی طرح ایک لفظ انگریزی لغت میں (Contrivable) آتاہے جس کا معنی فطرت،اور منصوبہ بنانا کے ہیں،انگریزی لغت میں ایک لفظ (Artifice) ہے جس کا معنی حیلہ،مہارت،چالاکی، باریک بینی کے ساتھ کی گئی منصوبہ بندی، حکمت عملی وغیرہ آتے ہیں۔[3] حکمت کے درج ذیل انگریزی معانی بیان کیے ہیں:

1. Knowledge, wisdom science, Philosophy
2. Cleverness, ingenuity
3. Management
4. Origin, fact
5. Expediency, advantageousness, betterment[4]

واضح ہوا کہ قرآن کریم کی اصطلاح (الحکمة) کے لغوی معنی میں دو چیزوں کی وضاحت سامنے آتی ہے ایک کہ حکمت کا لغوی معنی المنع یعنی روکنے کے ہیں یعنی کوئی شخص اپنے دوست کو ذلت اور رسوائی سے بچانے کے لیے کسی کام سے روکے،قرآنی اصطلاح حکم کا یہی معنی ہے، حکم کا دوسرا لغوی معنی فطانت کے ہیں یعنی اپنے اُمور میں ہوشیار رہنا،اپنے کاموں سے اچھی طرح باخبر رہنا، اُمور میں منظم اور سلیقہ مندی اختیار کرنا اور کاموں میں پوشیدہ اور مشکل مراحل سے متنبہ رہنا حکمت کہلاتاہے۔

---

۱ ۔ الشعراوی، محمد متولی، تفسیر الشعراوی (بیروت، مطابع اخبار العلوم، ۱۹۹۷ء) ۲۵۰/۱

۲ ۔ (ادارۂ فروغ قومی زبان قومی تاریخ و ادبی ورثہ ڈویژن کے تحت ایک ملحق وفاقی ادارہ ہے، یہ ادارہ ایوان اُردو، ادارہ فروغِ قومی زبان، پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ ایٹ/فور، اسلام آباد میں واقع ہے، ڈائریکٹر جنرل اس کا انتظامی اور علمی سربراہ ہوتاہے۔ایک مجلس مشاورت بھی ہے۔ ادارے کے دو بڑے حصے ہیں، شعبۂ علمی اور شعبۂ انتظام)

۳ ۔ http://www.nlpd.gov.pk/lughat/search.php

4 ۔ Oxford English-Urdu Dictionary:Shanul Haq Haqqee,Oxford University Press, 1995,P.587

خلاصہ مبحث

اہل لغت نے حکمت کے لغوی معانی میں جو چیز مشترک ذکر کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ حکمت سے مراد فساد، جہالت اور ظلم سے روکنا یا رک جانا کے ہیں، اسی طرح حکمت کے لغوی معانی میں عدل، حق کو پالینا، اُفعال یا اُمور کا احسن طریقہ سے انجام دینا جس میں کوئی شک و شبہ اور اختلاف اور ابہام نہ ہو بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

حکمت کا اصطلاحی مفہوم

حَکَمَ کے اصل معنی کسی چیز کی اصلاح کے لیے اسے روک دینے کے ہیں۔ اسی بنا پر لگام کو"حَکَمۃُ الدَّابۃِ'' کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ اسے قابو میں رکھتا ہے) کہا جاتا ہے۔"حَکَمتُ الدَّابَۃ'' میں نے اسے لگام دی۔ اسی طرح"حکَمْتُ السَّفِینۃَ واحکمتُھا'' بھی کہا جاتا ہے۔"الحُکمُ''کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کا نام حکم ہے یعنی وہ اس طرح ہے یا اس طرح نہیں ہے خواہ وہ فیصلہ دوسرے پر لازم کر دیا جائے یا لازم نہ کیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾[۱]

اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

اور

﴿یَحْکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ﴾[۲]

جسے تم میں سے دو معتبر شخص مقرر کر دیں

جب یہ کہا جاتا ہے کہ "حَکَمَ بالبَاطِلِ''تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے باطل کو بطور حکم کے جاری کیا۔ "الحِکمۃُ'' کے معنی علم و عقل کے ذریعہ حق بات دریافت کر لینے کے ہیں۔ لہٰذا حکمتِ الٰہی کے معنی اشیا کی معرفت اور پھر نہایت احکام کے ساتھ ان کو موجود کرنا ہے اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو سرانجام دینے کا نام ہے

حکمت کے اصطلاحی مفہوم میں اہل لغت اور مفسرین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں، کسی زمانہ میں ایک جماعت کے تمام یا بعض افراد جب کسی لفظ کا جو معنی متعین کر لیتے ہیں اس کو اصطلاحی مفہوم کہا جاتا ہے، اس معنی کا تعلق ایک فرد، ایک قوم یا ایک ریاست تک بھی ہوتا ہے جب کہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ علمی وسعتوں کے اعتبار سے مفاہیم میں تبدیلیاں متوقع ہوتی ہیں اور بعض اَوقات اصطلاحی مفہوم میں تبدیلی ناگزیر ہوتی ہیں۔ اہل اصطلاح ہر لفظ کا مفہوم جملے کے اعتبار سے بھی اور اس کے سیاق و سباق سے بھی کرتے ہیں اور بعض اَوقات اصطلاحی مفہوم کا تعین ایک خاص قوم یا قوم کا خاص افراد باہمی مشاورت سے کرتے ہیں جن کو اہل اصطلاح کہا جاتا ہے۔

عبدالقاہر جرجانی (۱۰۰۹ء-۱۰۷۸ء) کے نزدیک بھی قوم کا کسی اسم کے معنی اور مفہوم میں متفق ہو جانا اصطلاحی مفہوم کہلاتا ہے لیکن بہر حال اصطلاحی اور لغوی مفہوم میں مناسب پائی جاتی ہے۔[۳]

۱۔ النساء: ۵۸/۴

۲۔ المائدۃ: ۹۵/۵

۳۔ الجرجانی، علی بن محمد بن علی الزین الشریف، کتاب التعریفات (بیروت: دارالعلمیہ، ۱۴۰۳ھ)، ۸۴/۴

قرآن کریم میں مذکور اصطلاحات کا اہل لغت نے اپنے انداز میں مختلف لغوی اور اصطلاحی مفہوم بیان کیے ہیں، ان لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں مطابقت بھی ضرور ہوتی ہے، اس لیے کہ لغوی معنی کی بنیاد پر ہی اصطلاحی معنی کی تعیین ہوتی ہے۔

میر سید جرجانی حکمت کا اصطلاحی مفہوم لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: قرآن کی حکمت ہے: حلال اور حرام کو جاننا۔ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ علوم شریعت اور طریقت کو حکمت کہتے ہیں۔

جرجانی حکمت کے اصطلاحی مفہوم میں درج ذیل مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد اپنا قول بھی ذکر کرتے ہیں:

۱۔ علم کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا حکمت کہلاتا ہے۔
۲۔ انسان اپنی طاقت کے مطابق اس چیز کو حاصل کرے جو نفس الامر اور واقع میں برحق ہو۔
۳۔ ایسی کلام جو حق پر مبنی ہو وہ حکمت کہلاتی ہے۔
۴۔ امور کو اپنے مقام پر رکھنا حکمت ہے۔
۷۔ جو چیز انجام یا نتیجہ کے اعتبار سے لائق تعریف ہو وہ حکمت ہے۔
۸۔ حقائق اشیاء جس طرح ہیں ان کا اسی طرح علم ہو اور علم کے مطابق ہو۔
۹۔ حکمت سے مراد حقیقت کے وہ اسرار ہیں جن پر رسمی علماء اور عوام کما حقہ، مطلع نہیں ہوتے، یہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عنایت فرماتا ہے [1]

آپ لکھتے ہیں:

" علم يبحث فيه عن حقائق الأشياء على ما هي عليه في الوجود بقدر الطاقة البشرية"[۲]

موجودات خارجیہ کے احوال کا واقع کے مطابق طاقت بشریہ کے اعتبار سے جس علم میں بحث کی جاتی ہے اس کو حکمت کہا جاتا ہے۔

آپ کے نزدیک یہ قول معتبر معلوم ہوتا ہے جس میں موجودات کے حقائق کی کھوج لگانے کے لیے انسان ہر ممکن طاقت استعمال کرے اس عمل یا علم کو حکمت کہا جاتا ہے۔ علامہ ہروی(۱۰۰۶ء-۱۰۸۹ء)[3] اپنی کتاب میں حکمت کا معنی لکھتے ہیں:

۱۔ ایضاً، ۹۲/۷

۲۔ جرجانی، التعریفات، ۹۲/۲

۳۔ شیخ ابو اسماعیل عبداللہ ہروی انصاری (۴ مئی ۱۰۰۶ء —وفات: ۸ مارچ ۱۰۸۹ء) گیارہویں صدی میں ہرات (خراسان، موجودہ صوبہ ہرات افغانستان) کے رہنے والے حنبلی فقیہ اور فارسی زبان کے مشہور صوفی شاعر تھے۔آپ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں ہرات کی ایک نادر شخصیت، مفسر قرآن، راوی، مناظر اور شیخ طریقت تھے جو عربی اور فارسی زبانوں میں اپنے فن تقریر اور شاعری کے باعث جانے جاتے تھے۔آپ ۰۴ مئی ۱۰۰۶ء ۳۶۹ھ کو ہرات کے قدیم قلعہ کھندژ میں پیدا ہوئے۔آپ سنی فقہ حنبلی کے پیرو تھے۔انہوں نے اسلامی تصوف اور فلسفہ پر فارسی اور عربی زبان میں بہت سی کتب لکھیں۔ان کی سب سے مشہور تصنیف "مناجات نامہ" ہے جو فارسی

"الْحِكْمَة اسْم لأحكام وضع الشَّيْء فِي مَوْضِعه"[1]

جو چیز اپنی اصل میں جس مقام و مرتبے کے لیے وضع کی گئی ہو اسی میں اس کو رکھنا یا اسی طرح ترتیب دینا حکمت کہلاتا ہے۔

راغب اصفہانی[2] (۹۵۴ء-۱۱۰۸ء) لکھتے ہیں:

"إصابة الحق بالعلم والعقل"[3]

علم و عقل کے ذریعے سے صحیح بات تک پہنچ جانا

یعنی کسی چیز کی حقیقت کو علم اور عقل کے ذریعے جاننے اور پہنچاننے کا نام حکمت ہے۔

ابن جوزی[4] (۱۱۱۶ء-۱۲۰۱ء) لکھتے ہیں:

ضرب من العلم يمنع من ركوب الباطل[5]

حکمت علم کی ایک قسم ہے جو باطل اور لایعنی امور سے روکتی ہے

آپ کے نزدیک جو نفس کو ظلمت اور برائی سے نکال کر نور اور حق کی طرف لے جائے اس کو حکمت کہا جاتا ہے۔

ادب کا شاہکار شمار کی جاتی ہے۔ان کی وفات کے بعد ان کی تصانیف کے علاوہ ان کے شاگردوں اور دوسرے لوگوں سے ان کے بہت سے اقوال روایت ہوئے جو تفسیر میبودی، "کشف الاسرار" میں شامل کیے گئے۔ یہ قرآن کریم کی قدیم ترین مکمل صوفی تفاسیر میں سے ہے ،ہرات کے خواجہ عبد اللہ انصاری کا سلسلہ نسب نویں پشت میں مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ خاندان کی تاریخ کی مثل میں بیان کیا گیا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ابو اسماعیل خواجہ عبد اللہ انصاری بن ابو منصور بلخی بن جعفر بن ابو معاذ بن محمد بن احمد بن جعفر بن ابو منصور تابعی بن ابو ایوب انصاری۔(شرح کلام جامی ڈاکٹر شمس الدین احمد صفحہ ۱۰۶۹، مشتاق بک کارنر لاہور)

۱ ۔ ہروی، عبد اللہ بن محمد بن علی الأنصاری، منازل السائرین (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۲ھ)، ۷۸/۱

۲ ۔ الامام ابو قاسم حسین بن محمد بن المفضّل المعروف بالراغب الاصفہانی۔ان کی پیدائش کے متعلق علما نے لکھا ہے کہ غَيرَ مَعرُوفٍ مَتى وُلِدَ، وَلَا اَينَ تَلَقَّى العِلمَ"۔اس سے واضح ہوا کہ امام راغب کی پیدائش اور تحصیلِ علم کے متعلق کچھ پتہ نہیں ہے۔ آپؒ اہل سنت کے عظیم علماء میں سے اور شافعی المسلک تھے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ "بغیۃ الوعاۃ" میں امام راغب کو ائمہ اہلِ سنت میں شمار کرتے ہیں۔ اور امام فخر الدین رازی "تاسیس التقدیس" میں انہیں اہلِ سنت قرار دیتے ہیں۔(راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ص ۸ تحقیق، صفوان عدنان داود)

۳ ۔ راغب اصفہانی، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، ۲۴۹/۱

۴ ۔ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن ابو الحسن علی بن محمد بن علی بن عبید اللہ قرشی تیمی بکری حنبلی فقیہ، مورخ، محدث اور متکلم تھے۔ ابو بکر صدیقؓ کی نسل میں سے تھے۔ آپ کا نام عبد الرحمٰن ہے۔ لقب جمال الدین، کنیت ابو الفرج اور ابن الجوزی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت ۵۰۹ یا ۵۱۰ ہجری کو بغداد میں ہوئی۔ آپ خود فرماتے ہیں: میری تصانیف ۳۴۰ سے کہیں زیادہ ہیں جن میں کئی کتابیں ۲۰ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ ۱۳ برس کی عمر سے شروع فرمایا۔ آپ کی مجلسِ وعظ میں وُزَراء و خُلَفاء سمیت تقریباً دس ہزار سے ایک لاکھ تک افراد شریک ہوتے نیز آپ کے ہاتھ پر ایک لاکھ لوگ تائب ہوئے اور بیس ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ مشہور تصانیف میں زاد المسیر فی علم التفسیر، تیسیر البیان فی تفسیر القرآن، تذکرۃ الاریب فی تفسیر الغریب، غریب الغریب (غریب العزیز)، نزہۃ (الاعین) النواظر فی علم الوجوہ والنظائر ہیں۔ ۱۳ رمضان المبارک ۵۹۷ھ کو بغداد میں شبِ جمعہ کو وصال فرمایا۔ نمازِ جنازہ جامع منصور بغداد میں ادا کی گئی اور تدفین حضرت سیّدنا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پہلو میں ہوئی۔ (تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ۹۳/۴)

۵ ۔ ابن جوزی، عبد الرحمٰن جمال الدین ابو الفرج، نزهة الأعين النواظر في علم الوجوه والنظائر (لبنان: موسسۃ الرسالۃ، ۱۴۰۴ھ)، ۲۶۰/۱

امام رازی شافعی (۱۱۵۰ء-۱۲۰۹ء) اصول فقہ میں حکمت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

"هي الحاجة إلى تحصيل المصلحة ودفع المفسدة"[1]

حکمت سے مراد ایسی حاجت اور طلب کا نام ہے جو مصلحت کے حصول کی طرف لے جائے اور مفاسد سے بچا لے۔

یعنی ایسے اسباب اور ذرائع اور علوم جو دین اور دنیا کے صحیح مقاصد اور حقائق کو سمجھنے میں مدد دیں اور دین کے اور دنیا میں بہتری لانے کے لیے جو اسباب بھی میسر آئیں وہ سب حکمت کے تحت آتے ہیں اور دین اور دنیا کے نقصانات اور ان کے مفاسد سے جو علوم اور اسباب بچالیں وہ بھی حکمت کے تحت شامل ہیں۔

علامہ نووی شافعی (۱۲۳۳ء-۱۲۷۷ء) حکمت کا اصطلاحی مفہوم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

" أن الحكمة عبارة عن العلم المتصف بالأحكام المشتمل على المعرفة بالله تبارك وتعالى المصحوب بنفاذ البصيرة وتهذيب النفس وتحقيق الحق والعمل به والصد عن اتباع الهوى والباطل والحكيم من له ذلك"[2]

احکام میں ایسا علم جس سے اللہ تعالیٰ کی ایسی معرفت نصیب ہوتی ہے جس سے بصیرت، انسانی نفس کی اصلاح، ہدایت اور حق کی معرفت اور اس پر عمل کرنے کی راہیں آسان ہوتی ہے، نفسانی خواہشات اور بے راہ روی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں، صاحب حکمت کو انہی اوصاف سے نوازا جاتا ہے۔

اسی طرح حکمت کی مزید وضاحت ابن منظور (۱۲۳۰ء-۱۳۱۱ء) نے ان الفاظ میں درج فرمائی ہے:

"الحَكْمَةُ عبارة عن معرفة أفضل الأشياء بأفضل العلوم"[3]

سب سے بہتر اور افضل چیز کو سب سے اعلیٰ علم کے ذریعے سے حاصل کرنے کا نام حکمت ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ حکمت کے لیے عمدہ چیز کی کھوج لگانا اور اس کے لیے عمدہ اور بہتر طریقے استعمال کرنا حکمت کہلاتا ہے۔

امام شاطبیؒ[4] (۱۳۲۰ء-۱۳۸۸ء) لکھتے ہیں:

"إِنَّ الْحِكْمَةَ مَسْحَةُ مَلَكٍ على قلب العبد، وهى نُورٌ يَقْذِفُهُ اللَّهُ فِي قَلْبِ الْعَبْدِ، وقيل يَقَعُ بِقَلْبِي أَنَّ الْحِكْمَةَ الْفِقْهُ فِي دِينِ اللَّهِ، وَأَمْرٌ يُدْخِلُهُ اللَّهُ الْقُلُوبَ مِنْ رَحْمَتِهِ وَفَضْلِهِ "[5]

۱۔ رازی، عبداللہ بن عمر، المحصول، بیروت، موسسۃ الرسالۃ، ۱۳۵/۳

۲۔ النووی، أبوزکریا محيي الدين يحيى بن شرف، المنهاج في شرح صحيح مسلم بن الحجاج (بیروت: دار الکتب العلمیہ ۱۴۰۶ھ)، ۱۳۴/۴

۳۔ ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، ۱۴۰/۱۲

۴۔ ابواسحاق ابراہیم ابن موسی الشاطبیؒ (۷۲۰-۷۹۰ ہجری/۱۳۲۰-۱۳۸۸ عیسوی) مالکی مذہب کے پیروکار ہیں۔ امام شاطبیؒ کا پورا نام "ابراہیم بن موسی بن محمد الشاطبیّ الغرناتی" تھا۔ آپ کا خاندان بنو لخم سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ کی کنیت "ابو اسحاق" تھی اور کنیت "اللخمی"، "الغرناطی"، "المالکی" اور "الشطبی" تھی۔ آپ کی تاریخ پیدائش اور مقام معلوم نہیں ہے۔ آپ کا انتقال ۱۳۸۸ میں غرناطہ میں ہوا۔ آپ کی مشہور کتب میں الاعتصام (کتاب الاعتصام)، الموافقات فی اصول الشریعۃ (الموافقات فی اصول الشریعۃ)۔ یہ اصول الفقہ، اور اسلامی فقہ اور مقاصد الشریعہ (اعلیٰ مقاصد) کے موضوع پر ہے۔ (محمد خالد مسعود، اسلامی قانونی فلسفہ: ابواسحاق الشاطبیّ کی زندگی اور فکر کا مطالعہ، میک گل یونیورسٹی، ۱۹۷۷)

۵۔ شاطبیّ، ابراھیم بن موسیٰ بن محمد، الموافقات، دار ابن عفان، مصر، ۲۸۳/۵

حکمت ایسی نعمت ہے جس کا اثر بندے کے قلب پر جاری ہوتا ہے ، یہ ایسا نور ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے سینوں میں ڈالتا ہے، حکمت کی تعریف میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دین میں تفقہ حاصل کرنا ہے ، حکمت ایسا امر ہے جو اللہ اپنی رحمت اور فضل سے بندوں کے دلوں میں داخل کرتا ہے۔

ابن ہمام[۱] (۱۳۸۸ء-۱۴۵۷ء) نے حکمت کی تعریف اس طرح لکھی ہے :

''الحكمة جلب مصلحة أو تكميلها، أو دفع مفسدة أو تقليلها''[۲]

(دین اور دنیا کے تمام) مصالح کو حاصل کرنا یا ان کی تکمیل کرنا حکمت ہے یا زندگی کے مفاسد کو کم کرنا یا ختم کرنے کا نام بھی حکمت ہے۔

فقہ حنفی ، مالکی، شافعی اور حنبلی کی تمام بنیادی کتب میں حکمت کی تعریف میں یہ بات مشترک نظر آتی ہے کہ مصلحتوں کے حصول اور ان کی تکمیل کا نام حکمت ہے یا پھر مفاسد کو ختم کرنا یا ان کو کم کرنا حکمت کہلاتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی[۳] (۱۸۶۳ء-۱۹۴۳ء) کشاف اصطلاحات الفنون میں لکھتے ہیں :

'' أنّ الحكمة علم متعلّق بجميع أحوال الموجودات العينية المكمّلة للنفس بحسب ما يمكن''[۴]

---

۱ ۔ علامہ محمد بن عبد الواحد السیواسی الاسکندرانی ابن الھمام (۷۹۰-۸۶۱)۔ فقہ حنفی کی کتاب ''الھدایۃ'' کے شارح، مشہور فقیہ، محدث، اُصولی، متکلم، مناظر اور مصنف ہیں۔ فقہائے احناف کے مابین جب مطلقاً ''محقق'' کا لفظ بولا جاتا ہے تو وہی مراد ہوتے ہیں۔ پیدائش اسکندریہ میں ہوئی تھی اور وفات قاہرہ میں، کچھ عرصہ حلب میں بھی رہے، حرمین کی مجاورت کا بھی شرف حاصل رہا۔ انہوں نے ''فتح القدیر'' کے نام سے ''ھدایہ'' کی شرح لکھی تو علمی نکات کے انبار لگا دیے اور اتنی مفصل اور طویل شرح لکھنی شروع کی کہ تین چوتھائی حصہ کی شرح کر پائے تھے کہ پیغام اجل آ گیا اور کتاب کی تکمیل اپنے بعد آنے والے قاضی زادہ کے لیے چھوڑ گئے۔ ''اُصول فقہ'' پر ''التحریر'' جیسی جامع اور اتنی مختصر کتاب لکھی جو پڑھنے والوں کے لیے چیستاں بن گئی ہے۔ علم کلام پر کتاب ''مسامرہ'' اور ''مسایرۃ'' جیسی دقیق و متین کتاب لکھیں۔ کسب فیض علامہ سراج قاریٔ الھدایہ، علامہ بدر الدین العینی، علامہ ابن الشحنہ اور عراقی و ابن حجر جیسے مشہور شیوخ سے کسب فیض کیا۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں علامہ سخاوی، علامہ سیوطی، جیسے نامور مصنفین ، قاسم بن قطلوبغا، ابن تغری بردی، ابن امیر الحاج اور شیخ الاسلام زکریا انصاری جیسے لوگ ان کی شاگردی پر فخر کرتے رہے۔ ابن الھمام کا انتقال ۸۶۱ھ میں ہوا اور قرافہ کے مشہور مقبرہ میں ابن عطاء اللہ اسکندری کے قریب ان کی تدفین عمل میں آئی۔ (محمد عبد الحی اللکنوی الھندي، الفوائد البھیۃ في تراجم الحنفیۃ، ص ۱۱۷)

۲ ۔ ابن ہمام، کمال محمد بن عبد الواحد، التحریر فی اصول الفقہ، دار الکتب، بیروت، ۲۳۳/۴

۳ ۔ اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ء-۱۹۴۳ء) ایک بھارتی حنفی عالم، صوفی، چشتی مرشد اور بیان القرآن اور بہشتی زیور جیسی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ بہ مطابق ۹ ستمبر ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ عبد الحق ایک مقتدر رئیس صاحب نقد و جائیداد اور ایک کشادہ دست انسان تھے۔ ان کی تصانیف اور رسائل کی تعداد ۸۰۰ تک ہے۔ ان میں سے چند میں تفسیر بیان القرآن، اعمال قرآنی، حقیقۃ الطریقۃ (سلوک و تصوف کے مسائل و روایات پر مشتمل ایک بے نظیر کتاب)، احیاء السنن (فقہی ترتیب پر جمع کیے گئے احادیث کا مجموعہ)، امداد الفتاوی، الانتباہات المفیدۃ (جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے مذہبی اعتراضات کے جوابات)، بہشتی زیور، جمال القرآن، نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم، اغلاط العوام زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو ۸۰ سال، ۳ ماہ، ۱۱ دن کی عمر میں ہوا۔ نماز جنازہ ظفر احمد عثمانی نے پڑھائی اور وہ تھانہ بھون کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

۴ ۔ تھانوی، اشرف علی، موسوعۃ کشاف اصطلاحات الفنون و العلوم، (بیروت: مکتبہ لبنان، ۱۴۲۳ھ)، ۹۹/۴

ایسا علم جس میں انسانی طاقت کے ذریعے موجودات عینیہ[1] کے تمام احوال (اعمال اور افعال) کی تکمیل ممکن ہو اس علم کو حکمت کہا جاتا ہے۔

دانش گاہ پنجاب کے موسوعۃ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (طبع ۱۹۸۰ء) میں حکمت ایسی نفع دینے والی کلام کا نام ہے جس کی مدد سے سفاہت اور جہالت سے رکا جا سکے، اسی علم کی بدولت انسان جہل پن سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ حکمت عقل اور علم کے ذریعے حق بات دریافت کر لینے کا نام ہے۔[2]

معجم لغۃ الفقہاء (طبع ۱۹۸۵ء) میں ہے:

"وضع الشيء في موضعه"[3]

چیز کو اس کے اپنے مقام و مرتبہ پر رکھنا کیا گیا ہے۔

موسوعۃ نضرۃ النعیم (طبع ۲۰۰۹ء) کے مطابق علوم نظری کے ذریعے انسانی نفس کا تزکیہ اور اس کو درست حالت کی طرف پھیرنے کا نام حکمت ہے، بقدر طاقت بشری ایسے علم کے حاصل کرنے کا نام حکمت ہے جس کے ذریعے اخلاق رزیلہ کی پہچان کر کے ان کو اخلاق حسنہ سے تبدیل کیا جائے، انسان کے لیے نفع بخش اور غیر نافع اشیاء کی معرفت کا نام حکمت ہے۔[4]

مشہور ہندوستانی لغت ریختہ کے مطابق حکمت کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ طاقت بشری کے مطابق موجودات کے اُحوال کا علم جیسا کہ وہ نفس الامر میں ہیں اس کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ طبعی ۲۔ ریاضی ۳۔ الٰہی۔ طبعی سے مراد ایسا علم جس میں ان امور کی بحث کی جائے جو تعقل اور وجود خارجی میں مادّے کی محتاج ہوں جیسے پانی ہوا وغیرہ اجسام مرکبّہ اور مفردہ کا علم۔ اور علم ریاضی جس میں صرف ان امور سے بحث کی جائے جو وجود خارجی میں مادّہ کی محتاج ہوں لیکن تصور عقلی میں مادّہ کے محتاج نہ ہوں۔ جیسے مقدار اور عدد خاص کا علم جو مادیات میں موجود ہے نہ مطلق عدد کا کیونکہ بعض ان میں مادہ کے بدون بھی خارج میں پائے جاتے ہیں جیسے عقول عشرہ میں۔ اور حکمت الٰہی سے مراد ایسا علم ہے جس میں ان امور سے بحث کی جائے جو نہ تو وجود خارجی ہی میں مادہ کی محتاج ہوں اور نہ تصور عقلی ہی میں جیسے خدا تعالیٰ اور عقول کا علم بعض لوگوں نے حکمت کی دو قسمیں قرار دی ہیں اوّل علمی جس کو نظری بھی کہتے ہیں اور جس میں تصور حقائق موجودات کا ہوتا ہے۔ دوم عملی جس میں تہذیب اخلاق، تدبیر منازل اور سیاست مدن داخل ہیں۔[5]

اردو لغت بورڈ کراچی[6] کی طرف سے شائع کردہ (۲۰۱۷ء) اردو کی سب سے بڑی لغت جو ۲۲ جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں حکمت کا مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے:

۱۔ موجودات عینیہ علم منطق کی اصطلاح ہے جس سے مراد یہ ہے کہ وہ چیزیں یا اشیاء جو اپنی ذات سے قائم ہیں، خواہ مرکب ہوں یا مفرد

۲۔ **اردو دائرہ معارف اسلامیہ** (لاہور: دانش گاہ، پنجاب، طبع اول، ۱۹۷۳ء)، ۹، ۴۶۸/

۳۔ محمد رواس قلعہ جی، **معجم لغة الفقهاء** (ریاض: موسوعۃ الفقہ الاسلامی، ۱۴۳۰ھ)، ص۱۲۹

۴۔ شیخ صالح بن حمید، **نضرة النعيم في مكارم أخلاق الرسول الكريم صلى الله عليه وسلم** (جدہ: دارالوسیلۃ، ۱۴۳۰ھ)، ۱۶۷۹/۵

۵۔ http://www.udb.gov.pk

۶۔ https://www.rekhtadictionary.com/meaning-of-hikmat?lang=ur&keyword=%D8%AD%DA%A9%D9%85%D8%AA

"حکمت ایسا علم ہے جس میں مشاہدہ، غور وفکر، دلیل وبرہان سے حقائق کو معلوم کیا جائے، اس سے مراد منطق، فلسفہ اور سائنس بھی ہیں، اس کے علاوہ حکمت کا اطلاق تصوف پر بھی ہوتا ہے تب حکمت کا مفہوم یہ ہوگا کہ حقائق واوصاف واحکام اشیاء کا جاننا جیسا کہ وہ نفس الامر میں ہیں اور جاننا ارتباطِ اسباب کا مسبّب کے ساتھ اور حقائق الٰہی اور علم عرفان کے اصول کا جاننا"[1]

حکمت کی سابقہ تعریفات سے واضح ہوا کہ حکمت ایک ایسا فطری یا کسبی ملکہ ہے جس کے ساتھ بصیرت اور علم حاصل ہوتا ہے، اور اس بصیرت اور علم کے ذریعے انسان اپنے عمل اور فیصلوں کو مناسب طریقے پر رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت کی طاقت اور علم عطا فرما دیتا ہے یا پھر حکم کی طلب میں جو بھی کوشش اور کسب کرتا ہے اس کو حکمت عطا کر دی جاتی ہے۔

لغوی اور اصطلاحی معنی میں مطابقت

حکمت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں مطابقت اسی طریقے سے واضح ہے کہ دونوں مفہوم میں امور کو تدبیر سے ترتیب دینے اور ان کو احسن طریقے سے سر انجام دینے کا معنی پایا جاتا ہے اسی طرح دونوں میں فساد، برائی اور باطل سے رکنے کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔

لغوی معنی میں حکمت عدل، حلم اور علم کا تقاضا کرتی ہے جب کہ اصطلاحی معنی میں امور اور اشیاء کو ان کے اصل مقام اور مرتبے کے مطابق رکھنا اور سر انجام دینے کا معنی پایا جاتا ہے ، لغت میں حکمت کا معنی اشیاء کی حقیقت کو جاننا اور اصطلاحی مفہوم میں اشیاء کی معرفت اور راہ حق اور راہ ہدایت کی پہچان اور شریعت پر عمل کرنے کے راستے کا واضح اور ظاہر ہونا مراد ہے۔ اس طرح لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں مکمل مطابقت پائی جاتی ہے۔

جسے اللہ ایسی حکمت دے دے اسے اللہ نے بہت بھلائی عطا فرما دی۔ اس بھلائی سے عظیم تر بھلائی اور کون سی ہو سکتی ہے جس میں دنیا اور آخرت کی خوش نصیبی پنہاں ہو، اور جس کے ذریعے سے دنیا اور آخرت کی بد نصیبی سے نجات مل جائے ؟ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نعمت خاص خاص لوگوں کو ملتی ہے اور یہ انبیاء کا ترکہ ہے۔ پس بندے کو کمال صرف حکمت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کمال نام ہے علمی اور عملی قوت کے کامل ہونے کا۔ علمی قوت تو حق کی معرفت سے اور اس کے مقصود کی معرفت سے کامل ہوتی ہے اور عملی قوت نیکی کرنے اور برائی سے اجتناب کرنے سے مکمل ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بندہ صحیح قول اور صحیح عمل کا حامل ہو سکتا ہے اور اپنی ذات کے بارے میں نیز دوسروں کے بارے میں ہر حکم کو اس کے صحیح مقام پر رکھ سکتا ہے اور اپنی ذات کے بارے میں، نیز دوسروں کے بارے میں ہر حکم کو اس کے صحیح مقام پر رکھ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ حکمت کی صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

خلاصہ

قرآنی اصطلاح حکمت کے لغوی اور اصطلاحی تعریفات سے واضح ہوتا ہے صحیح سمجھ اور فہم، معاملہ فہمی، مردم شناسی، واقعات کو سمجھنا، صورتِ حال کو سمجھنا، مسلّمہ امور اور اصول میں پوشیدہ حکمت کو سمجھنا حکمت ہے۔ اس کی مزید وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ صحیح فہم کے اجزا میں باریک بینی (معاملے کی گہرائی پر نظر)، بصیرت (معاملے کے پوشیدہ

۱۔ http://www.udb.gov.pk

پہلوئوں تک پہنچ جانا)، اندرونِ معاملہ یا تمام مثبت و منفی پہلوؤں پر نظر، بیرونِ معاملہ یا تمام متعلقہ دائروں پر نظر، معاملے کو جامع تناظر میں دیکھنا، مختلف رخ سے یا کسی دوسرے کی نظر سے یا معروضی نظر سے دیکھنا، دُور بینی (کوئی معاملہ آگے جا کر کہاں منتج ہو سکتا ہے؟)، پیش بینی، آگے کیا ہونے والا ہے؟ ان سب کا تعلق حکمت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کے ساتھ ہے۔

اسی طرح حکمت کا ایک مفہوم رائے قائم کرنے کی صلاحیت میں صاحب الرائے ہونا (گومگو کی حالت میں نہ رہنا)، رائے مضبوط ہونا (بے جا اصرار نہ ہو لیکن رائے پر دلائل کے ساتھ قائم ہو)، صائب الرائے ہونا یا اصابتِ رائے کی صفت ہونا، مختلف پہلوؤں میں توازن ملحوظ رکھ کر عدل قائم کرنا کیونکہ حکمت کا لغوی معنی عدل بھی ہے یعنی ہر چیز کو اس کا صحیح مقام دے کر، ہر چیز کی صحیح قدر کا تعین کر کے، نتائج اور اسباب اور مقاصد کے ادراک کے ساتھ، دلیل سے رائے پر پہنچنا یا قوتِ استدلال ہونا اس لیے کہ حکمت کے لغوی معنی فلسفہ اور استدلال بھی ہیں۔ اس طرح حق اور باطل میں تمیز یعنی صحیح کو صحیح سمجھنا اور غلط کو غلط سمجھنا، دو صحیح آرا میں سے صحیح تر کو ترجیح دینا، صحیح اور غلط اگر خلط ملط ہوں تو چھانٹ کر صحیح رائے بنانا اور امتیازی حد کو پہچان جانا خواہ وہ نظریے میں ہو یا کلام میں یا عمل میں ہوں۔

اس طرح ہم یہ بھی لکھنے میں حق بجانب ہیں کہ حکمت کی اصطلاحی تعریفات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی تخلیقات میں جو کچھ بھی ہے، انسان اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے اور اس کی حقیقت جاننے اور پہچاننے میں تگ ودو کرنے کا نام حکمت ہے۔ حکمت اس چیز کا نام ہے کہ عقل اور فکر کو ایسی راہ پر لگانا جو درست نتیجے تک پہنچا دے۔ اصطلاحی تعریف میں ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ پختہ یقین، بہترین غور و فکر اور تجربات کی روشنی میں حقائق حاصل کرنے کا نام حکمت ہے۔ اسی طرح صرف مثبت اشیاء یا حقائق کے حصول کا نام حکمت نہیں ہے بلکہ مثبت نتائج اور حقائق کے حصول میں آنے والے رکاوٹوں کو دور کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کرنے کا نام بھی حکمت ہے۔ اور حکمت عقل اور فکر کو غلط راستے سے روکنے کا بھی نام ہے جیسا کہ تعریفات سے ظاہر ہوتا ہے۔

فصل دوم
قرآن کریم میں اصطلاح الحکمۃ کے مشتقات اور تفسیری اطلاقات

قرآن کریم میں کلمہ (الحكمة) اپنے مشتقات کے ساتھ مختلف صیغوں میں استعمال ہوا ہے، کلمہ (الحكمة) مصدری معنی میں انیس بار استعمال ہوا ہے، (حكم) اور (أحكم) کا صیغہ ایک سو تئیس بار استعمال ہوا ہے۔الحكمة اپنے مشتقات، (حكم) اور (أحكم) کے ساتھ فعل ماضی، فعل مضارع، مصدر، صفت مشبہ اور اسم تفضیل کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ فواد عبدالباقی[۱] (۱۸۸۲ء-۱۹۶۸ء) نے اسی طرح لکھا ہے۔[۲]

مصدری معنی میں

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾[۳]

جسے چاہتا ہے دانائی عطا فرما دیتا ہے، اور جسے (حکمت و) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہو گئی اور صرف وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو صاحب عقل و دانش ہیں۔

اسم مفعول

﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾[۴]

وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی جس میں سے کچھ آیتیں محکم (یعنی ظاہراً بھی صاف اور واضح معنی رکھنے والی) ہیں وہی (احکام) کتاب کی بنیاد ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ (یعنی معنی میں کئی احتمال اور اشتباہ رکھنے والی) ہیں، سو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے اس میں سے صرف متشابہات کی پیروی کرتے ہیں (فقط) فتنہ پروری کی خواہش کے زیرِ اثر اور اصل مراد کی بجائے من پسند معنی مراد لینے کی غرض سے، اور

۱۔ شیخ فواد عبدالباقی کی ولادت القليوبية کی ایک بستی میں مارچ 1882ء میں ہوئی۔ قاہرہ میں پروان چڑھے۔اور 5 برس کی عمر میں اپنے خاندان کے ساتھ سوڈان کی طرف سو کیا۔ابتدائی تعلیم و تربیت مدرسہ الاسوان سے حاصل کی اس کے بعد قاہرہ لوٹ آئے پھر تاعمر یہیں اقامت پذیر رہے۔اس کے بعد مدرسہ عباس الابتدائیہ میں داخل ہوئے اور یہاں رہ کر تعلیم حاصل کی۔آپ نے مدرسہ جمعیۃ المساعی المشکورۃ میں لغۃ عربیہ کے مدرس کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ شیخ محمد فواد عبدالباقی نے مندرجہ ذیل کتب تحریر کیں ہیں۔1۔المعجم المفہرس للحدیث النبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔2۔ترجمہ: منقاح کنوز السنة 3۔ ترجمہ تفصیل أيات القرآن الحكيم۔4۔المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم ۔5۔اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق علیہ الشیخان۔6۔ معجم غریب القرآن ۔ شیخ کی وفات 1388ھ بمطابق 1967 میلادی میں ہوئی۔(عمران ایوب، شرح اللؤلؤ والمرجان، نعمانی کتب خانہ، لاہور، ص۷)

۲۔ محمد فواد عبدالباقی، المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم (بیروت: مؤسسة الرسالة، ۱۴۱۸ھ)، ص ۲۱۳-۲۱۵

۳۔ البقرہ: ۲۶۹/۲

۴۔ آل عمران: ۷/۲

اس کی اصل مراد کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور علم میں کامل پختگی رکھنے والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، ساری (کتاب) ہمارے رب کی طرف سے اتری ہے، اور نصیحت صرف اہل دانش کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

فعل ماضی میں کلمہ حکم)

﴿كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ﴾[1]

یہ وہ) کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم بنادی گئی ہیں، پھر حکمت والے باخبر (رب) کی جانب سے وہ مفصل بیان کردی گئی ہیں۔

فعل مضارع

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾[2]

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجااور نہ کوئی نبی مگر (سب کے ساتھ یہ واقعہ گزرا کہ) جب اس (رسول یا نبی) نے (لوگوں پر کلام الٰہی) پڑھا (تو) شیطان نے (لوگوں کے ذہنوں میں) اس (نبی کے) پڑھے ہوئے (یعنی تلاوت شدہ) کلام میں (اپنی طرف سے باطل شبہات اور فاسد خیالات کو) ملا دیا، سو شیطان جو (وسوسے سننے والوں کے ذہنوں میں) ڈالتا ہے اللہ انھیں زائل فرمادیتا ہے پھر اللہ اپنی آیتوں کو (اہل ایمان کے دلوں میں) نہایت مضبوط کردیتا ہے، اور اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

صفت مشبہ

﴿إِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ﴾[3]

بیشک آپ کو (یہ) قرآن بڑے حکمت والے، علم والے (رب) کی طرف سے سکھایا جارہا ہے۔

اسم تفضیل

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ﴾[4]

کیااللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے۔

۱۔ ھود: ۱/۱۱

۲۔ الحج: ۵۲/۲۲

۳۔ النمل: ۶/۲۷

۴۔ التین: ۸/۹۵

قرآن کریم میں وارد صیغہ (حکم) اور (أحکم) کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی واضح اور ظاہر، دلائل اور مطالب میں پختہ اور مضبوط، زائل کرنا اور مٹا دینا اور حکم کرنا کے آتے ہیں جب کہ علامہ دامغانی[1] (م۱۲۵۰ء) نے قرآن کریم میں (حکمة علی خمسة أوجه)[2] کے پانچ معانی متعین کیے ہیں، جو کہ درج ذیل ہیں:

۱۔ **حکمت بمعنی اشیاء کی ان کے مقام اور محل و مرتبہ پر رکھنا**

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[۳]

ہر نہاں اور عیاں کو جاننے والا ہے، بڑے غلبہ و عزت والا بڑی حکمت والا ہے۔

۲۔ **حکمت بمعنی الموعظة یا قرآن**

﴿حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ ۖ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ﴾[۴]

(یہ قرآن) کامل دانائی و حکمت ہے کیا پھر بھی ڈر سنانے والے کچھ فائدہ نہیں دیتے۔

۳۔ **حکمت بمعنی سنت**

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾[۵]

وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک (باعظمت) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھیجا وہ ان پر اس کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان (کے ظاہر و باطن) کو پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، بیشک وہ لوگ ان (کے تشریف لانے) سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

۴۔ **حکمت بمعنی علم اور فہم**

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ ۚ وَمَن يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾[۶]

۱۔ شیخ ابو عبداللہ محمد بن علی بن محمد ایران کے شہر دامغان میں ۳۹۸ ھجری میں پیدا ہوئے۔ آپ نے علم حدیث علماء بغداد سے حاصل کیا۔ فقہ میں آپ کمال مہارت رکھتے تھے۔ آپ کے شیوخ میں ابو عبداللہ حسین بن علی الصمیری اور محمد بن علی الصوری مشہور ہیں۔ تواضع اور حافظہ کی مضبوطی میں مشہور تھے۔ آپ فقہ حنفی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فقہ میں آپ کے تلامذہ میں آپ کے بیٹے ابوالحسن الدمغانی اور ان کے بھتیجے ابو محمد الدمغانی بھی شامل ہیں۔ آپ بغداد میں قاضی ابن ماکولا کے بعد قاضی القضاہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ ۴۷۸ ھجری میں فوت ہوئے۔ (ذھبی، سیر اعلام النبلاء، ۲۲۶۵۴)

۲۔ الدامغانی، حسین بن محمد، إصلاح الوجوه والنظائر في القرآن الكريم، دار العلم للملایین، بیروت ۱۹۸۸، ج۱، ص۱۴۱، مزید دیکھیے: ابن الجوزی، نزہۃ الأعین النواظر، ص۲۶۱-۲۶۲، ابن عاشور، التحریر والتنویر، ج۲۸، ص۲۹۱

۳۔ التغابن: ۱۸/۶۴

۴۔ القمر: ۵/۵۴

۵۔ الجمعہ: ۲/۶۲

۶۔ لقمان: ۱۲/۳۱

اور بیشک ہم نے لقمان کو حکمت و دانائی عطا کی، (اور اس سے فرمایا) کہ اللہ کا شکر ادا کرو اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے شکر کرتا ہے، اور جو ناشکری کرتا ہے تو بیشک اللہ بے نیاز ہے (خود ہی) سزاوار حمد ہے۔

۵۔ **حکمت بمعنی نبوت**

﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا﴾[۱]

کیا یہ (یہود) لوگوں (سے ان نعمتوں) پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں، سو واقعی ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ہم نے انہیں بڑی سلطنت بخشی۔

حکمت کے پانچ معانی متعین ہونے کے بعد درج ذیل ترتیب وار ان کی وضاحت کی جاتی ہے:

۱۔ حکمت سے مراد اشیاء اور امور کو ان کے مقام اور محل و مرتبہ پر رکھنا

قرآن کریم میں حکمت کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے (الحکیم) مذکور ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی صفت (الحکیم) سے مراد اشیاء کی حقیقتوں کو جیسا کہ وہ ہیں ان کو جاننے والا اور ہر ایک شے کو اس کو مقام اور مرتبے پر رکھنے والے وہی ذات ہے جس نے اپنے لیے یہ صفت بیان فرمائی ہے۔ حکمت کے اس معنی کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق جس کو حکمت عطا فرماتا ہے تو اس کو اشیاء کی حقیقت تک رسائی ہو جاتی ہے اور قرآن کریم میں

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾[۲]

عنایت کرتا ہے سمجھ جسکو چاہے اور جس کو سمجھ ملی ہے اس کو بڑی خوبی ملی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

سے یہی مراد ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے خیر کثیر قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ اسی حکمت کے تحت مفسرین کرام نے حکمت علمیہ اور عملیہ بھی ذکر کیے ہیں کہ اپنی ذات کو سمجھ کر اپنی اصلاح کرنا اور خاندان اور معاشرے میں پھیلی برائیوں کے سد باب کا اہتمام کرنا اور ساتھ ہی حاکم وقت کے لیے بھی حکمت عملی اسی معنی میں ہے کہ جب سلطنت کے بادشاہ عوام کی اصلاح کے لیے ایسے اقدامات کریں جن سے امن وامان قائم ہو اور ظلم و فساد کے خاتمہ ہو سکے، لہٰذا حکمت کا ایک معنی یہ بھی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں امام طبری (۸۳۹ء-۹۲۳ء) مطلق حکمت کے معنی میں لکھتے ہیں:

يُؤْتِي اللّٰه الْإِصَابَة فِي الْقَوْل وَالْفِعْل مَنْ يَشَاء مِنْ عِبَاده[۳]

قول اور فعل میں اصابت رائے کی قوت اور صفت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

۱۔ النسآء ۵۴/۴

۲۔ البقرہ: ۲۶۹/۲

۳۔ الطبری، جامع البیان، ۴۷۰/۴

آپ کے نزدیک کلام کے جملہ اوصاف حمیدہ اور افعال میں بہترین حکمت عملی کی صفات کا تعلق حکمت کے ساتھ ہے۔ابن عطیہ اندلسی (۱۰۴۸ء-۱۱۴۶ء) نے بھی اسی کے قریب معنی لکھا ہے:

أن الحكمة مصدر من الإحكام وهو الإتقان في عمل أو قول[1]

لفظ حکمت احکام سے ماخوذ ہے جس کا معنی عمل یا قول میں استحکام اور تیقن کے ہیں۔

قرآن کریم میں مطلّقاًمذ کور (الحکمۃ) کی اصطلاح سے مراد افعال اور اقوال میں مناسب اور مستحکم انداز اختیار کرنا ہے۔ یعنی اعمال میں مضبوط قوت ارادی، ظاہر و باطن میں یکسانیت اور اقوال میں وقت، حالات اور حقائق کے مطابق گفتگو کرنے کا نام حکمت ہے۔امام فخر الدین رازی (۱۱۵۰ء-۱۲۰۹ء) نے قرآن کریم کی آیت کریمہ کو بھی اسی معنی میں لیا ہے۔

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾[2]

بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر

اس مقام پر بھی (الحکمۃ) سے مراد یہ ہے

"المراد من الحكمة فعل الصواب"[3]

حکمت سے مراد حقیقت تک رسائی کا علم

یعنی اپنے اًفعال کو حق کی تلاش کے لیے کوشاں کرنا،آپ کے نزدیک حکمت کا معنی یہ ہے کہ داعی متکلم کے عقل کے مطابق اور وقت اور حالات کی آگاہی حاصل کرکے اس کے مطابق کلام کرے ،آپ کے نزدیک اس آیت کریمہ میں حکمت سے مراد اپنے قول اور فعل کو اشیاء کی حقیقتوں تک رسائی کے لیے تیار کرنے کا نام حکمت ہے۔

۲۔ **حکمت بمعنی الموعظۃ یا قرآن**

قرآن کریم کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر حکمت کی صفت کو ذکر فرمایا ہے، باقی مقامات پر حکیم اور احکمت کی الفاظ ذکر کیے گئے ہیں لیکن یہاں لفظ (الحکمۃ) الف لام کے بغیر استعمال ہوا ہے، مفسرین کرام نے اس مقام پر حکمت کا معنی قرآن کریم کیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ ۖ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ﴾[4]

(یہ قرآن) کامل دانائی وحکمت ہے کیا پھر بھی ڈر سنانے والے کچھ فائدہ نہیں دیتے۔

اس قرآن میں انتہائی حکمت کی باتیں ہیں، اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رسولوں کو بھیجا اور توحید پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا اس میں انتہائی حکمت ہے اور اس کا تیسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) پر جو احکام نازل کئے ان میں انتہائی حکمت ہے، اور اس کا چوتھا معنی یہ ہے کہ قرب قیامت کی علامتوں میں انتہائی حکمت ہے۔

امام سمرقندی (۹۴۴ء-۹۸۳ء) آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

۱۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، ۱/۳۶۴

۲۔ النحل: ۱۶/۱۲۵

۳۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۲/۱۷۹

۴۔ القمر: ۵۴/۵

”حِكْمَةٌ بالغة يعني جاءهم كلمة بالغة ، وهو القرآن يعني حكمة وثيقة“[1]

حکمت بالغۃ سے مراد ایسی کلام جو واضح ہو اور اس سے قرآن کریم مراد ہے یعنی مضبوط حکمت

امام ثعلبی[2] (م ۱۰۳۵ء) لکھتے ہیں کہ حکمت ایسا ملکہ اور صلاحیت ہے کہ (ليس فيها نقصان)[3] ایسی نصیحت ہے جس میں سراسر فائدہ اور منفعت ہی ہے اور نقصان کا بھی بالکل اندیشہ نہیں ہے۔ امام ماوردی[4] (۹۷۲ء-۱۰۵۸ء) نے ان سے جداگانہ معنی اختیار کیا ہے، آپ کے نزدیک یہاں حکمت سے مراد رسالت اور کتاب اور وعد اور وعید مراد ہے۔[5]۔ علامہ واحدی نیشاپوری (م ۱۰۷۵ء) نے اپنی تفسیر میں حکمت سے (يعني مواعظ القرآن)[6] مراد ہے۔ وھبہ زحیلی[7] (۱۹۳۲ء-۲۰۱۵ء) نے بھی سے مراد قرآن کریم اور اس میں موجود وعظ و ہدایات مراد لی ہیں، آپ لکھتے ہیں:

”إن هذه الأنباء في القرآن وما تضمنته من عبرة وعظة وهداية“[8]

حکمت سے مراد قرآن کریم میں بتائی جانے والی ایسی خبریں اور مواعظ ہیں جن سے عبرت اور ہدایت حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصطلاح قرآنی (الحكمة) کا ایک معنی قرآن کریم اور اس کے مواعظ ہیں۔

---

۱ ۔ سمرقندی، بحر العلوم، ۲۱۹/۴

۲ ۔ ابواسحاق احمد بن محمد بن ابراہیم الثعلبی نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش نامعلوم ہے۔ آپ کی مشہور زمانہ تفسیر الکشف والبیان عن تفسیر القرآن ہے جو تفسیر ثعلبی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ بنو ثعلبہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ثعلبی آپ کا لقب اور ابواسحاق کنیت ہے۔ لیکن علماء کے مطابق ثعلبی آپ کی کنیت نہیں یعنی خاندانی نسبت نہیں ہے بلکہ لقب ہے۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ آپ ثعلب یعنی لومڑی کی چمڑی کا لباس پہنتے۔ دوسری وجہ یہ بھی مشہور ہے کہ آپ اُون کاتنے کا اور جلد سازی کا بھی کام کرتے۔ ثعلبی کو ثعالبی بھی کہا جاتا تھا۔ آپ کی چار مشہور تصانیف ہیں۔ الکشف والبیان، عرائس المجالس فی قصص الانبیاء، ربیع المذکرین، قتلی القرآن۔ آپ کی تاریخ وفات میں دو قول ملتے ہیں۔ ایک غیر مشہور قول کے مطابق آپ کی وفات ۴۳۷ ھجری میں ہوئی جب کہ مشہور قول یہی ہے کہ علامہ ثعلبی کی وفات ۴۲۷ ھجری میں ہوئی۔

۳ ۔ ثعلبی، الکشف والبیان، ۲۰۷/۲۵

۴ ۔ آپ کا پورا نام ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردی ہے۔ آپ کی پیدائش ۳۶۴ ھجری میں ہوئی۔ مسلم فقیہ، مفسر، محدث اور فقہ شافعی کے عالم تھے۔ علامہ ماوردی اپنی تفسیر النکت والعیون اور مشہور تصنیف الاحکام السلطانیہ کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ کی کتب میں أدب الدنیا والدین، قانون الوزارۃ، سیاسۃ أعلام النبوۃ شامل ہیں۔ الماوردی کا انتقال ۸۴ سال کی عمر میں ۴۵۰ ھجری کو بغداد میں ہوا۔ (تاج الدین سبکی، طبقات الشافعیہ الکبری، ۲۶۷/۵)

۵ ۔ الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد، الکنت والعیون (بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۰ھ، ۱۹۹/۶

۶ ۔ الواحدی، تفسیر البسیط، ۳۳۸/۴ ثعلبی، الکشف والبیان، ۱۱۲۲/۲

۷ ۔ شیخ وھبہ الزحیلی ۱۹۳۲ میں شام کے شمال میں واقع قصبے دایر عاتیہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۴ء تک لیبیا کے علاقے بن غازی کی اسلامی یونی ورسٹی میں آپ استاد رہے۔ آپ کو مختلف ممالک میں خصوصی لیکچرز اور تدریس کے لیے ہمیشہ پر کشش دعوتیں ملتی رہتی تھیں۔ انہوں نے ۶۰ سے زائد ممالک میں اسلامی قانون پر خصوصی لیکچرز دیے۔ ۱۹۸۴ سے لیکر ۱۹۸۹ تک آپ متحدہ عرب امارات یونی ورسٹی کے شعبہ شریعت اور قانون میں استاد رہے۔ خرطوم یونی ورسٹی سوڈان اور اسلامک یونی ورسٹی ریاض میں بھی پڑھاتے رہے۔ آپ کی تصانیف تین سو سے زائد ہیں۔ مشہور تصانیف میں تفسیر المنیر، الفقہ الاسلامی وادلتہ، آثار الحرف فی الفقہ الاسلامی، التفسیر الوسیط، اصول الفقہ الاسلامی ہیں۔ آپ مسلکا شافعی تھے لیکن مزاج فقہی تھا۔ آپ ۸ اگست ۲۰۱۵ کو ۸۳ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ (اللحام، وھبہ زحیلی، ص ۸۰)

۸ ۔ الزحیلی، وھبہ، التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج، ۱۴۹/۲۷

اسی طرح امام بغوی[1] (۱۰۴۴ء - ۱۱۲۲ء) لکھتے ہیں:

"حِكْمَةٌ تَامَّةٌ قَدْ بَلَغَتِ الغاية في الزجر"[2]

حکمت سے مراد درجہ کمال کو پہنچی ہوئی نصیحت جس میں انتہائی حکمت کی باتیں ہیں۔

جب کہ امام ابن کثیر[3] (۱۳۰۱ء - ۱۳۷۳ء) نے حکمت کا معنی ہدایت کے ساتھ کیا ہے۔[4]

۳۔ حکمت سنت کے معانی میں

سنت کا معنی اس مقام پر صرف نبی کریم ﷺ کی سنت کے لیے مختص نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایسے احکام جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل کیے گئے ہیں ان کا نفاذ اور ان کی عملی شکل مراد ہوتی ہے۔ ایک وہ احکام ہیں جو کتاب یا صحائف کی شکل میں نازل ہوئی جب کچھ اوصاف اور طریقے جو کتب اور صحائف کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کو من جانب اللہ امت کی اصلاح اُحوال کے لیے عطا کیے گئے۔ اس سے یہی حکمت مراد ہے۔ قرآن کریم میں یہی وصف ایک مقام پر تمام انبیاء علیہم السلام کے لیے، پھر کچھ خاص رسولوں کے لیے اور نبی کریم ﷺ کی امت کے لیے آپ ﷺ کے اقوال و اُفعال کے لیے مذکور ہوا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[1]

۱۔ مؤرخین انتہائی کوشش کے باوجود ان کی تاریخ پیدائش تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ ابن خلکان نے اُن کی تاریخِ وفات ۵۱۰ھ لکھی ہے۔ یعنی چوتھی صدی ہجری کا نصف آخری حصہ اور پانچویں کا آغاز ان کی زندگی پر مشتمل رہا۔ جب کہ معجم البلدان" میں آپ کی تاریخ ولادت ۴۳۶ھ درج ہے۔ خراسان کے مشہور شہر ہرات اور مرد کے درمیان ایک گاؤں، جس کا نام بعض مؤرخین نے "بغشور" لکھا ہے اور بعض نے "بغ" (قرینِ قیاس "بغ" ہی صحیح ہے) اسی نسبت سے آپ کو "بغوی" لکھا جاتا ہے۔ آپ کے شیوخ میں سے چند مشہور کے نام یہ ہیں: ابو علی حسین بن محمد بن احمد المروزی، فقہیہ خراسان، ۲۔ ابو عمر عبدالواحد بن احمد بن القاسم، ۳۔ ابوالحسین علی بن یوسف الجوینی، ۴۔ مسند ابو بکر یعقوب بن احمد الصیر فی نیشاپوری ۵۔ ابو علی ھسان بن سعید المینحی مروزی رئیس کبیر۔ آپ کی مشہور تصانیف میں تفسیر معالم التنزیل، التہذیب فی الفقہ للامام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ، مجموعہ فتاویٰ، مصابیح السنۃ، شرح السنہ۔ آپ نے پچھتر (۷۵) سال سے زائد سال کی عمر پائی اور ۵۱۶ھ میں خراسان کے شہر میں وفات پائی اور اپنے استاذ محترم حسین بن محمد کے پہلو میں "مقبرئے طالقانی" میں دفن کے گئے۔ (مرقاۃ المفاتیح خطبۃ الکتاب ۱/۸۴)

۲۔ بغوی، معالم التنزیل، ۳۲۲/۴

۳۔ نام اسماعیل کنیت ابوالفداء لقب عماد الدین اور ابن کثیر عرف ہے۔ سلسلہ نسب اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن ذرع القیسی البصروی ثم الدمشقی ہے۔ آپ کی ولادت ۷۰۰ ھجری میں بمقام مجدل ہوئی جو ملک شام کے مشہور بصریٰ کے اطراف میں ایک قریہ ہے، اس وقت آپ کے والد یہاں کے خطیب تھے، ابھی آپ تیسرے یا چوتھے برس میں ہی تھے کہ والد بزرگوار نے ۷۰۳ ھجری میں وفات پائی۔ شیوخ میں عیسی بن المعطعمؒ، بہاؤالدین قاسم بن عساکر (م ۷۲۳ھ)، عفیف الدین اسحاق بن یحیی الامدی (م ۷۲۵ھ)، محمد بن زراد، بدرالدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن سویدی (م ۷۱۱ھ)، ابن الرضی، حافظ مزی، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ، حافظ ذہبی، عماد الدین محمد بن الشیرازی (م ۸۳۹ھ) شامل ہیں۔ مشہور تصانیف میں (ا) تفسیر القرآن العظیم، البدایہ والنہایہ، التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل، الہدی والسنن فی احادیث المسانید والسنن (جامع المسانید)، طبقات الشافعیہ، مناقب الشافعی، تخریج احادیث ادلتہ التنبیہ۔ شامل ہیں۔

۴۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۴۷۵/۷

اے ہمارے رب ! ان میں انہی میں سے (وہ آخری اور برگزیدہ) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث فرما جو ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے (کر دانائے راز بنا دے) اور ان (کے نفوس و قلوب) کو خوب پاک صاف کر دے، بیشک تو ہی غالب حکمت والا ہے۔

امام ابن جریر (۸۳۹ء-۹۲۳ء) الحکمۃ کی تفسیر سنت سے کرتے ہیں، آپ قتادہ سے الحکمۃ کی تفسیر نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں (أي السنة) [2]، مزید آپ اپنا مؤقف واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال أبو جعفر: والصواب من القول عندنا في "الحكمة"، أنها العلم بأحكام الله التي لا يدرك علمها إلا ببيان الرسول صلى الله عليه وسلم، والمعرفة بها[3]

ابو جعفر [4] کہتے ہیں: یہ احکام الٰہی کا علم ہے جس کا صرف علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور آپ ﷺ نے جو ان احکامات کی اندر مقاصد، حکمت اور معرفت بتائی ہے اسی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔

حکمت بمعنی سنت کا بیان دوسری جگہ پر قرآن کریم میں اس انداز میں بیان ہوا ہے:

﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾[5]

اسی طرح ہم نے تمہارے اندر تمہیں میں سے (اپنا) رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں (نفسًا و قلبًا) پاک صاف کرتا ہے اور تمہیں کتاب کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت و دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں وہ (اَسرارِ معرفت و حقیقت) سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔

امام بغوی (۱۰۴۴ء-۱۱۲۲ء) لکھتے ہیں: (الْحِكْمَةُ السُّنَّةُ)[6] اس آیت مبارکہ میں حکمت سے مراد سنت ہے۔ ابن عطیہ اندلسی (۱۰۴۸ء-۱۱۴۶ء) حضرت قتادہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وقال قتادة الْحِكْمَةَ السنة وبيان النبي صلى الله عليه وسلم الشرائع"[7]

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ حکمت سے نبی کریم ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کے بتائے ہوئے احکامات کی وہ وضاحت ہے جو آپ ﷺ نے فرمائی ہے۔

علامہ شوکانی[1] (۱۷۵۹ء-۱۸۳۹ء) اس مقام پر لکھتے ہیں:

۱۔ البقرہ ۱۲۹/۲

۲۔ الطبری، ابن جریر، جامع البیان، ۱۱۲/۲۲

۳۔ ایضاً، ۸۷/۳

۴۔ تفسیر طبری میں مختلف مقامات پر امام طبری (قال ابو جعفر) لکھتے ہیں جس سے آپ کی اپنی ذات مراد ہوتی ہے، آپ اکثر اوقات اس کے بعد آپ وہ قول درج کرتے ہیں جو آپ کے نزدیک راجح ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام ابن حزم اپنی کتب میں (قال ابو محمد یا قال علی) لکھ کر خود اپنی ذات مراد لیتے ہیں اور اسی طرح شعب الایمان میں امام بیہقی (قال احمد) لکھ کر اپنا قول درج کرتے ہیں۔

۵۔ البقرہ: ۱۵۱/۲

۶۔ دیکھیے معالم التنزیل، ۱۸۳/۱، مزید دیکھیے: السمعانی، ابو مظفر منصور بن محمد، (م ۴۸۹ھ)، تفسیر القرآن، دار الوطن، الریاض، ۱۴۱۸ھ، ۱۴۸/۱

۷۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۲۱۲/۱

"والمراد بالكتاب هنا القرآن والحكمة السنة"[2]

کتاب سے قرآن کریم اور حکمت سے آپ ﷺ ہی کی سنت مراد ہے۔

سورۃ الجمعہ میں نبی کریم ﷺ کی صفت کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾[3]

وہی ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک (باعظمت) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھیجا وہ ان پر اس کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان (کے ظاہر و باطن) کو پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، بیشک وہ لوگ ان (کے تشریف لانے) سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت کریمہ میں حکمت کی صفت نبی کریم ﷺ کے لیے بیان فرمائی گئی ہے، حکمت سے مراد آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ مراد ہے، امام طبری (۸۳۹ء-۹۲۳ء) نے حکمت سے مراد سنت جب کہ ابن عطیہ (۱۰۴۸ء-۱۱۴۶ء) کے مطابق حکمت کا معنی صرف نبی کریم ﷺ کی سنت کے ساتھ ہے یعنی ایسی سنت جو نبی کریم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے بیان فرمائی ہے۔[4]

ابو محمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام (۱۱۸۱ء-۱۲۶۲ء) لکھتے ہیں:

"السنة أو الفقه في الدين أو الفهم والاتعاظ"[5]

۱۔ ابوعبداللہ محمد بن علی بن محمد شوکانی کے والد علی بن محمد صنعاء میں شوکانی کے انتساب سے مشہور تھے، شوکانی کی وجہ انتساب کے متعلق خود امام شوکانی لکھتے ہیں کہ شوکان یمن کے قبائل خولان کی بستی کا نام ہے، جو صنعاء سے تقریبا ایک روز کی مسافت پر واقع ہے۔ امام محمد بن علی بن محمد شوکاني رحمہ اللہ اسی شوکان سے منسوب ہیں جو یمن میں واقع ہے، شوکان سے امام شوکانی کی نسبت حقیقی نہیں۔ کیونکہ وہ خود صنعاء سے تعلق رکھتے تھے، البتہ ان کے آباؤ واجداد شوکان سے تعلق رکھتے تھے۔ امام شوکانی کی نشوونما اور تعلیم و تربیت صنعاء میں ہوئی۔ انہوں نے بہت سے اساتذہ سے قرآن مجید پڑھا۔ باقاعدہ طلبِ علم سے قبل انہوں نے زیدی فقہ کی مشہور کتاب "الازھار" عصیفری کی "مختصر الفرائض" حریری کی "الملحۃ" ابنِ حاجب کی "الکافیہ"، "الشافیہ" اور مختصر المنتھی اور علم عروض، قرآت اور علم بحث پر چھوٹے چھوٹے رسائل حفظ کر لئے تھے۔ باقاعدہ طور پر طلبِ علم سے قبل: کتبِ تاریخ وادب کے مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ امام شوکانی نے ابتدائی طور پر زیدیہ فقہ کی تعلیم حاصل کی، مگر وسعتِ مطالعہ اور حدیث میں رسوخِ علم کی وجہ سے اپنے آپ کو امام زید کی فقہ میں محصور نہ رکھ سکے۔ انہوں نے زیدیہ فقہ پر ناقدانہ نظر ڈالی اور ان تمام مقامات پر گرفت کی جہاں قرآن وسنت سے ذرا بھی انحراف پایا جاتا تھا۔ آپ کی مشہور تصنیفات میں نیل الأوطار شرح منتقی الأخبار، ارشاد الفحول إلی تحقیق الحق من علم الأصول، فتح القدیر الجامع بین فنّي الروایۃ والدرایۃ من التفسیر، الفوائد المجموعۃ في الأحادیث الموضوعۃ ہیں۔ الشیخ محمد بن علي الشوکاني نے ۱۲۵۰-۱۸۳۴م ۷۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی نماز جنازہ جامع الکبیر صنعاء میں ادا کی گئی۔ (:: حقیقت تقلید واجتھاد:: اردو ترجمۃ:: طیب شاهین لودھی: ترجمۃ الإمام الکبیر المجتھد محمد بن علي الشوکاني الیماني۔ رحمہ اللہ تعالی۔

۲۔ الشوکانی، فتح القدیر، ۳۹۵/۱

۳۔ الجمعہ: ۲/۶۲

۴۔ جامع البیان، ج ۲۲، ص ۱۰۴، المحرر الوجیز، ج ۵، ص ۳۰۶

۵۔ عزبن عبدالسلام، تفسیر العظیم، ۲۵۵/۳

آپ ﷺ کی سنت مطہرہ یا دین کی فقاہت یا وعظ ونصیحت میں آپ ﷺ کے کامل مبلغ ہونے کی صلاحیت)مراد ہے۔

علامہ قرطبیؒ (۱۲۱۴ء - ۱۲۷۳ء) نے اس آیت میں حکمت کے معانی میں تطبیق دی ہے، آپ لکھتے ہیں کہ حکمت سے مراد سنت ہو یا تفقہ فی الدین مراد ہو، ہر ایک کا تعلق نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ کے ساتھ ہے اس لیے کہ اس کے علاوہ قرآن کریم میں اور مقامات پر بھی آپ ﷺ کی صفت حکمت بیان ہوئی ہے۔[1]

اس کے علاوہ حکمت سے اس آیت میں سنت کے قول کے باقی مفسرین نے بھی اختیار فرمایا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جو ذمہ داریاں عطافرمائی ہیں ان میں قرآن کریم کی آیات کی تلاوت، تزکیہ نفس، کتاب مبین کی تعلیم اور حکمت سکھانا ہے، یعنی نبی کریم ﷺ کو یہ ذمہ داری عطافرمائی گئی کہ حکمت بھی ہر حال میں سکھائیں، اب یہ بات تو بدیہی طور پر معلوم ہو گئی کہ معلم جس کی تعلیم دے رہے ہیں وہ خود اس علم سے اور اس کی باریکیوں سے خوب اچھی طرح آشنا ہوں ورنہ معلم کی تعلیم غیر سود مند اور غیر نفع بخش ہو گی، نبی کریم ﷺ حکمت کی معرفت کو سب سے زیادہ اور بہتر طریقے سے جاننے والے تھے، تو آپ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی بھی حکمت کی تعلیم عطافرمائی، آپ ﷺ کے سارے صحابہ قرآن کریم کی حافظ نہیں تھے لیکن قرآن کریم کی فقاہت اور اس کے اسرار ورموز میں ماہر تھے، یہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم حکمت کا نتیجہ ہے جس کو اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سنت مطہرہ کا علم قرآن کریم کے اسرار و رموز سیکھنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، آپ ﷺ کے اقوال، افعال اور آپ ﷺ کی تقریرات، آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے ارشادت قرآن مجید کی تفسیر کا اعلیٰ اور ارفع ذریعہ ہیں، پھر قرآن کریم کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے تابعین کے اقوال بھی مدد فراہم کرتے ہیں، اس آیت کریمہ میں اگرچہ حکمت سے مراد سنت ہی کو ترجیح حاصل ہے لیکن حکمت سے مراد سنت ہو یا شریعت کے اسرار ورموز ہوں یا پھر حکمت سے فقہی احکام کی سمجھ بوجھ مراد ہو، ان میں کوئی منافات اور تقابل نہیں ہے۔[3]

سورۃ البقرہ میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے بیویون سے حسن سلوک کا حکم دیا اور اپنی نعمتوں کی یاد دہانی کروائی گئی تاکہ راہ ہدایت کے طبگار شکر کے مقام کو حاصل کریں اور اللہ کی رضا اور اس کی معرفت ان کے لیے آسان ہو، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾[4]

---

۱ ۔ دیکھیے: قرطبیؒ، ۱۶۶/۵، محاسن التاویل، ۲۲/۹

۲ ۔ اس آیت کریمہ میں حکمت سے سنت مراد ہے، دیکھیں: ارشاد العقل السلیم، ۱۷۹/۱، تفسیر ابن کثیر، ۴۹۷/۱، محاسن التاویل، ۴۳۲/۱، صفوۃ التفاسیر، ۹۴/۱

۳ ۔ الطبری، جامع البیان، ۲۱۱/۳

۴ ۔ البقرہ: ۲۳۱/۲

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت (پوری ہونے) کو آ پہنچیں تو انہیں اچھے طریقے سے (اپنی زوجیّت میں) روک لو یا انہیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو، اور انہیں محض تکلیف دینے کے لیے نہ روکے رکھو کہ (ان پر) زیادتی کرتے رہو، اور جو کوئی ایسا کرے پس اس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا، اور اللہ کے احکام کو مذاق نہ بنالو، اور یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو جو تم پر (کی گئی) ہے اور اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل فرمائی ہے اور دانائی (کی باتوں) کو (جن کی اس نے تمہیں تعلیم دی ہے) وہ تمہیں (اس امر کی) نصیحت فرماتا ہے، اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا ہے۔

اس جگہ کتاب سے قرآن کریم اور حکمت سے سنت، مواعظ قرآن اور فقہ یعنی قرآن کریم کے احکامات کی سمجھ بوجھ حاصل کرنا مراد ہے۔

امام شافعی (۷٦۷ء-۸۲۰ء) نے اپنی تفسیر میں حکمت کے مفہوم میں لکھا ہے کہ اگر لفظ (الحکمة) قرآن کریم میں (الکتاب) کے بعد مذکور ہو تو اس سے مراد سنت ہے[1]، آپ لکھتے ہیں:

"فسمعت من أرضى من أهل العلم بالقرآن يقول: الحكمة سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم"[2]

میں نے ایک ایسے شخص سے جو اہل قرآن ہے اس سے حکمت کے بارے میں سوال کیا تو بتایا گیا کہ کتاب سے مراد نبی کریم ﷺ کی سنت مطہرہ ہے۔

امام طبری (۸۳۹ء-۹۲۳ء) نے اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَهِيَ السُّنَن الَّتِي عَلَّمَكُمُوهَا رَسُول الله صَلَّى اللَّه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَنَّهَا لَكُمْ"[3]

یہاں حکمت سے مراد وہ احکام ہیں جو نبی کریم ﷺ امت کو سکھائے ہیں اور آپ ﷺ کا طریقہ اور راستہ مراد ہے۔

امام خازن[4] (۱۲۸۰ء-۱۳۴۱ء) نے بھی اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

---

۱ ۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ امام شافعی نے ان مقامات کی بھی نشاندہی فرمائی ہے جہاں پر الحکمة کی صفت کا خطاب نبی کریم ﷺ کو عطا فرمایا گیا ہے یا اس کے علاوہ وہ مقامات جہاں آپ ﷺ کی امت کو عورتوں کو اور خصوصا ایک مقام پر ازواج مطرات کو حکمت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان سب مقامات میں کتاب کے بعد الحکمة مذکور ہے اور اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی سنت مطہرہ ہے۔ ایسی سات آیات ہیں: ۱۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا ----- وَيُعَلِّمُهُمُ **الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ**۔ (البقرہ: ۱۲۹/۲) ۲۔ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا ----- وَيُعَلِّمُكُمُ **الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ**۔ (البقرہ: ۱۵۲/۲)۔ ۳۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ **الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ** ۔ (البقرہ: ۱۳۱/۲)۔ ۴۔ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ----- وَيُعَلِّمُهُمُ **الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ**۔ (آل عمران: ۱۶۴/۳)، ۵۔ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ ----- وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ **الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ**۔ (النسآء: ۱۱۳/۴)، ۶۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ **آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ**۔ (الاحزاب: ۳۴/۳۳)۔ ۷۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا ----- **الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ**۔ (الجمہ: ۳/۶۲)

۲ ۔ شافعی، محمد بن ادریس، تفسير الإمام الشافعي، دار التدمریۃ-المملكة العربية السعودية، (۱۴۲۷ھ)، ۲۲۵/۱

۳ ۔ الطبری، جامع البیان، ۱۰۴/۴

۴ ۔ علاء الدین علي بن محمد بن ابراہیم بن عمر الشیحي۔ آپ امام خازن کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ بغداد میں ۶۷۸ ھجری میں پیدا ہوئے۔ دمشق کی مشہور خانقاہ خانقاہ السمیساطیۃ کے کتب خانہ کے خازن ہونے کے ناطے "الخازن" کالقب پایا۔ آپ تفسیر حدیث اور فقہ شافعی کے بہت بڑے عالم دین تھے۔ آپ کی تفسیر لباب التأويل في معاني التنزيل۔۔ اصل میں مشہور محدث امام محیي السنة، ابو محمد الحسین بن مسعود البغوي (م ۵۱۰ھ)

"يعني السنة التي علمها رسول الله صلى الله عليه وسلم وسنها لكم"[1]

یہاں حکمت سے مراد نبی کریم ﷺ کی سنت ہے جو خود نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو سکھایا اور اپنے عمل سے امت کے لیے طریقہ جاری فرمایا

جن مقامات پر قرآن کریم میں الکتاب کے بعد الحکمۃ مذکور ہے اس سے آپ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کے بتائے ہوئے احکامات کی تشریح و توضیح مراد ہے جو خود نبی کریم ﷺ نے اپنے بیان مبارک سے واضح فرمائی ہو۔

سورۃ النساء میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَن يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ ۖ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِن شَيْءٍ ۚ وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾[2]

اور (اے حبیب!) اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان (دغابازوں) میں سے ایک گروہ یہ ارادہ کر چکا تھا کہ آپ کو بہکا دیں، جب کہ وہ محض اپنے آپ کو ہی گمراہ کر رہے ہیں اور آپ کا تو کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتے، اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے اور اس نے آپ کو وہ سب علم عطا کر دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے، اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

نزول کتاب کے ساتھ حکمت کے نزول کا بھی ذکر کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح نبی کریم ﷺ پر کتاب نازل فرمائی اسی طرح حکمت کو بھی نازل فرمایا، آیت میں کتاب اور حکمت کے درمیان واو عاطفہ کا ذکر ہے معطوف اور مطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے یعنی کتاب اور ہے اور حکمت کسی اور چیز کا نام ہے، مفسرین کرام نے اگرچہ اس مقام پر ذکر ہونے والے حکمت سے مراد قرآن کریم کا ایک ہی حصہ ہے اور وہ قرآن کریم سے ہی ماخوذ ہے، یہاں حکمت سے مراد ایسی گہری بصیرت ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر اپنے خاص اور برگزیدہ بندوں کے لیے نازل فرمائی، اس سے مراد نبوت ہے یا شریعت کے احکام کی تمام جزیبات کا علم ہے یا حکمت سے مراد شریعت کے احکامات کو عملاً امت میں رائج کرنے کے سلیقہ اور طریقہ مراد ہے۔ اس کے تعلق اقوال سے زیادہ افعال کے ساتھ ہوتا ہے، حکمت کا یہ وصف اور کمال اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف انبیاء علیہم السلام کا خاصا ہے کہ کتاب اور شریعت کے احکام کو عملاً کس طرح کرنا ہے۔

کتاب کے ساتھ حکمت زیادہ مقامات پر استعمال ہوا ہے، اگرچہ کتاب کے ساتھ حکمت کا تعلق ضرور ہے، اسی لیے امام بغوی (۱۰۴۴ء - ۱۱۲۲ء) نے اس آیت میں حکمت کا معنی (بِالْقُرْآنِ)[3] کے ساتھ کیا ہے یعنی دین کی دعوت قرآن کریم سے پھیلاؤ، مگر حکمت کتاب کے علاوہ ایک اور اضافی خوبی، صفت اور کمال ہے جو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔ جب کہ امام بیضاوی (۱۲۰۱ء - ۱۲۸۶ء) نے اس آیت میں حکمت کا معنی اس طرح لکھے ہیں:

کی تفسیر معالم التنزیل فی تفسیر القرآن کی تلخیص ہے، جس میں خازن نے اپنی طرف سے بھی کچھ اضافے کیئے ہیں، خاص کر کثیر اسرائیلیات باطلہ بغیر تعاقب اپنی تفسیر میں درج کر دیں۔ آپ کی وفات ۷۴۱ ھجری کو حلب (شام) میں ہوئی۔ (علامہ اسلمی، مجلہ نداء الایمان، ص ۴۴)

۱۔ الخازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، ۱/۱۶۵

۲۔ النساء: ۴/۱۱۳

۳۔ بغوی، معالم التنزیل، ۳/۱۰۳

"بِالْحِكْمَةِ بالمقالة المحكمة، وهو الدليل الموضح للحق المزيح للشبهة"

(واضح اور روشن دلائل اور برھان کے ساتھ، ایسی دلائل جن سے حق واضح ہو اور شبہات کا ازالہ ہو)[1]

نبی کریم ﷺ کو حکمت کی تعلیم جس طرح مردوں کو دیتے اسی طرح عورتوں کے لیے تعلیم کتاب، تعلیم حکمت کی ذمہ داریاں نبھاتے تھے، آپ ﷺ اپنے گھر کے اندر عورتوں کو قرآن کریم کی آیات کی تلاوت، قرآن کریم کی تعلیم، تزکیہ نفس اور حکمت کی تعلیم دیتے، آپ ﷺ کے اقوال کی طرح آپ ﷺ کے افعال بھی امت مسلمہ چاہے مرد ہوں یا عورتیں، سب کے لیے اسوہ حسنہ ہیں، جس طرح آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے آپ ﷺ کی تعلیمات مبارکہ کی حفاظت اور اس کے سلسلہ کو جاری رکھا اسی طرح آپ ﷺ نے گھر میں عورتوں کو جس طریقے سے دین کے احکامات اور قرآنی حکمت کی تعلیم دی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے گھر کے اندر کی حیات کو بھی لوگوں تک پہنچانے کا حکم فرمایا، تاریخ گواہ ہے کہ جس طرح صحابہ کرام نے آپ ﷺ کے علم کو آگے پہنچایا، صحابیات نے بھی اس کاوش کو اسی طرح ادا فرمایا، عورتوں کے جملہ مسائل زیادہ تر صحابیات کے ذریعے امت مسلمہ تک پہنچے، اسی تعلیم و تربیت میں صرف قرآن کریم شامل نہیں بلکہ وحی غیر متلو بھی شامل ہے جس کو قرآن کریم نے سنت اور حکمت سے تعبیر فرمایا۔

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا﴾[2]

اور تم اللہ کی آیتوں کو اور (رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی) سنت و حکمت کو جن کی تمہارے گھروں میں تلاوت کی جاتی ہے یاد رکھا کرو، بیشک اللہ (اپنے اولیاء کے لئے) صاحب لطف (اور ساری مخلوق کے لئے) خبردار ہے۔

اس آیت کریمہ میں آیات اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید اور حکمت سے نبی کریم ﷺ کا فعل مبارک اور آپ ﷺ کا طریقہ مراد ہے، آپ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں گھروں کے اندر جو طرز عمل اپنایا۔ اس کا تعلق جس کیفیت سے تھا، قرآن کریم نے ازواج مطہرات کو کتاب اللہ اور حکمت کا محفوظ رکھنے اور امت مسلمہ تک پہنچانے کا حکم دیا۔

امام طبری (۸۳۹ء-۹۲۳ء) لکھتے ہیں:

"ما أوحي إلى رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم من أحكام دين الله، ولم ينزل به قرآن، وذلك السنة"[3]

اس سے مراد دین کے وہ احکام جو نبی کریم ﷺ پر بذریعہ وحی نازل ہوئے ہیں اور جن کے بارے میں قرآن کریم نزول نہیں ہوا تھا اور یہ احکام آپ ﷺ کی سنت قرار پاتے ہیں۔

اس آیت میں حکمت سے مراد وہ وعظ و نصیحت مراد ہے جو گھروں میں ازواج مطہرات کو نبی کریم ﷺ مختلف اوقات میں کیا کرتے تھے۔[1]

---

۱ ۔ البیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل، ۳/۳۴۵

۲ ۔ الاحزاب: ۳۳/۳۴

۳ ۔ الطبری، جامع البیان، ۲۰/۳۶۳

ابو اسحاق ثعلبی (م ۱۰۳۵ء) نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ جب کہ امام بغوی (۱۰۴۴ء - ۱۱۲۲ء) نے اس مقام پر حکمت کا معنی سنت سے کیا ہے، فتح القدیر میں علامہ شوکانی (۱۷۵۹ء - ۱۸۳۹ء) بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[۲]

اس آیت کریمہ میں ﴿مَا يُتْلَىٰ﴾ سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ حکمت سے یہاں قرآن کریم کی تلاوت مراد ہے اس لیے کہ تلاوت کے ساتھ ہی حکمت کا ذکر بھی ہے یعنی قرآن کریم اور حکمت کی تلاوت، لیکن ﴿يُتْلَىٰ﴾ تلاوت کا تعلق صرف قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ نہیں، اس لیے کہ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر

﴿وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ﴾[۳]

(اور وہ (یہود تو) اس چیز (یعنی جادو) کے پیچھے (بھی) لگ گئے تھے جو سلیمان (علیہ السلام) کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے)

اس آیت میں تلاوت کا تعلق صرف کتاب اللہ کے ساتھ نہیں بلکہ اس جادو اور منتر پڑھنے کے ساتھ بھی کیا گیا ہے جو شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ جس طرح قرآن کریم میں تلاوت کا تعلق صرف قرآن کریم کی آیات پڑھنے کے ساتھ ہی نہیں ہے اسی طرح اس آیت میں حکمت کا معنی تلاوت قرآن کریم نہیں ہے بلکہ نبی کریم ﷺ کی سنت، آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ اور وعظ و نصیحت مراد ہے۔

اس آیت کریمہ میں حکمت کا ایک معنی نبی کریم ﷺ کی طرف سے سکھائے گئے دین کے احکامات، آپ ﷺ کی وعظ و نصیحت، آپ ﷺ کا طرز عمل مراد ہے، دوسرا معنی سنت یعنی آپ ﷺ کا طریقہ مراد ہے۔ علامہ جلال الدین قاسمی[۴] (۱۸۶۶ء - ۱۹۱۴ء) میں محاسن التاویل میں دونوں معنی میں مطابقت بیان فرمائی ہے سنت اور آپ ﷺ کی وعظ و نصیحت ایک ہی معنی میں ہیں۔[۵]

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قرآن کریم کی صورت علم کا خزانہ عطا فرمایا اور اعلیٰ بصیرت، خلق عظیم اور معاملات کی درستگی کی بھی صلاحیت بخشی، ان آیات میں یہی چیز قرآن کریم کی نگاہ میں حکمت ہے جس کو مفسرین کرام نے سنت کہا ہے۔[۶]

حکمت کی صفت تمام انبیاء علیہم السلام کو عطا فرمائی گئی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

۱ ۔ السمرقندی، بحر العلوم، ۴۰۷/۳

۲ ۔ بغوی، معالم التنزیل، ۳۵۱/۶ شوکانی، فتح القدیر، ۲۶۳/۴

۳ ۔ البقرہ: ۱۰۲/۲

۴ ۔ محمد جلال الدین ابوالفرج محمد سعید بن قاسم۔ اپنے جد امجد کی نسبت کی وجہ سے قاسمی کہلاتے ہیں۔ ولادت ۱۸۶۶ء میں دمشق میں ہوئی۔ آپ کے مشہور اساتذہ میں بکری بن حامد، شیخ سلیم بن یاسین، شیخ محمد بن محمد خانی نقشبندی ہیں۔ آپ کی مشہور تصانیف میں قواعد التحدیث من فنون مصطلح الحدیث، تاریخ الجہمیہ والمعتزلہ، الفتوی فی الاسلام، محاسن التاویل (تفسیر قاسمی) ہیں۔ آپ کی وفات ۱۹۱۴ء میں دمشق میں ہوئی۔ (اتجھات التفسیر، ۱۶۳/۱)

۵ ۔ قاسمی، محاسن التاویل، ۱۱۸/۳

۶ ۔ معالم التنزیل، ۷۰۰/۱، زاد المسیر، ۱۰۴/۲، التحریر والتنویر، ۱۹۷/۵

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ﴾[1]

اور (اے محبوب ! وہ وقت یاد کریں) جب اللہ نے انبیاء سے پختہ عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت عطا کر دوں پھر تمہارے پاس وہ (سب پر عظمت والا) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے جو ان کتابوں کی تصدیق فرمانے والا ہو جو تمہارے ساتھ ہوں گی تو ضرور بالضرور ان پر ایمان لاؤ گے اور ضرور بالضرور ان کی مدد کرو گے، فرمایا : کیا تم نے اقرار کیا اور اس (شرط) پر میرا بھاری عہد مضبوطی سے تھام لیا؟ سب نے عرض کیا : ہم نے اقرار کرلیا، فرمایا کہ تم گواہ ہو جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

اس آیت کریمہ معنی علامہ سید طنطاوی[2] (۱۹۲۸ء-۲۰۱۰ء) نے اپنی تفسیر الوسیط کے اندر اس مقام پر کلمہ حکمت کا معنی لکھتے ہیں :

"الوحی الوارد بالتكاليف المفصلة التي لم يشتمل عليها الكتاب"[3]

کتاب کے علاوہ ہر وہ چیز جو انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف جو وحی فرمائی گئی اور ان کو اس کا مکلّف بھی کیا گیا وہ سب حکمت ہے) اور اس مقام پر حکمت سے یہی مراد ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد ربانی ہے :

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾[4]

جب اللہ فرمائے گا : اے عیسیٰ ابن مریم ! تم اپنے اوپر اور اپنی والدہ پر میرا احسان یاد کرو جب میں نے پاک روح (جبرائیل) کے ذریعے تمہیں تقویت بخشی، تم گہوارے میں (بعہد طفولیت) اور پختہ عمری میں (بعہد تبلیغ ورسالت یکساں انداز سے) لوگوں سے گفتگو کرتے تھے، اور جب میں نے تمہیں کتاب اور حکمت (و دانائی) اور تورات اور انجیل سکھائی، اور جب تم میرے حکم سے مٹی کے گارے سے پرندے کی شکل کی مانند (مورتی) بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ (مورتی) میرے

---

۱ ۔ آل عمران : ۸۱/۳

۲ ۔ محمد سید طنطاوی (ولادت: ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء - وفات: ۱۰ مارچ ۲۰۱۰ء) مصر کے مشہور ادارہ جامعہ الازہر کے سابق سربراہ تھے۔ شیخ طنطاوی کو سنہ ۱۹۹۶ء میں جامعۃ الازہر کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ طنطاوی حقوق نسواں جیسے معاملات میں آزاد خیالی کے حوالہ سے کافی مشہور ہوئے۔ مارچ دو ہزار دس میں سعودی عرب میں دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا۔

۳ ۔ طنطاوی، التفسیر الوسیط للقرآن الکریم، ۱۶۵/۲، ابن عطیہ نے بھی ان تمام اقوال کو اسی طرح ترجیح دی ہے، المحرر الوجیز، ۴۳۸/۱

۴ ۔ المائدہ ۱۱۰/۵

حکم سے پرندہ بن جاتی تھی، اور جب تم مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں (یعنی برص زدہ مریضوں) کو میرے حکم سے اچھا کردیتے تھے، اور جب تم میرے حکم سے مردوں کو (زندہ کر کے قبر سے) نکال (کھڑا کر) دیتے تھے، اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تمہارے (قتل) سے روک دیا تھا جب کہ تم ان کے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تو ان میں سے کافروں نے (یہ) کہہ دیا کہ یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حکمت سے نوازا، ابن جریر طبری کے نزدیک اس مقام پر حکمت سے مراد تورات کے احکام کی تشریح و توضیح ہے، اور امام بغوی نے اس سے مراد علم و فہم لیا ہے، یعنی تورات کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشیاء کی معرفت مراد ہے اور علم کے حصول کے ذرائع مراد ہیں۔[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ﴾ [2]

اور اللہ اسے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل (سب کچھ) سکھائے گا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد بیان کیا گیا ہے، آپ کی بعثت کا مقصد کتاب کی تعلیم دینا اور حکمت سے روشناس کرانا ہے، کتاب سے مراد تورات اور حکمت انجیل کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نئی شریعت عطا نہیں فرمائی گئی بلکہ تورات کے احکامات کو ہی مختلف اسلوب اور زمانے کے اعتبار سے لوگوں تک پہنچانا آپ کی بعثت کا مقصد تھا، گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کو صرف کتاب کی تعلیم کے لیے ہی نہیں بلکہ حکمت عطا فرما کر اس کو بھی لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری عطا فرمائی تھی۔

اس آیت کریمہ میں حکمت کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے، ایک تو یہ واضح ہے کہ یہاں حکمت سے مراد تورات یا انجیل نہیں بلکہ الگ ایک صفت اور کمال ہے، مفسرین کرام نے اس کے علاوہ حکمت کا معنی علم اور فقہ، تہذیب اخلاق، شریعت کے اسرار و رموز، کتاب کی معرفت اور باریک بینی اور اشیاء کو ان کی اصلیت کے اعتبار سے پہچاننا مراد ہے۔[3]

امام طبری نے تمام معانی میں تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہر ایک معنی دوسرے معنی کو متضمن ہے اور ہر معنی مراد ہو سکتا ہے، جس قول کو آپ نے ترجیح دی ہے وہی قول ان تمام معانی کو شامل ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"وهي السنة التي يُوحيها إليه في غير كتاب"[4]

تورات کے علاوہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو وحی کیا گیا وہ سب حکمت ہے۔

مفسرین کرام کے نزدیک نبی کریم ﷺ کی صفت (الحکمة) سے مراد (والمعنى متقارب)[1] یہ تمام قریب المعنی مراد ذکر کی گئی ہے۔ اس جگہ راجح قول کے مطابق حکمت سے تو سنت ہی مراد ہے تاہم باقی معانی جن میں

۱۔ جامع البیان، ۲۱۵/۱۱، معالم التنزیل، ۱۰۱/۲

۲۔ آل عمران ۴۸/۳

۳۔ جامع البیان، ۴۲۲/۶، معالم التنزیل، ۴۴۴/۱، مفاتیح الغیب، ۲۲۶/۸

۴۔ دیکھیے: جامع البیان، ۴۲۲/۶، المحرر الوجیز، ۴۳۸/۱

دین کی فہم مراد ہے تو دین کے فہم کے لیے نبی کریم ﷺ کے اقوال اور آپ ﷺ کا طریقہ ہی لازم اور احسن ہے۔ پھر قرآن کریم کی آیات کی معرفت بھی آپ ﷺ کے بغیر ممکن نہیں اس لیے کہ آپ ﷺ نہ قرآن کریم کے پہلے قاری اور اولین مفسر ہیں۔ قرآن کریم میں احکام الٰہی اور سنت نبویہ ﷺ میں موجود احکامات کے اندر کیا پوشیدہ حکمت اور غرض وغایت ہے، خود نبی کریم ﷺ کی سنت مطہرہ سے واضح اور ظاہر ہے، اس لیے باقی تمام معانی دراصل ایک معنی سنت کے گرد گھوم رہے ہیں۔ علامہ سید طنطاوی اور علامہ ابن کثیر نے اس مقام پر ذکر کیا ہے کہ (ولا منافاة) [2] ان تمام معانی میں کوئی منافاۃ نہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴾ [3]

اور جب عیسیٰ (علیہ السلام) واضح نشانیاں لے کر آئے تو انہوں نے کہا: یقیناً میں تمہارے پاس حکمت و دانائی لے کر آیا ہوں اور (اس لیے آیا ہوں) کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تمہارے لیے خوب واضح کر دوں، سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

اس آیت میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے مقاصد بیان فرمائے گئے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنا قول بیان کیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس نئی شریعت نہیں لے کر آیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے معجزات اور پختہ دلائل دے کر بھیجا ہے تاکہ تمہارے لیے راہ ہدایت کو پانا آسان ہو جائے اور تمہارے لیے شریعت کے احکام کی حکمتوں کو سمجھنا بھی آسان ہو جائے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو دین کی حکمت، احکامات کے مقاصد اور ان کی غرض وغایت سمجھانے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔

مفسرین کرام نے یہاں حکمت کا معنی نبوت، انجیل سے کی ہے، علامہ شوکانی نے جو الگ چیز بیان کی ہے وہ (أی النبوة وقیل الإنجیل وقیل مایرغب فی الجمیل ویکف عن القبیح) [4] ہے یعنی حکمت سے مراد یا تو نبوت ہے یا انجیل مقدس ہے اور حکمت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ ایسا علم جو احسن امور کی طرف رغبت دلائے اور قبیح امور سے بچائے)۔

۴۔ حکمت بمعنی علم اور فہم

مفسرین کرام نے اصطلاح قرآنی (الحكمة) کا ایک مفہوم علم اور فہم کیا ہے۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ ۚ وَمَن يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾ [5]

۱۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۳۱/۲

۲۔ دیکھیے ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۴۴۵/۱، طنطاوی، التفسیر الوسیط، ۲۲۴/۱

۳۔ الزخرف ۶۳/۴۳

۴۔ الشوکانی، فتح القدیر، ۵۶۲/۴

۵۔ لقمان: ۱۲/۳۱

اور بیشک ہم نے لقمان کو حکمت و دانائی عطا کی، (اور اس سے فرمایا) کہ اللہ کا شکر ادا کرو اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے شکر کرتا ہے، اور جو ناشکری کرتا ہے تو بیشک اللہ بے نیاز ہے (خود ہی) سزاوار حمد ہے۔

حضرت لقمان[۱] کو اللہ تعالیٰ نے حکمت کی صفت سے نوازا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہما کہتے ہیں اس سے مراد قرآن کریم ہے، جب کہ مجاہد، ضحاک اور قتادہ نے حکمت کا معنی (الإصابة في القول والفعل)[۲] سے کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم کے ناسخ ومنسوخ، محکم و متشابہ، تقدم و تاخر وغیرہ یعنی علوم القرآن کی معرفت مراد ہے جب کہ ابوالعالیہ، قتادہ اور ابراھیم نے حکمت کا معنی فہم قرآن کیا ہے، حضرت مجاہد نے فرمایا حکمت سے مراد علم اور فقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کو حکمت کا علم دیا، حضرت لقمان نے حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ پایا اور آپ علیہ السلام سے علم سیکھا۔ مفسرین کرام نے اس آیت کریمہ میں وارد حکمت کا معنی عقل و فہم اور تدبر سے بھی کیا ہے، امام الطبری نے اس آیت کریمہ میں لقمان علیہ السلام کی طرف منسوب حکمت کا معنی (الفقه والعقل والإصابة في القول من غير نبوّة)[۳] سے کیا ہے۔ اسی طرح کچھ مفسرین کرام نے اس سے مراد تدبر و تفکر کی صلاحیت اور عقل اور فہم کا کامل ہونا مراد ہے، امام ثعلبی (م ۱۰۳۵ء) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"يعني العقل والعلم والعمل به والإصابة في الأمور"[۴]

حضرت لقمان کی صفت حکمت سے مراد عقل اور علم کے مطابق عمل کرنا اور امور (دینی و دنیوی) میں حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کا نام ہے۔

علامہ بغوی (۱۰۴۴ء - ۱۱۲۲ء) ابن قتیبہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

---

۱ ۔ مشہور مؤرخ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ حضرت لقمان رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ کا نسب یہ ہے "لقمان بن ناعور یا باعور بن ناحور بن تارخ۔ حضرت وہب رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ کا قول ہے کہ حضرت لقمان رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ حضرت ایوب عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے بھانجے تھے جبکہ مفسر مقاتل نے کہا کہ حضرت ایوب عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی خالہ کے فرزند تھے۔ آپ نے حضرت داؤد عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کا زمانہ پایا اور اُن سے علم حاصل کیا۔ حضرت داؤد عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے اعلانِ نبوت سے پہلے فتویٰ دیا کرتے تھے اور جب آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نبوّت کے مَنصب پر فائز ہوئے تو حضرت لقمان رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ نے فتویٰ دینا بند کر دیا۔ آپ رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ کے نبی ہونے میں اختلاف ہے، اکثر علماء اسی طرف ہیں کہ آپ حکیم تھے نبی نہ تھے۔ حضرت لقمان علیہ السلام کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے بعض نے آپ کو نبی کہا اور بعض نے ولی کہا ہے۔ مگر جمہور علماء کا قول ہے کہ آپ ولی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، سرکارِ دو عالم صَلَّی اللہ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا "حضرت لقمان رَضِیَ اللہ تَعَالٰی عَنْہُ نبی نہیں تھے بلکہ وہ غور و فکر کرنے والے اور دولتِ یقین سے مالا مال بندے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں حکمت کی نعمت عطا فرمائی تھی۔ تفسیر فتح الرحمن میں ہے کہ آپ کی قبر صرفند میں ہے جو رملہ کے قریب ہے۔ جب کہ حضرت قتادہ کا قول ہے کہ آپ کی قبر رملہ میں مسجد اور بازار کے درمیان ہے۔ اس جگہ ستر انبیاء علیھم السلام بھی مدفون ہیں۔ (اسماعیل حق، تفسیر روح البیان، ۷/۷، بغوی، لقمان، تحت الآیۃ: ۱۲، ۴۲۳/۳، تفسیر ثعلبی، ۱۲/۷)

۲ ۔ ملاحظہ کریں: الطبری، جامع البیان، ۵۷۷/۵

۳ ۔ جامع البیان، ۱۳۴/۲۰

۴ ۔ الثعلبی، الکشف والبیان، ۳۱۲/۷

”هِيَ الْعِلْمُ والعمل به ، وَلَا يَكُونُ الرَّجُلُ حَكِيمًا حَتَّى يَجْمَعَهُمَا“[1]

حکمت سے علم اور پھر اس پر کما حقہ عمل مراد ہے، آپ کہتے ہیں کہ حکیم وہی ہے جس میں یہ دونوں چیزیں (علم اور عمل جمع ہوں، جس میں یہ ایک بھی مفقود ہو وہ حکمت سے خالی ہے۔

اس کے علاوہ حکمت کا مختلف معانی دین میں تقوی اور پرہیزگاری، خشیت الٰہی، دین میں عقل سلیم اور فہم دین بیان کیے گئے ہیں۔[2]

جمہور مفسرین کا قول ہے کہ حضرت لقمان کو اللہ تعالیٰ نے حکمت کا علم عطا فرمایا، آپ نبی نہیں تھے، آپ نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو اللہ تعالیٰ کے احکامات کے عین مطابق تھیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے نہایت برگزیدہ اور اطاعت گزار بندے تھے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو شکر کرنے کا حکم دیا اور ناشکری سے بچنے کی ترغیب دی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ ۚ وَمَن يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾[3]

اور بیشک ہم نے لقمان کو حکمت و دانائی عطا کی، (اور اس سے فرمایا) کہ اللہ کا شکر ادا کرو اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے شکر کرتا ہے، اور جو ناشکری کرتا ہے تو بیشک اللہ بے نیاز ہے (خود ہی) سزاوار حمد ہے

مفسرین کرام میں امام بغوی، ابن عطیہ، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت لقمان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عقل اور فہم، فقہ کی علم اور دین کی سمجھ بوجھ عطا کی گئی، پھر ابن کثیر نے مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

”فَهَذِهِ الْآثَارُ مِنْهَا مَا هُوَ مُصرَّح فِيهِ بِنَفْيِ كَوْنِهِ نَبِيًّا، وَمِنْهَا مَا هُوَ مُشْعِرٌ بِذَلِكَ؛ لِأَنَّ كَوْنَهُ عَبْدًا قَدْ مَسَّه الرِّقُّ يُنَافِي كَوْنَهُ نَبِيًّا؛ لِأَنَّ الرُّسُلَ كَانَتْ تُبْعَثُ فِي أَحْسَابِ قَوْمِهَا؛ وَلِهَذَا كَانَ جُمْهُورُ السَّلَفِ عَلَى أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيًّ----- الْفِقْهُ فِي الْإِسْلَامِ، الْفَهْمَ وَالْعِلْمَ وَالتَّعْبِيرَ“[4]

ایسے ہی آثار صاف ہیں کہ آپ نبی نہ تھے۔ بعض روایتیں اور بھی ہیں جن میں گو صراحت نہیں کہ آپ نبی نہ تھے لیکن ان میں بھی آپ کا غلام ہونا بیان کیا گیا ہے جو ثبوت ہے اس امر کا کہ آپ نبی نہ تھے کیونکہ غلامی نبوت کے منافی ہے۔ انبیاء کرام عالی نسب اور عالی خاندان کے ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے جمہور سلف کا قول ہے کہ حضرت لقمان نبی نہ تھے۔

اس آیت کریمہ میں جمہور مفسرین نے حکمت سے مراد اسلام کی سمجھ ہے۔ حضرت لقمان نہ نبی تھے نہ ان پر وحی آئی تھی پس سمجھ علم اور عبرت مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا شکر بجالانے کا حکم فرمایا تھا کہ جو علم و عقل آپ کو عطا کی گئی ہے اور دوسروں پر جو بزرگی عطا فرمائی ہے۔ اس پر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ اسی طرح جمہور مفسرین نے آپ کے نبی ہونے کی بھی تردی فرمائی ہے۔[5]

---

۱ ۔ البغوی، معالم التنزیل، ۱۶۸/۱

۲ ۔ الثعلبی، احمد بن محمد، الکشف والبیان فی تفسیر القرآن، (بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۴۲۲ھ)، ۹۸/۵

۳ ۔ لقمان: ۱۲/۳۱

۴ ۔ الواحدی، تفسیر الوسیط، ۴۳۴/۳

۵ ۔ ابن کثیر، ۳۳۵/۶، المحرر الوجیز، ۹۲/۵، فتح القدیر، ۲۷۳/۴

ابن عطیہ اور امام قرطبیؒ نے ان تمام معانی کی تفصیل بیان کرکے یہ وضاحت کی ہے اس آیت میں حکمت کے جس معنی کو ترجیح ہے وہ

"الإصابة في القول والفعل"

قول اور فعل کی درستگی اور ان میں مطابقت

ہے لیکن اس مقام پر اور جتنے معانی مراد لیے گئے ہیں وہ سب قریب المعنی ہیں اس لیے کہ حکمت الاحکام سے مصدر ہے جس کا معنی اقوال اور افعال میں درستگی اور واقعے کے مطابق اشیاء کی حقیقت تک رسائی، اس تعریف کے اعتبار سے حکمت سے سنت بھی مراد ہے اور باقی معانی بھی مراد ہیں، حکمت کا تعلق ایسی خوبی کے ساتھ ہے جس سے انسان سفاہت، جہالت اور اضطرابی کیفیت سے محفوظ رہے، پس اس اعتبار سے علم بھی حکمت ہے اور قرآنی علوم بھی حکمت ہیں، حکمت کا تعلق سنت سے ہو، قرآن کریم سے یا عقل سے ہو یا فہم سے ہو، حکمت انسان کو ہر فعل قبیح سے روکتی ہے، اس لیے یہ تمام معانی مراد ہو سکتے ہیں۔[1]

امام رازی یہاں حکمت سے مراد لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"إشارة إلى محاسن الشريعة وأسرارها وعللها ومنافعها"[2]

شریعت اسلامیہ کے محاسن اور اس کے کمالات، اس کے اسرار و رموز اور اس کی منفعت اور اس کی علل) مراد ہے۔

سورۃ الانعام میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾[3]

یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائی

سورۃ مریم میں ہے:

﴿يَا يَحْيَى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾[4]

اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے پکڑو، ہم نے اس کو بچپن ہی میں قوت فیصلہ عطا فرمائی تھی۔

جار اللہ زمخشری[5] (۱۰۷۵ء-۱۱۴۳ء) لکھتے ہیں:

"وهو الفهم للتوراة والفقه في الدين"[6]

۱۔ دیکھیے المحرر الوجیز، ابن عطیہ، ۲۶۴/۱، الجامع لاحکام القرآن، قرطبیؒ، ۳۳۱/۳

۲۔ مفاتیح الغیب، ۴۱۹/۹

۳۔ الانعام: ۸۹/۶

۴۔ مریم: ۱۲/۱۹

۵۔ ابوالقاسم محمود بن عمر بن محمد خوارزمی زمخشری معتزلی ممتاز عالم، مفسر جو تفسیر کشاف کے مولف ہیں۔آپ کی ولادت بروز بدھ ۲۷ رجب المرجب ۴۶۷ھ مطابق ۱۸ مارچ ۱۰۷۵ء کو زمخشر میں ہوئی۔ جار اللہ زمخشری (۴۶۷-۵۳۸ھ) ایک معتزلی عالم تھے۔آپ اپنے وقت کے امام بلا مدافع، علامہ، نحوی، لغوی، فقیہ جید، محدث متقن، مفسر کامل، فاضل مناظر، ادیب، متکلم، بیانی، شاعر، ذکی، تیز طبع، حنفی الفروع، معتزلی الاصول تھے۔آپ نے تفسیر، حدیث لغت وغیرہ میں تصانیف لکھیں۔ جن میں مشہور تفسیر کشاف، فائق اللغہ فی تفسیر الحدیث، اساس البلاعہ فی اللغہ، ربیع الابرار، متشابہ اسامی الرواۃ ہیں۔

۶۔ الزمخشری، الکشاف، ۸/۳

حکم سے تو ارات کا فہم اور دین کی سمجھ بوجھ مراد ہے۔

مراد لیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حکم جو حکمت کے مصدری معنی میں ہے اس کا ایک معنی دین کی سمجھ بوجھ اور فہم اور فیصلہ کی قوت اور صلاحیت مراد ہے۔

مفتی عبدہ کے شاگرد رشید رضا[1] (۱۸۶۵ء-۱۹۳۵ء) میں اس آیت کریمہ کی تفسیر لکھتے ہیں:

"وهی العلم المقترن بأسرار الأحكام ومنافعها، الباعث على العمل بها"[2]

ایسا علم جس کے ذریعے شریعت کے احکام اور ان کی منفعت حاصل ہو اور پھر ان احکامات پر عمل کرنے کے طریقے بھی بتائے جائیں۔

اس آیت کریمہ میں کلمہ حکمت کا معنی امام مراغی[3] (۱۸۸۱ء-۱۹۴۵ء) اس طرح لکھتے ہیں:

"أسرار الأحكام الدينية ومعرفة مقاصد الشريعة"[4]

دین کے احکام کی غرض، علل اور حکمتیں اور شریعت اسلامیہ کے مقاصد کا علم مراد ہے۔

وھبہ الزحیلی (۱۹۳۲ء-۲۰۱۵ء) نے بھی اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت اسی طرح لکھا ہے۔[5]

مفسرین کرام نے کتاب اور نبوت کے ساتھ تیسری چیز حکمت کی صفت کو یکجا ذکر کرنے اور عطا کرنے کی تفصیل میں لکھا ہے کہ انسانی زندگی میں وہ زندگی جو شریعت اسلامیہ جس کا تقاضا کرتی ہے اس کے لیے تین چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی کتاب عطا کی جائے جو تمام معاملات زندگی کے لیے کافی ہو اور پھر ان قوانین کے نفاذ کے طریقے بھی بتائے گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے بتائے گئے قوانین ہی کے صرف پابندی ضروری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے کے قوانین اور ضابطے بھی بتائے گئے ہوں جس میں وعد اور وعید ہو، جس میں اخلاقیات کی تفصیل ہو اور حقوق وفرائض بھی متعین ہوں، دوسری چیز جو ضروری ہے جو کتاب عطا

۱۔ سید محمد رشید رضا کی پیدائش: ۲۳ ستمبر ۱۸۶۵ء لبنان کے محافظہ شمالی کے شہر قلمون نامی ایک قصبہ میں ہوئی۔ طرابلس میں ہی تعلیم بھی حاصل کی۔ آپ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور عربی ادب کے انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی کے اکابرین میں سے تھے۔ اُن کی وجہ شہرت تفسیر المنار ہے۔ آپ کی تصانیف میں چند ایک یہ ہیں: مجلۃ (المنار) ۳۴ جلدوں پر مشتمل ہیں، تفسیر القرآن الکریم-۱۲ جلدوں میں مکمل نہ ہوئی۔ تاریخ الأستاذ الإمام الشیخ محمد عبدہ، نداء للجنس اللطیف، الوحي المحمدي، یسر الإسلام وأصول التشریع العام- آپ کی وفات: ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء کو قاہرہ میں ہوئی۔ (الأعلام، خیر الدین الزرکلی، ۲/۱۴۴، دار العلم للملایین بیروت)

۲۔ المراغی، احمد بن مصطفیٰ، تفسیر المراغی، مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۳۶۵ھ، ۱۹/۲

۳۔ احمد بن مصطفیٰ المراغی شیخ اظہر محمد بن مصطفی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ محمد بن مصطفی المراغی ۹ مارچ ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰ اگست ۱۹۹۱ء کو وفات پاگئے، جب کہ احمد بن مصطفیٰ المراغی ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو پیدا ہوئے اور ۱۹۱۰ء کو وفات پاگئے۔ احمد بن مصطفیٰ المراغی نے "تفسیر المراغی" کے نام سے پوری قرآن کی تفسیر کی جب کہ محمد بن مصطفیٰ المراغی نے "الدروس الدینیہ" کے نام سے بعض سورتوں کی بعض آتوں کی تفسیر کی۔ چونکہ دونوں بھائیوں کا زمانہ ایک ہے اس لیے اکثر لوگوں کو ان کی حالات زندگی میں اشتباہ پیدا ہو گیا۔ بہت سارے محققین اپنے تحقیقی مضامین میں احمد بن مصطفی کی جگہ محمد بن مصطفی کی حالات زندگی پر بحث کی ہے۔ تفسیر المراغی احمد بن مصطفی المراغی کی ہے۔

۴۔ المراغی، احمد مصطفیٰ، تفسیر المنار، ۲۱۲/۱

۵۔ الزحیلی، وھبہ، التفسیر المنیر، ۳۴/۲

کی گئی اس کے عملی نمونہ انسانی شکل میں ہو تاکہ انسان بطور رول ماڈل کے اس کو اپنا سکیں اور یہ انسان کتاب میں مبہم چیزوں کی بھی وضاحت کرنے والا ہو۔ تیسری چیز جو ضروری ہے وہ ایسی شخصیت کا ہونا ہے جو اس کتاب کو مکمل جذبے کے ساتھ عام کرے اور اس کو فہم کو آسان بنانے کی کوشش کرے اور اس کے قوانین کو ہمہ جہت بنانے کے لیے لائحہ عمل مرتب کرے۔ یہ تین چیزوں کے مجموعے کا نام کتاب، (الحُکْمَ) بمعنی حکمت اور نبوت ہے۔ قرآن کریم نے یہاں حکمت کو کتاب اور نبوت کے درمیان میں لاکر اس سے اسی درجے کا علم، فہم اور عقل مراد لی ہے۔[1]

۵۔ حکمت بمعنی نبوت

حکمت کا ایک معنی نبوت بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے داوٗد علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ﴾[2]

عطا فرمائی داوٗد کو اللہ نے حکومت اور دانائی

ابن جریر، واحدی نے الوجیز میں، امام بغوی نے معالم التنزیل، امام قرطبیؒ نے الجامع لاحکام القرآن میں اور امام ابن کثیر نے، علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں محاسن التاویل میں علامہ قاسمی نے نے اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ میں حکمت کا معنی (الحكمة هي النبوة) نبوت لکھا ہے۔[3]

حضرت ابراھیم علیہ السلام کے آل میں نبوت کو برقرار رکھا گیا۔ اسی وجہ سے ارشاد ہوتا ہے:

﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا﴾[4]

کیا یہ (یہود) لوگوں (سے ان نعمتوں) پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں، سو واقعی ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ہم نے انہیں بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں امت کا خطاب دیا، ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً ﴾[5] (بیشک ابراہیم (علیہ السلام تنہا ذات میں) ایک امت تھے) کوئی یہودی یا عیسائی ان کو اپنی طرف یا اپنی ملت یا اپنی امت کی طرف منسوب نہ کرے بلکہ وہ خود اپنی ذات میں ایک امت کے درجہ پر فائز تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کے اس وہم وگمان کو دور کر دیا جو وہ کہہ گمان کر رہے تھے کہ ہم سب سے اعلیٰ اور سب سے افضل امت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو نعمت اور رحمت سے دور کیا اور پھر اس آیت کریمہ آل ابراہیم کو

۱۔ صدیقی، اسلم، روح القرآن، ۲/۲۸۷

۲۔ النسآء ۴/۵۴

۳۔ دیکھیے: جامع البیان، ۵/۳۰۷، الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، ۱/۱۸۱، معالم التنزیل، ۱/۳۴۰، قرطبیؒ، ۴/۹۲، ابن کثیر، ۱/۳۹۱، محاسن التاویل ۲/۱۸۳،

۴۔ النسآء: ۴/۵۴

۵۔ النحل: ۱۶/۱۲۰

حکمت کی دولت سے سرفراز فرمایا، اس سے مراد آل اسماعیل علیہ السلام ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت، کتاب اور ملک عظیم کی صفت سے مزین فرمایا، علامہ سمعانی اور ابن جوزی نے اس آیت میں حکمت سے مراد آل ابراہیم علیہ السلام میں نبوت کا عطا کیا جانا مراد ہے۔[1]

سورۃ ص میں ارشاد خداوندی ہے

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾[2]

اور ہم نے مستحکم کردیا ان کی حکومت کو اور ہم نے بخشی انہیں دانائی اور فیصلہ کن بات کرنے کا ملکہ

امام ماوردی (۹۷۲ء-۱۰۵۸ء) اور امام واحدی (م ۱۰۷۶ء) نے اس آیت کی تفسیر میں (الحکمۃ) کا حکمت کا معنی نبوت کیا ہے[3]۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم حضرت داؤد علیہ السلام کو امتیازی خصائص سے نوازا اور اس کا ذکر قرآن کریم میں ان الفاظ سے فرمایا:

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾[4]

اور ہم نے ان کے ملک و سلطنت کو مضبوط کردیا تھا اور ہم نے انہیں حکمت و دانائی اور فیصلہ کن انداز خطاب عطا کیا تھا۔

اس آیت کریمہ میں حکمت کا پانچ معانی بیان کیے گئے ہیں جن میں

۱۔ نبوت
۲۔ سنت اور طریقہ
۳۔ عقل و فہم میں کمال
۴۔ اصابت رائے (صحیح اور درست رائے)
۵۔ زبور[5]

امام آلوسی[6] (۱۸۰۳ء-۱۸۵۴ء) حکمت کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

۱۔ السمعانی، تفسیر القرآن، ۴۳۷/۱، زاد المسیر فی علم التفسیر، ۴۲۱/۱، لباب التاویل فی معانی التنزیل، ۳۹۰/۱

۲۔ ص: ۲۰/۳۸

۳۔ تفسیر البسیط، ۲۳۲/۱۳، النکت والعیون، ۲۲۰/۳

۴۔ ص: ۲۰/۳۸

۵۔ دیکھیے: النکت والعیون، ۷۴/۵

۶۔ ابو الثناء شہاب الدین سید محمود بن عبد اللہ بن محمود الحسینی آلوسی بغدادی (۱۰ دسمبر ۱۸۰۲ء-۱۸۵۴ء) ایک معروف مسلمان عالم دین تھے۔ ''آلوس'' ایک گاؤں تھا، جو بغداد اور ملک شام کے درمیان کے راستے میں ایک مقام پر واقع تھا، جس میں آپ کی پیدائش اس گاؤں کی وجہ شہرت بنی۔ آپ اپنی تصنیف تفسیر روح المعانی کے باعث مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ الاجوبہ العراقیہ، الفوائد السنیہ فی آداب البحث، النفحات القدسیہ فی المباحث الامامیہ، حاشیہ الفطر: (یہ نامکمل تصنیف تھی، جسے آپ کی وفات کے بعد آپ کے بیٹے سید نعمان آلوسی نے مکمل کیا۔)، درۃ الغواص فی ادھام الخواص، دقائق التفسیر، شرح المسلم فی منطق مشہور ہیں۔ آپ نے ۲۵ ذوالقعدہ ۱۲۷۰ کو ۵۷ برس کی عمر میں وفات پائی اور بغداد کے تاریخی محلہ ''کرخ'' کے مقامی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ (اعلام، خیر الدین زرکلی الدمشقی، ۱۹۵/۴)

"كمال العلم وإتقان العمل، وقيل الزبور وعلم الشرائع، وقيل كل كلام وافق الحكمة فهو حكمة"[1]
یہاں حکمت سے مراد حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت کی نعمت سے سرفراز کرنا اور یقین کامل اور پختہ علم مراد ہے، ایک قول میں حکمت سے زبور اور شریعت کے اور علوم مراد ہیں یا ہر وہ کلام جو حکمت کے موافق ہو وہی مراد ہے۔

اس کریمہ میں تین نعمتوں کا ذکر ہے یعنی ملک عظیم، حکمت اور فیصلہ کن خطاب، حکمت سے مراد ہر وہ بات جو سینے تک اتر جانے والی ہو اور پورے دلائل کے ساتھ سامعین تک پہنچانے کی قدرت حاصل ہو، مشکل سے مشکل امور ان کے لیے آسان کر دیئے گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جو عقل و فہم بخشا اس کی درست استعمال کا بھی طریقہ کار عطا فرمایا اسی وجہ سے آپ علیہ السلام اعلیٰ درجے کے قادر الکلام بھی تھے۔ امام قرطبیؒ مالکی (۱۲۱۴ء-۱۲۷۳ء) نے تمام معانی میں تطبیق دی ہے اور لکھا ہے کہ کسی معنی میں تضاد اور تقابل نہیں ہے، اس لیے کہ نبوت کی نعمت عدل، عقل و فہم اور سنت اور فیصلہ کن رائے اور فیصلہ کن خطاب کو مستلزم ہے۔[2]

جب کہ علامہ اندلسی (۱۲۵۶ء-۱۳۴۴ء) لکھتے ہیں کہ اس مقام پر حکمت کا لفظ ایسی قوت اور ایسی صلاحیت پر بولا جاتا ہے جس نے ایک انسان حق کے مطابق معاملات کا فیصلے کرتا ہے، اس آیت میں ﴿فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ حکمت ہی کی وضاحت ہے۔[3]

علامہ دامغانی کے بیان کردہ حکمت کے پانچ معانی کی تفصیل کے بعد بطور خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے کہ امام آلوسی حکمت کے پانچ معانی ذکر فرمائے ہیں:

۱۔ حقائق الكتاب ودقائقه، حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم کے حقائق اور اس کے پوشیدہ معانی و مفاہیم اور اس کے باریکیاں جاننے کا نام حکمت ہے۔

۲۔ طريق السنة، یعنی نبی کریم ﷺ کی سنت کو سمجھنا اور لوگوں کو آپ ﷺ کی سنت کی تعلیم دینا حکمت کہلاتا ہے۔

۳۔ الفقه في الدين: یعنی دین کی باریکیوں کو سمجھنا حکمت کہلاتا ہے، یعنی علم کے ساتھ ساتھ عقل و فہم بھی نہایت ضروری ہے، جس طرح طاقت ور آدمی کو پتہ ہوتا ہے کہ طاقت کا استعمال کب اور کیسے کرنا ہے اسی طرح عالم کو بھی پتہ ہونا چاہیے کہ علم کا استعمال مختلف اوقات میں کب اور کہاں کہاں استعمال کرنا ہے، یعنی وہ علم کو اپنی عقل و فہم کے مطابق استعمال کرنا بھی جانتا ہو۔ یعنی دین کو کس طرح اور کیسے استعمال کریں اور لوگوں کو کس طرح سمجھائیں یہ فقہ فی الدین ہے۔

۴۔ ما تكمل به النفوس، یعنی نفوس کو اس طرح پاک وصاف کرنا اور ایسا تزکیہ کرنا جس سے نفس اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو جائے، ایسا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس سے نفس کی غلاظتیں اور

۱۔ الآلوسی، روح المعانی، ۱۲/۱۷۰

۲۔ القرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۵/۱۹۰

۳۔ اندلسی، البحر المحیط، ۴/۸۸

کدورتیں ختم ہو جائیں اور نفس مزکی ہو جائے تو اس طریقہ کار یا اس عمل کا نام بھی حکمت ہے۔

۵۔ وضع الأشياء في محلها[1]: ہر کام اور ہر چیز کو اس کے اپنے محل و مقام پر رکھنا حکمت کہلاتا ہے، جس کام یا جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے بنایا ہے اس کو اسی مقصد کے تحت استعمال کرنا حکمت کہلاتا ہے

خلاصۂ بحث

قرآن کریم میں (الحكمة) کی اصطلاح انیس مقام پر ذکر ہوئی ہے، جن میں سوائے دو مقامات کے ہر جگہ یہ اصطلاح الف لام کے ساتھ بطور معرفہ استعمال ہوئی ہے، سات مقامات پر یہ اصطلاح بغیر کسی قید کے مفرد استعمال ہوئی ہے جب کہ دس مقامات پر (الحكمة) کی اصطلاح کتاب (الكتاب والحكمة) کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔ایک مقام پر آیات (آيَاتِ اللهِ وَالْحِكْمَةِ) کے ساتھ اور ایک مقام پر الملک (مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ) کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔

اصطلاح قرآنی الحكمة) کے مختلف معانی مفسرین کرام نے متعین فرمائے ہیں، ہر ایک معنی اور مفہوم اپنے سیاق و سباق کے مطابق متعین کیا گیا ہے۔ (الحكمة) سے مراد نبوت، (الحكمة) سے مراد مختلف انبیاء کرام کی سنت اور ان کے بتائے اور سکھائے گئے احکامات اور خصوصا نبی کریم ﷺ کی سنت مطہرہ اور آپ ﷺ کے بتائے اور سکھائے گئے احکامات، چاہے ان کا تعلق دین سے ہو یا دنیوی اِمور سے ہو۔اس کے علاوہ (الحكمة) سے مراد قرآن کریم، اس کے وعد و وعید اور قصص بھی مراد ہیں۔اسی طرح(الحكمة) کا ایک معنی علم و تدبر، فہم اور عقل کامل ہے اور (الحكمة) کا ایک معنی اشیاء اور اِمور کی حقیقتوں کو جیسا کی وہ ہیں ان کو سمجھنااور واقع کے مطابق اشیاء اور اِمور کو ترتیب دینا مراد ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ واضح ہوا کہ مفسرین کے نزدیک قرآن کریم میں نو مقامات پر (الحكمة) سے مراد سنت ہے۔[2] چار مقامات پر (الحكمة) کا معنی نبوت سے کیا گیا ہے[3]۔ دو مقام پر (الحكمة) سے مراد قرآن کریم ہے۔[4]۔ تین مقامات پر (الحكمة) سے مراد عقل و فہم اور تدبر و تعقل ہے[5] جب کہ ایک مقام پر کا معنی ایسا کلام محکم جو واضح اور ظاہر ہو اور جس میں کسی قسم کا تذبذب اور اشتباہ نہ ہو۔[6]

۱۔ الآلوسی، محمود بن عبداللہ، روح المعانی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی (قاھرہ: مکتبہ الخانجی، ۱۹۹۷ء)، ۲۳۳/۴

۲۔ البقرہ: (۲۳۱،۱۵۱،۱۲۹)، آل عمران (۱۶۴،۸۱،۴۸)، النسآء (۱۱۳)، الاحزاب (۳۴)، الجمعہ (۲)

۳۔ البقرہ: (۲۵۱)، النسآء (۵۴)، صٓ (۲۰)، الزخرف (۶۳)

۴۔ النحل: (۱۲۵)، القمر (۵)

۵۔ البقرہ: (۲۶۹)، المائدہ (۱۱۰)، لقمان (۱۲)

۶۔ الاسراء: (۳۹)

فصل سوم

حکمت کے تصورات اور تفسیری اطلاقات

مبحث اول

مفسرین کے نزدیک حکمت کا تصور اور تفسیری اطلاقات

قرآن کریم میں مذکور اصطلاحات میں کچھ تو ایسی ہیں کہ جن کے معانی اور مفاہیم میں قرونِ اولیٰ سے ہی تمام عرب و عجم اور قدیم اور جدید آراء میں اتفاق پایا جاتا ہے مگر کچھ اصطلاحات ایسی بھی ہیں کہ قرآن کریم کے الفاظ کی شرح، معانی اور تفسیر کرنے والے افراد خصوصاً مفسرین کرام کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی صورت حال قرآن کریم کی اصطلاح حکمت کی بھی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے اقوال سے ماخوذ تفسیر کی اتباع کرتے ہوئے چوتھی صدی ہجری تک تمام مفسرین نے حکمت کے وہی معانی بیان کیے ہیں جو مختلف صحابہ کرام کے اقوال سے مروی نقل ہوئے ہیں۔ تاہم تفسیری رجحانات میں جب تفسیر بالرائے المحمود کا سلسلہ شروع ہوا تو قرآن کریم کے بہت سارے الفاظ کے معانی میں اختلاف کے سلسلے کا آغاز ہو گیا۔

انسانی دور میں پیدا ہونے والی مشکلات، مسائل، ترقی کے مختلف مدارج کے اعتبار سے ہر انسان کی عقل مختلف رہی ہے۔ جو انسان جس دور میں پیدا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی عقل اسی دور کی مشکلات اور مسائل کے حل اور ترقی کے نئے سلسلوں کو قبول کرنے کے لیے اور اس سے ہم آہنگ بنا دی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ہر نئی نسل کے ذہنوں میں جو سوالات پیدا ہوئے اور ان کے جوابات کے لیے تجسس بھی اسی طرح بڑھتا گیا ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ اس سے سابقہ دور میں ایسے سوالات نہ تو عقل میں آئے اور اگر سوالات پیدا ہوئے بھی تو ان کے جوابات تو دیئے گئے مگر ان جوابات میں نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ یا صحابہ کرام کے اقوال ہی پیش نظر رہے اور اس دور میں انہی جوابات پر اکتفا کر لیا گیا۔ بعد کے ادوار میں مختلف قرآنی الفاظ کے مفاہیم میں تجسس میں اضافہ ہونے کی وجہ سے الفاظ کے معانی اور مفاہیم میں وسعت پیدا ہوئی۔ اسی وجہ سے حکمت کے مفہوم کے تجسس میں اضافہ ہوا اور اس کے معانی اور مفاہیم میں جدید مفسرین کرام نے ایک نئے انداز سے اس کا مفہوم واضح کیا ہے۔ اسی لیے اس مبحث میں قدیم مفسرین جن کی تفاسیر بالماثور کے عظیم وصف اور درجہ پر فائز ہیں اور جدید تفسیری آراء جو کہ تفاسیر بالرائے المحمود کے نام سے مشہور ہیں ان کو یکجا کر کے بیان کیا جائے گا تاکہ قدیم اور جدید رجحانات واضح ہو سکیں۔

امام طبری (۸۳۹ء-۹۲۳ء) حضرت مجاہد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"أن الحكمة هي الإصابة في القول والفعل"[1]

اُمور اور اقوال میں بہترین رائے، بہترین خوبی، درست اور سچی بات کا نام حکمت ہے۔

۱۔ الالطبری، جامع البیان، ۵/۵۷۷، ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ۲/۵۳۳

ابن عباس اور سدی کی رائے کے مطابق

"أن الحكمة هي النبوة"[1]

حکمت سے مراد وصف نبوت ہے

عبدالرحمٰن بن زید کے قول کے مطابق

"أن الحكمة هي العقل في الدين"[2]

دین میں عقل مندی کے اُمور سرانجام دینے کا نام حکمت ہے

ابراھیم نخعی کے قول کے مطابق

"أن الحكمة هي الفهم"[3]

اشیاء کے ادراک، سمجھ بوجھ اور دریافت کا نام حکمت ہے

امام طبری لکھتے ہیں کہ وھب حضرت مالک کا قول روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"أن الحكمة هي المعرفة بالدين والفقه فيه والاتباع له"[4]

دین کی صحیح پہچان اور دین میں صحیح سمجھ بوجھ اور دین کے احکامات کی اتباع کرنے کا نام حکمت ہے۔

امام طبری کی اپنی رائے

"قال أبو جعفر[5]: والصواب من القول عندنا في"الحكمة"، أنها العلم بأحكام الله التي لا يدرك علمها إلا ببيان الرسول صلى الله عليه وسلم، والمعرفة بها"[6]

یہ احکام الٰہی کا علم ہے جس کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کے علاوہ اور ان کا علم اور ان کے مشابہت سے ظاہر ہونے کے سوا حاصل نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک یہ "الحکم" سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے صحیح اور غلط کے درمیان جدائی۔

یعنی آپ کے نزدیک حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور ان احکام کی معرفت کا علم ہے جو نبی کریم ﷺ کے کے اقوال واُفعال وتقریرات کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

---

۱ ۔ الطبری، جامع البیان، ۵/۵۷۷، ابن ابی حاتم، سمرقندی، ۱/۱۸۹

۲ ۔ الطبری، جامع البیان، ۵/۵۷۷

۳ ۔ الطبری، جامع البیان، ۵/۵۷۷، ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ۲/۵۳۳

۴ ۔ الطبری، جامع البیان، ۵/۵۷۸

۵ ۔ تفسیر الطبری میں مختلف مقامات پر امام الطبری (قال ابو جعفر) لکھتے ہیں جس سے آپ خود مراد ہوتے ہیں اور اس کے بعد آپ وہ قول درج کرتے ہیں جو آپ کے نزدیک راجح ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام ابن حزم اپنی کتب میں (قال ابو محمد یا قال علی) لکھ کر خود اپنی ذات مراد لیتے ہیں اور اسی طرح شعب الایمان میں امام بیہقی (قال احمد) لکھ کر اپنا قول درج کرتے ہیں

۶ ۔ الطبری، جامع البیان، ۳/۸۷

حکمت کے سابقہ تمام معانی پر حکمت کا اطلاق ہوتا ہے اس لیے کی قرآن کریم کی اصطلاح (الحکمة) (الحِکم) سے ماخوذ ہے جس کا معنی فیصلہ اور قول فیصل کے ہیں، حکمت اصابت رائے، قول صواب کا نام ہے۔آپ حکمت کے تمام معانی کو قول صواب اور فعل صواب یعنی ایک معنی کے اندر جمع کرنے کی وجہ بھی لکھتے ہیں:

"لأن الإصابة في الأمور إنما تكون عن فهم بها وعلم ومعرفة.وإذا كان ذلك كذلك، كان المصيب عن فهم منه بمواضع الصواب في أموره مفهمًا خاشيًا لله فقيهًا عالمًا، وكانت النبوة من أقسامه، «والنبوة» بعض معاني الحكمة"[1]

اس لیے کہ امور میں صاف گوئی اور سچی اور صحیح بات علم اور معرفت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اگر ایک آدمی اپنے قول و فعل میں راست بازی اور صاف اور سچا ہے تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت ہو گی اور وہ دانائی اور سمجھ بوجھ رکھنے والا عالم ہو گا۔اور نبوت حکمت کے اقسام میں سے ایک ہے۔

ابن ابی حاتم (۸۵۴ء-۹۳۸ء) اپنی تفسیر میں حضرت امام مالک سے روایت کرتے ہوئے حکمت کی تعریف اس طرح لکھتے ہیں:

"أن الحكمة هو الفقه في دين الله؛ وأمر يدخله الله في القلوب من رحمته وفضله، ومما يبين ذلك أنك تجد الرجل عاقلًا في أمر الدنيا، إذا نظر فيها، وتجد آخر ضعيفًا في أمر دنياه، عالمًا بأمر دينه، بصيرًا به، يؤتيه الله إياه، ويحرمه هذا، فالحكمة: الفقه في دين الله"[2]

دین اور اس کے احکامات میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کا نام حکمت ہے، یہ ایسا حکم اور (نور) ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رحمت اور فضل سے دلوں میں داخل کرتا ہے۔کسی آدمی کو تم دیکھو گے کہ ایک شخص دنیاوی معاملات میں غور و فکر کرے تو وہ ان معاملات میں عقل مند ہو جاتا ہے اور دوسرا دنیا کے معاملات میں انتہائی جاہل اور کمزور ہو گا لیکن یہ آدمی دین کے معاملے میں بصیرت رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو حکمت عطا فرماتا ہے اور اور دوسرے کو اس حکمت سے محروم رکھتا ہے۔اور حکمت دین میں سمجھ بوجھ کا نام ہے۔

امام ماتریدی (۸۵۳ء-۹۴۴ء) اپنی تفسیر میں ابن عباسؓ اور قتادہؒ سے مروی حکمت کا مفہوم یوں درج کرتے ہیں:

"أن الحكمة هي علم القرآن، ناسخه ومنسوخه، ومحكمه ومتشابهه، ومقدمه ومؤخره، وحلاله وحرامه وأمثاله"[3]

قرآن کریم کے علم، ناسخ اور منسوخ، محکم اور متشابہ، قرآن کریم کے تقدیم اور تاخر، اور اس کے حلال اور حرام اور اس میں دیئے گئے اِمثال کے علم کو جاننے کا نام حکمت ہے۔

امام ماوردی (۹۷۲ء-۱۰۵۸ء) اپنی تفسیر میں ربیع بن خیثم کا قول لکھتے ہیں:

"أن الحكمة هي الخشية"[4]

حکمت سراسر خشیت باری تعالیٰ کا نام ہے۔

۱۔ الطبری، جامع البیان، ۵۸۹/۱

۲۔ ابن ابی حاتم، تفسیر ابن ابی حاتم، ۵۳۲/۲

۳۔ الماتریدی، تاویلات اھل السنہ، ۲۵۲/۱

۴۔ الماوردی، النکت والعیون، ۳۴۰/۱

تفسیر بالماثور کے بعد جب تفسیری ادب میں تفسیر بالرائے کے رجحان کا آغاز ہوا تو قرآن کریم کے ایک لفظ کے مختلف تفسیریں اور تاویلیں کی گئیں اور ایک لفظ اور ایک اصطلاح کے ایک سے زائد معانی اور مفہوم بیان کیے گئے، اسی طرح اس لفظ کا ماقبل مفسرین کی آراء کے نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی عقل وفہم کے مطابق اور بھی معانی متعین کر لیے گئے۔ اس طرح قرآن کریم کے الفاظ کے معانی اور مفاہیم میں مختلف تصورات سامنے آنے لگے۔ ابن عطیہ اندلسی (۱۰۴۸ء-۱۱۴۶ء) نے حکمت کے مفہوم میں سابقہ تمام اقوال کو جمع فرما کر لکھا ہے:

"وهذه الأقوال كلها ما عدا قول السدي قريب بعضها من بعض لأن الحكمة مصدر من الإحكام وهو الإتقان في عمل أو قول. وكتاب الله حكمة، وسنة نبيه حكمة. وكل ما ذكر فهو جزء من الحكمة التي هي الجنس"[۱]

یہ تمام اقوال سوائے سدی کے قول کے (جس میں حکمت سے نبوت مراد ہے) تمام معنی اور مفہوم میں قریب قریب ہیں اس لیے کہ اصل میں حکمت احکام سے ہے جس کا معنی عمل اور قول میں انتہائی احتیاط اور یقین راسخ ہے۔ حکمت سے اللہ تعالیٰ کی کتاب بھی مراد ہے اور نبی کریم ﷺ کی سنت بھی۔ حکمت کے مفہوم میں بیان کردہ ہر ایک صفت حکمت کے ہی اجزا ہیں۔

آپ کے نزدیک حکمت بمنزلہ جنس کے ہے۔ اور مذکور سابقہ تمام صفات اسی جنس کے تحت داخل ہیں۔ اسی طرح علامہ زمخشری (۱۰۷۵ء-۱۱۴۳ء) حکمت کا ایک معنی "شریعت اور اس کے احکام کی وضاحت" لکھا ہے۔ آپ مزید لکھتے ہیں:

"يوفق للعلم والعمل به. والحكيم عند الله: هو العالم العامل"[۲]

علم اور عمل میں موافقت پیدا کر لینے کا نام حکمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حکیم ایسا عالم ہے جو اپنے علم کے مطابق عمل کرنے والا ہو۔

ابو بکر ابن العربی المالکی (۱۰۷۶ء-۱۱۴۶ء) لکھتے ہیں:

"الْعَمَلُ بِالْعِلْمِ،الْعَمَلُ بِمُقْتَضَى الْعِلْمِ"[۳]

علم اور اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا حکمت کہلاتا ہے۔

علامہ طبرسی (۱۰۷۳ء-۱۱۵۴ء) حکمت کے مفہوم کو اس طرح لکھتے ہیں:

"هي العلم الذي يمنع صاحبه من الجهل"[۴]

جو علم اپنے صاحب کو جہل سے دور کر دے ایسے علم کو حکمت کہا جاتا ہے۔

یعنی آپ کے نزدیک بھی جہالت، حماقت وغیرہ سے دوری کا نام حکمت ہے۔ امام ابن کثیر (۱۳۰۱ء-۱۳۷۳ء) نے حکمت کے مفہوم میں مختلف اقوال نقل کیے ہیں جن میں علوم القرآن یعنی ناسخ ومنسوخ، حلال وحرام وغیرہ کا علم، قرآن کریم کے مکمل فہم کی صلاحیت، قول میں درست، سچی اور تحقیقی بات کرنا، اس کے علاوہ جو اصل مطلب کو

۱۔ الاندلسی، عبدالحق بن غالب بن عطیہ، المحرر الوجیز (مکہ مکرمہ، مکتبہ تجاریہ، ۱۴۲۲ھ، ۱/۳۶۴

۲۔ الزمخشری، محمود بن عمرو، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، (بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ)، ۱/۳۱۶

۳۔ ابن العربی، محمد بن عبداللہ، احکام القرآن، (بیروت، دار الکتاب العلمیہ، ۱۴۲۴ھ)، ۳/۲۰۳

۴۔ الطبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن (عراق، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات، ۱۹۶۶ء) ۱/۱۵۵

پالے اور بات کی تہہ تک پہنچ جائے اور زبان سے اس کے صحیح مطلب ادا ہوں، علم کے ساتھ ساتھ صحیح سمجھ بھی اس کو عطا کی گئی ہو اور اللہ کا ڈر اس کے دل میں ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کا خوف حکمت ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے:

"رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللَّهِ"[1]

حکمت کی بنیاد اور اساس اللہ کا ڈر ہے

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فسلَّطه عَلَى هَلَكته فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ حِكْمَةً فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا"[2]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ قابل رشک صرف دو شخص ہیں جسے اللہ نے مال دیا اور اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق بھی دی اور جسے اللہ نے حکمت دی اور ساتھ ہی اس کے فیصلے کرنے اور اس کی تعلیم دینے کی توفیق بھی عطا فرمائی

آپ سارے اقوال درج کرنے کے بعد فیصلہ کن قول کے طور پر لکھتے ہیں:

"وَالصَّحِيحُ أَنَّ الْحِكْمَةَ كَمَا قَالَهُ الْجُمْهُورُ لَا تَخْتَصُّ بِالنُّبُوَّةِ، بَلْ هِيَ أَعَمُّ مِنْهَا، وَأَعْلَاهَا النُّبُوَّةُ، وَالرِّسَالَةُ أَخَصُّ، وَلَكِنْ لِأَتْبَاعِ الْأَنْبِيَاءِ حَظٌّ مِنَ الْخَيْرِ عَلَى سَبِيلِ التبَع"[3]

صحیح یہ ہے کہ حکمت کا لفظ ان تمام چیزوں پر مشتمل ہے اور نبوۃ بھی اس کا اعلیٰ اور بہترین حصہ ہے اور اس سے بالکل خاص چیز ہے جو انبیاء کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں، ان کے تابع فرمان لوگوں کو اللہ کی طرف سے محرومی نہیں، سچی اور اچھی سمجھ کی دولت یہ بھی مالا مال ہوتے ہیں۔

امام ابن کثیرؒ کے اس مؤقف سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی وصف حکمت صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص نہیں ہے اور اس سے مراد صرف سنت بھی نہیں ہے۔

یہاں تک تفسیر بالماثور میں حکمت کی تعریف مزید واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ حکمت کے تمام مفاہیم میں فرق اور تضاد نہیں ہے بلکہ حکمت کے مفہوم میں جتنے بھی اوصاف ذکر کیے گئے ہیں تمام حکمت کو شامل ہیں۔ حکمت کی حیثیت ایک کل کی ہے اور باقی اوصاف اس کے اجزاء ہیں۔ ان سب کے یکجا ہونے کا نام بھی حکمت ہے اور ان میں سے بعض صفات یا کچھ صفات کے موجود ہونے پر بھی حکمت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

حکمت کے مفہوم میں امام جوزی (۱۱۱۶ء-۱۲۰۱ء) لکھتے ہیں:

"الحكمة: السنة، قاله ابن عباس. وروي عنه: الحكمة: الفقه والحلال والحرام، ومواعظ القرآن. وسميت الحكمة حكمة، لأنها تمنع من الجهل"[4]

۱۔ البیہقی، ابو بکر احمد بن الحسین، شعب الایمان، باب فی الخوف من اللہ تعالی، (بیروت، داراحیاء الترث العربی، ۱۴۱۱ھ)، رقم الحدیث: ۷۴۲
امام بیہقی نے اس حدیث مبارکہ کو موقوفا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے

۲۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ، (صحیح بخاری) (بیروت، دارالطوق النجاۃ)، کتاب العلم، بَاب الِاغْتِبَاطِ فِی الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ وقَالَ عُمَرُ تَفَقَّهُوا قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوا، ۲۵/۱، رقم الحدیث ۷۳

۳۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، (بیروت، دار طیبہ للنشر والتوزیع، ۱۴۲۰ھ)، ۷۰۱/۱

۴۔ ابن الجوزی، عبدالرحمٰن بن علی، زاد المسیر (بیروت، مکتب اسلامی، ۱۹۶۶ء) ۱۱۳/۱

حکمت سے نبی کریم ﷺ کی سنت مراد ہے اور ابن عباس سے روایت ہے کہ حکمت سے مراد حلال اور حرام کی مکمل معرفت اور قرآن کریم سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا ملکہ ہے، اور حکمت کو حکمت اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ جہالت سے روکتی ہے۔

امام رازی (۱۱۵۰ء-۱۲۰۹ء) نے بھی علم اور عمل میں موافقت کو حکمت فرمایا ہے، آپ کے نزدیک حکمت جہل اور خطاء کو ختم کرتی ہے، آپ لکھتے ہیں:

"الإصابة في القول والعمل، ولا يسمى حكيما إلا من اجتمع له الأمران"[1]

قول اور عمل میں موافقت اور اصابت کا نام حکمت ہے۔ کوئی شخص تب تک اہل حکمت میں سے نہیں ہو سکتا جب تک یہ دونوں صفات اس کے اندر جمع نہ ہو جائیں۔

امام قرطبی (۱۲۱۴ء-۱۲۷۳ء) حکمت کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"الْحِكْمَة " الْمَعْرِفَة بِالدِّينِ , وَالْفِقْه فِي التَّأْوِيل , وَالْفَهْم الَّذِي هُوَ سَجِيَّة وَنُور مِنْ اللَّه تَعَالَى "[2]

حکمت سے مراد دین کی معرفت، اور تاویل میں فہم اور دانائی کا علم ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خصلت اور نور ہے

جلال الدین محلّی (۱۳۸۹ء-۱۴۶۰ء) اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" أَيْ الْعِلْم النَّافِع الْمُؤَدِّي إلَى الْعَمَل "[3]

حکمت سے مراد ایسا علم نافع جو عمل (نافع یا عمل صالح یا فیصلہ کن مرحلے) تک لے جائے۔

اس سے واضح ہوا کہ نویں صدی ہجری میں بھی حکمت کے تصورات میں یہ بات نمایاں تھی کہ حکمت سے ایسا علم نافع مراد ہے جس سے عمل نافع یا عمل صالح کا حصول ممکن ہو سکے۔ اس کے علاوہ ان اقوال کی روشنی میں دین کی سمجھ بوجھ، خشیتِ الٰہی اور قرآن کریم کی فقہ یعنی کامل سمجھ بوجھ حاصل کر لینے پر بھی حکمت کا اطلاق ہوتا ہے۔

تفسیر ارشاد العقل السلیم میں ابو سعود عمادی (۱۴۹۰ء-۱۵۷۴ء) لکھتے ہیں:

"ما يُكمل به نفوسَهم من أحكام الشريعة والمعارف الحقة"[4]

احکامات شریعت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ذریعے نفس انسانی کی تکمیل کا نام حکمت ہے۔

یعنی ایسا علم جس سے نفس کی پاکیزگی، عمدہ اخلاق اور احکامِ الٰہی کی حکمتیں سمجھ میں آجائیں۔ ایسا علم کا نام حکمت ہے۔

علامہ شوکانی (۱۷۵۹ء-۱۸۳۹ء) لکھتے ہیں:

"الْمُرَادُ بِالْحِكْمَةِ: الْمَعْرِفَةُ بِالدِّينِ، وَالْفِقْهُ فِي التَّأْوِيلِ، وَالْفَهْمُ لِلشَّرِيعَةِ "[5]

حکمت سے دین کی معرفت اور تاویل میں مہارت اور شریعت کا مکمل فہم مراد ہے۔

۱۔ الرازی، محمد بن عمر مفاتیح الغیب، (بیروت، دار احیاء الترث العربی، ۱۴۲۰ھ)، ۵۹/۴

۲۔ القرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد، الجامع لاحکام القرآن، (بیروت، دار احیاء الترث العربی، ۱۴۱۱ھ)، ۳۲/۳

۳۔ المحلی، جلال الدین محمد بن احمد، تفسیر جلالین (قاھرہ، دار الحدیث، ۱۴۱۱ھ)، ۲۷/۱۳

۴۔ ابو سعود، محمد بن مصطفیٰ العمادی، إرشاد العقل السلیم إلی مزایا الکتاب الکریم، (بیروت، دار احیاء الترث العربی، ۱۴۱۱ھ)، ۱۷۹/۱

۵۔ الشوکانی، محمد بن علی بن محمد، فتح القدیر، (بیروت، دار ابن کثیر، ۱۴۱۴ھ)، ۱۶۷/۱

علامہ شوکانی نے بھی حکمت کے مفہوم میں تمام سابقہ اقوال کو جمع فرما کر لکھا ہے کہ حکمت کے مفہوم میں مختلف مذکورہ اقوال میں ہر صفت، صلاحیت، قوت اور ملکہ حکمت کے اجزاء ہیں۔ یعنی حکمت اتنی وسیع المعنی اصطلاح ہے جس کے اندر ہر ایک صفت داخل ہو سکتی ہے۔

امام آلوسی (۱۸۰۳ء - ۱۸۵۴ء) نے حکمت کے مفہوم میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ یہ صفت حکمت نظریہ اور حکمت عملیہ دونوں کو شامل ہے اور اسی سے مل کر حکمت کی صفات مکمل ہوتی ہیں۔آپ کے نزدیک حکمت کے مفہوم میں بیس سے زیادہ اقوال ہیں جو سب درست ہیں اور سب ایک دوسرے کے قریب ہیں، ہر ایک پر حکمت کا مفہوم صحیح بیٹھتا ہے۔آپ ہر ایک قول کو صحیح کہتے ہوئے حکمت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"هو الإتقان في علم أو عمل أو قول أو فيها كلها"[1]

علم یا عمل یا قول میں یا ان سب میں مضبوط ہونے کا نام حکمت ہے۔

علامہ جوہری طنطاوی (۱۸۷۰ء-۱۹۴۰ء) لکھتے ہیں:

"الحكمة ما تكمل به عقولهم من المعارف والأحكام" [2]

اشیاء کی معرفت اور احکام کے اسرار و رموز کے ذریعے عقل کو کامل کر لینے کا نام حکمت ہے۔

یعنی آپ کے نزدیک حکمت عقل فاسد کو عقل کامل کر لینے کا نام ہے۔آپ نے حکمت سے عقل کی تکمیل مراد لی ہے۔

ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) حکمت کا معنی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"حکمت سے مراد وہی چیز ہے جسے عام اصطلاح میں سنت یا حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے"[3]

علامہ قطب شہید[4] (۱۹۰۶ء-۱۹۶۶ء) لکھتے ہیں:

---

۱ ۔ الآلوسی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، (بیروت، دار ابن کثیر، ۱۴۱۵ھ)، ۴۰/۲

۲ ۔ الجوہری، طنطاوی، الجواہر فی تفسیر القرآن، (مصر، مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۳۵۰ھ)، ۲۰۵/۱

۳ ۔ آزاد، محی الدین ابوالکلام، ترجمان القرآن (لاہور، مکتبہ قدوسیہ) ۱۱۳/۳

۴ ۔ سید قطب کی ولادت مصر کے ضلع اسیوط کے قریہ موشا کے ایک دیندار گھرانے میں ہوئی۔ سید قطب کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے سادہ اور محدود ماحول میں ہوئی،انہوں نے اپنی والدہ محترمہ کی دلی آرزو کے مطابق بچپن میں قران مجید حفظ کر لیا۔آپ نے مصر کی تحریک اخوان المسلمون کا تفصیلی مطالعہ کیا۔آپ ۱۹۴۵ء میں اخوان المسلمین میں شامل ہوئے۔ حسن البنا شہید کی شہادت اور اخوان کی مرکزي قیادت کی اسیری اخوان کے لیے ایک کٹھن دور تھا، تاہم صعوبتوں کا یہ سلسلہ فوجی حکومت کے قیام سے دوچند ہو گیا۔ ۱۹۵۲ء سے پہلے تک سید قطب شہید اخوان کے ایک عام کارکن تھے، تاہم ۱۹۵۲ء کے بعد آپ کو اخوان کی مجلس عاملہ کارکن چنا گیا اور دعوت و تبلیغ کا انچارج بنا دیا گیا۔ سید قطب شہید جریدۃ الاخوان المسلمین، کے رئیس التحریر بھی رہے۔ جمال عبد الناصر اور انگریز حکومت کے مابین ہونے والے ۱۹۵۴ء کے معاہدے کی مخالفت کے سبب اس جریدے کے ساتھ ساتھ اخوان المسلمین، پر پابندي عائد کر دي گئ۔اس تحریک کے اراکین کو گرفتار کر لیا گیا جن میں سید قطب بھی تھے۔ سید قطب جو کہ 'ترقی پسند'، 'روشن خیال'، اور قوم پرست تھے۔ فوجی عدالت نے ۲۲ اگست ۱۹۶۶ء کو سیّد قطب، محمد یوسف ہواش اور عبد الفتاح اسماعیل کے لیے سزائے موت کا حکم سنا دیا۔آپ کی تصانیف کی تعداد ۲۲ بتائی جاتی ہے۔ جن میں -فی ظلال القران ، ۲- العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام، ۳-مشاھدۃ القیامہ فی القران، ۴-التصویر الفنی فی القران، ۵-معرکۃ الاسلام والراسمالیہ، ۶-دراسات اسلامیہ شامل ہیں۔(آصف علی، سید قطب: حیات وخدمات، ص ۳۲)

"وهي توخي القصد والاعتدال ، وإدراك العلل والغايات ، ووضع الأمور في نصابها في تبصر وروية وإدراك"[1]

حکمت کا معنی کسی کام کے لیے پختہ اور مضبوط ارادہ کرنا اور راہ اعتدال اختیار کرنا، کسی امر یا فعل میں اس کی علت اور اس کی غرض و غایت کو پہچاننا۔ایسی بصیرت حاصل کرنا جو صحیح اور صالح امور تک ان کی حرکات و سکنات کی پہچان کرائے۔

آپ کے نزدیک میانہ روی اور اعتدال اختیار کرنے کا نام حکمت ہے۔اسی وجہ سے آپ کے نزدیک حکمت اسی کو حاصل ہوتی ہے جو شخص اعتدال کی راہ پر چلتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز بھی نہیں کرتا ہے اور نہ ہی انتہا پسندی کی جانب مائل ہوتا ہے۔گویا عصر حاضر کے مطابق آپ کے نزدیک انتہاپسندی سے بچنے کا حل یہ ہے کہ انصاف،اعتدال اور میانہ روی اختیار کی جائے۔آپ کے نزدیک قرآنی حکمت سے یہی مراد ہے۔آپ لکھتے ہیں:

"أوتي القصد والاعتدال فلا يفحش ولا يتعدى الحدود؛ وأوتي إدراك العلل والغايات فلا يضل في تقدير الأمور؛ وأوتي البصيرة المستنيرة التي تهديه للصالح الصائب من الحركات والأعمال وذلك خير كثير متنوع الألون"[2]

اسے میانہ روی دی گئی اور اعتدال نصیب ہوا،اس لیے وہ انتہاپسندی اور حد سے تجاوز سے محفوظ ہو گیا۔اسے تمام چیزوں کے اسباب و نتائج سمجھائے گئے۔اس لیے وہ ان اشیاء کی قدر و قیمت کے تعین میں غلطی نہیں کرتا ،اسے روشن بصیرت دی گئی ،اس لیے وہ حرکات و سکنات اور اعمال وافعال میں سے صالح اور صائب کا انتخاب کرتا ہے اور یہ ایک ایسی دولت ہے جو مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

یعنی جن کو حکمت عطا کر دی جاتی ہے وہ غفلت میں اور بھولنے والے نہیں ہوتے، کسی ایک چیز سے ایک بار وہ متنبہ ہو جائیں تو پھر ان کی دل کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور اس پر مزید یہ کہ وہ ہر واقعہ سے عبرت حاصل کرتے ہیں ،پھر ایسے لوگ جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے عبرت حاصل کرتے ہیں وہ گمراہی سے دور ہو جاتے ہیں۔آپ کے نزدیک حکمت انسان کی زندگی کا اصل الاصول ہے۔[3]

آپ کے نزدیک اگرچہ حکمت اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کی مشیت پر موقوف ہے امام رازیؒ کے بعد ابن عاشورؒ (۱۸۷۹ء-۱۹۷۳ء) نے بھی حکمت کو حکمت نظریہ اور حکمت عملیہ میں تقسیم کیا ہے اور ان دونوں اقسام کے اجتماع کو حکمت کہا ہے۔آپ کے نزدیک حکمت اور علم اس چیز سے حاصل ہوتی ہے جس کو اپنی طاقت اور قوت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا،حکمت تو کسبی ہوتی ہے اس لیے کہ قرآن کریم نے اس شخص کے بارے میں (الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ) کہا جس نے پل بھر میں تخت حاضر کر دیا،اشیاء میں عناصر کی قوت طبعی ہوتی ہے اور علم کا حصول ان قوتوں کو استعمال میں لانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اور ہر ایک قوت ہر ایک کام کے لیے استعمال نہیں کی جا

۱۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۱/۲۹۳

۲۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۱/۲۹۲

۳۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۱/۲۹۲

سکتی۔ اسی وجہ سے اس قصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں علم قوت پر غالب آگیا، اصل میں ان دونوں کی قوتوں کو ظاہر کرنا اور پھر قوت پر علم کا غالب آنا حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ اور کرامت بھی تھی۔[1]

شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ء-۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

"وَالْمُرَادُ بِإِيتَائِهِ الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ - إِعْطَاؤُهُ آلَتُهَا الْعَقْلُ كَامِلَةً مَعَ تَوْفِيقِهِ ...، وَسَهُلَ التَّمْيِيزُ بَيْنَ الْوَسْوَسَةِ وَالْإِلْهَامِ"[2]

حکمت عطا کرنے سے مراد، آلۂ حکمت یعنی عقل کا عطا ہونا ہے اور یہ کہ انسان کو علوم نافعہ کو حاصل کرنے میں اس آلہ کو صحیح استعمال کرنے کی توفیق دی گئی ہو پس عقل ایسا ترازو ہے جس میں خواطر ومدرکات کا وزن کیا جاتا ہے اور اسی سے تصورات اور تصدیق میں فرق کیا جاتا ہے، عقل کا رجحان حقائق کی جانب ہوتا ہے تو وہم اور شکوک وشبہات زائل اور بے وزن ہو جاتے ہیں، اس طرح وسوسہ اور الہام میں فرق کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

شیخ محمد عبدہ کی نزدیک ہر ایسا عمل اور فعل جس سے زندگی اور معاشرے کا نظام مضبوط اور مستحکم ہو اور جس سے فساد اور ضرر دور ہو حکمت کہلاتا ہے، چاہے اس نظام یا اس فساد یا ضرر کا تعلق عمومی ہو یا خصوصی، بہر حال عقلاً وہ فعل عبث اور بے کار و بے فائدہ نہ ہو تو وہ حکمت میں شمار ہو گا۔

رشید رضا (۱۸۶۵ء-۱۹۳۵ء) حکمت کا اطلاق سنت پر کرنے کی تردید کرتے ہیں اس لیے کہ حکمت کا معنی روکنا، لگام دینا، باز رکھنا کے ہیں اور اس طرح سنت پر اس کا اطلاق درست نہیں، آپ شریعت کے مقاصد اور ان احکامات کی اصلیت کا علم رکھنے کو حکمت کہتے ہیں:

"الحكمة فهي في كل شيء معرفة سره وفائدته، والمراد بها أسرار الأحكام الدينية والشرائع ومقاصدها"[3]

ہر شے کی معرفت اور اس کی حقیقت اور فوائد کو سمجھ لینا حکمت ہے، اسی طرح دینی احکام کے اسرار و رموز اور شریعت اسلامیہ کے احکامات کے مقاصد کو سمجھنے کا نام حکمت ہے۔

آپ مزید لکھتے ہیں:

"لِأَنَّ هَذَا الْفِقْهَ هُوَ أَجَلُّ الْحَقَائِقِ الْمُؤَثِّرَةِ فِي النَّفْسِ الْمَاحِيَةِ لِمَا يَعْرِضُ لَهَا مِنَ الْوَسَاوِسِ حَتَّى لَا تَكُونَ مَانِعَةً مِنَ الْعَمَلِ الصَّالِحِ"[4]

حکمت کی تفسیر فقہ فی القرآن کرنے سے مراد یہ ہے کہ جن امور سے ہدایت ملتی ہے ان کی معرفت حاصل کرنا حکمت ہے اور اسی طرح قرآن کریم کے احکام کی علتوں اور ان کے اغراض و مقاصد کو پہنچانا حکمت ہے۔

آپ کا حکمت کا معنی فقہ سے کرنا اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ نفس انسانی پر اثر انداز ہونے والے حقائق میں یہ سب سے اعلیٰ حکمت ہے اس لیے کہ حکمت نفس انسانی پر وارد ہونے والے جملہ شکوک و شبہات اور اوہام باطلہ کو مٹا

۱۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۱۹/۲۷۰

۲۔ عبدہ، شیخ محمد، رسالۃ التوحید، (بیروت: دار احیاء العلوم، ۱۹۹۰ء)، ص ۷۱، مزید حکمت کا مفہوم شیخ محمد عبدہ کے نزدیک ملاحظہ فرمائیں: تفسیر المنار، ۳/۶۳

۳۔ رشید رضا، محمد رشید بن علی رضا، تفسیر القرآن الحکیم (تفسیر المنار)، (مصر، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۹۰ء)، ۱/۳۸۹

۴۔ رشید رضا، محمد، تفسیر المنار، ۳/۶۵

دینے کے علاوہ ہر اس چیز کو بھی زائل کر دیتی ہے جو عمل صالح کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اس لیے حکمت کی تفسیر کی خصوصی طور پر وضاحت فرمائی گئی ہے۔

اس طرح رشید رضا کے نزدیک حکمت سے مراد ایسا علم صحیح ہے جو عمل صالح اور عمل نافع تک پہنچائے۔ ایسا عمل جو سعادت اور خوش بختی کا باعث بنے۔ آپ کے نزدیک انسانی دماغ میں ایک وقت میں بہت زیادہ شکلیں اور صورتیں جمع ہوتی ہیں جس کو انسان مختلف اوقات میں ظاہر کرنے کے لیے ذخیرہ کرتا رہتا ہے۔ ایسی تصاویر جن کو علم اور معلومات کا خزانہ کہا جاتا ہے یہ علم نافع اور فائدہ مند نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ یہ حقائق اور اوہام میں انسانی دماغ میں آنے والے وسوسے اور الہام میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ نفس کے اندر ایسی قوت نہیں کہ وہ ان تصورات، خیالات اور صورتوں میں علم نافع کی تمیز کر سکے اور نہ ہی نفس کے پاس ایسا پیمانہ ہے کہ جب ان کا صحیح وزن کر سکے کہ کون غلط ہے اور کون صحیح ہے۔

شیخ محمد عبدہ اور ان کے شاگرد محمد رشید رضا کی گئی حکمت کی تفسیر کا مفہوم ایک ہی جیسا ہے، اس لیے کہ دونوں کے نزدیک عقل کامل جو صحیح اور سالم عمل نافع اور سعادت تک پہنچانے کی قدرت اور صلاحیت رکھتی ہو اس کو حکمت کہا جاتا ہے۔

عبید اللہ سندھی[1] (۱۸۷۲ء-۱۹۴۴ء) لکھتے ہیں:

> ''فطرت انسانی کے جو طبعی تقاضے ہیں ان کی پوری سمجھ پیدا کرنا حکمت ہے، یعنی افراد انسانی، اقوام اور اصناف کو سمجھنا اور انہی نوعی تقاضوں کے ماتحت لانا حکمت ہے۔''

آپ کے نزدیک اشخاص، اقوام اور افراد کے جو بنیادی تقاضے ہیں وہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں مگر جو تقاضے انسانیت کے ہیں ایک تو وہ مستقل ہیں دوسرا وہ تبدیل نہیں ہوتے۔ آپ اپنے مؤقف کے لیے درج ذیل قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہیں:

۱۔ آپ پنجاب کے ایک سکھ گھرانے میں ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ میں پیدا ہوئے۔ ان کا ابتدائی نام بوٹا سنگھ تھا۔ لیکن ''سندھی'' کہلوانا پسند کیا۔ پندرہ سال کی عمر میں ایک ''پنڈت مولوی'' کے 'تحفۃ الہند' کے سبب مسلمان ہوئے۔ آپ جب ہندوستان سے نکلے تو ''پین اسلام ازم'' کی بنیاد پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواہشمند تھے۔ اظہار اسلام' کے بعد ان کی زندگی کا پہلا دور (۱۸۸۷-۱۹۱۵) براستہ 'کانپور اور رام پور' دار العلوم 'میں اپنی تعلیم و تربیت میں گزرا۔ اور پھر 'دار الرشاد' اور 'جمیعۃ الانصار' کے ذریعے ہم وطنوں کو 'معارف قرآنیہ' کا نظارہ کرانے میں صرف کیا۔ دوسرا دور (۱۹۱۵-۱۹۳۹) پچیس سالہ جلاوطنی میں کابل، روس، ترکی، یورپ اور مکہ معظمہ میں گزرا۔ اور اپنا تعارف اک فریڈم فائٹر کے طور پر کروایا جو کسی بھی قیمت یا شرط پر تاج برطانیہ سے مصالحت کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ آپ نے حب الوطنی اور اپنے استاد اسیر مالٹا مولانا محمود الحسن کے حکم پر اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ یعنی ۲۵ برس جلاوطنی میں گزارا اور سخت صعوبتیں برداشت کیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے ریشمی رومال تحریک میں اہم رول انجام دیا، جو ہندوستان کو آزاد کرانے والی پہلی بین الاقوامی مہم تھی۔ آپ کی مشہوت تصانیف میں چند یہ ہیں۔ الہام الرحمن فی تفسیر القرآن (قرآن عظیم کی حکیمانہ انقلابی تفسیر)، ذاتی ڈائری، خطبات و مقالات، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، فکر ولی اللہی کا تاریخی تسلسل، قرآنی شعور انقلاب، مجموعہ تفاسیر امام سندھی، تفسیر المقام المحمود۔ آپ ۲۱ اگست ۱۹۴۴ مطابق ۲ رمضان المبارک ۱۳۶۳ ھجری کو فوت ہوئے۔

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾[1]

سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ دین پر ایک طرف کا ہو کر وہی تراش اللہ کی جس پر تراشا لوگوں کو بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو یہی ہے دین سیدھا، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے

آپ اس آیت کی تفسیر میں حکمت اور حکمت عملی کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

"﴿ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ﴾ ان تقاضوں کو مکمل طور پر سمجھنا اور ﴿ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ﴾ ان تقاضوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم کے احکامات کو نافذ کرنا حکمت عملی ہے۔"[2]

آپ حکمت کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"الحکمۃ قانون کی روح کا نام ہے"[3]

آپ کے نزدیک قرآن کریم جس تہذیب کا تقاضا کرنا چا رہا ہے اس تہذیب کی بنیاد ان عام اصولوں پر ہو گی جو انسانیت کے عام اصول ہیں، پھر ان اصولوں سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ انسانیت کی تکمیل ہو گی، احکام کے ایسی روح اور مقاصد متعین کرنے چاہیے کہ ان احکامات سے انسانیت کو بام عروج ملے، جیسا کہ قرآن کریم میں نماز کا مقصد یہ ہے کہ میری ذکر کے لیے نماز پڑھو تو یہی نماز کی حکمت ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کا مطلب (هدی للمتقين) کہ یہ کتاب انصاف قائم کرنے والے لوگوں کے لیے ہدایت ہے تو اس ایک جملے نے قرآن کی اصل حکمت بتا دی۔ اگر قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کا مقصد انصاف کا قیام نہیں ہے تو در حقیقت قرآن کو نہیں سمجھا جا رہا۔[4]

علامہ مراغی (۱۸۸۱ء-۱۹۴۵ء) بھی احکامات شریعت کے مقاصد کا علم کا نام حکمت رکھتے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

"الحكمة أسرار الأحكام الدينية ومعرفة مقاصد الشريعة"[5]

احکام کی حقیقتوں اور ان کے مقاصد وغیرہ کو سمجھ لینے کا نام حکمت ہے۔

آپ مزید لکھتے ہیں کہ یہ ایسی صفت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ سے جس کو چاہتا ہے حکمت اور علم عطا فرما دیتا ہے۔ جس کو یہ صفت عطا کر دی جاتی ہے تو اس صلاحیت حقائق اور شکوک وشبہات میں فرق کرنے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے لیے وسوسے اور الہام میں فرق کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اشیاء کو حقیقتوں کو دلائل کے ساتھ سمجھنے کے لیے حکمت عقل کا مستقل آلہ ہے۔

عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی (۱۸۸۹ء-۱۹۵۷ء) اپنی تفسیر میں حکمت کا مفہوم اس طرح لکھتے ہیں:

"الحكمةهي العلم النافع والعمل الصالح ومعرفة أسرار الشرائع وحكمها -"[6]

حکمت سے مراد علم نافع، عمل صالح اور شریعت کے اسرار اور حکمتوں سے واقفیت ہے۔

۱۔ الروم: ۳۰/۳۰

۲۔ سندھی، عبیداللہ، تفسیر المقام المحمود، ص ۳۲۰

۳۔ ایضاً، ص ۳۳۳

۴۔ سندھی، عبیداللہ، تفسیر المقام المحمود، ص ۳۳۰

۵۔ المراغی، احمد بن مصطفیٰ، تفسیر المراغی، (مصر، الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۳۶۵ھ)، ۲۱۷/۱

۶۔ السعدی، عبدالرحمٰن بن ناصر، تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان، بیروت، موسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۰ء، ۱۱۵/۱

آپ کے نزدیک حکمت اصل میں انبیاء علیھم السلام کا ہی ترکہ ہے اور انبیاء کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ اپنے مشیت سے یہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ بندوں کو کمال حکمت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور کمال کا تعلق علمی اور عملی قوت کے کامل ہونے کے ساتھ ہے۔ علمی قوت حق کی معرفت اور اس کے اصل مقصود کے حاصل ہونے کے ساتھ حاصل ہوتی ہے جب کہ عملی قوت نیک کام کرنے اور برائی سے رک جانے سے مکمل ہوتی ہے۔آپ کے نزدیک حکمت تہذیب نفس، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کی تکمیل سے حاصل ہوتی ہے۔[1]

علامہ مودودی[2] (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) لکھتے ہیں:

''حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوت فیصلہ ہے۔جس شخص کے پاس حکمت کی دولت ہوگی، وہ ہر گز شیطان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ چلے گا، بلکہ اس راہ کشادہ کو اختیار کرے گا جو اللہ نے دکھائی ہے۔''[3]

علامہ مودودی دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے طریقے اختیار کرنے کو حکمت کا نام دیتے ہیں۔

علامہ غلام اللہ خان (۱۹۰۵ء-۱۹۸۰ء) اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''حکمت سے مراد دین و دنیا کی صحیح سمجھ ہے جو ہر قول اور عمل میں انسان کی صحیح رہنمائی کرے۔''[4]

امین احسن اصلاحی (۱۹۰۴ء-۱۹۹۷ء) مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۳ء-۱۹۳۰ء) کی بیان کردہ حکمت کے مفہوم کی ہی وضاحت کرتے ہیں۔آپ لکھتے ہیں:

''حکمت تو وہ تعبیر ہے اس قوت وصلاحیت کی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے۔جس طرح فیصلہ معاملات کی صلاحیت حکمت کے ثمرات میں سے ہے۔اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔اسی وجہ سے اہل عرب حکمت کا لفظ انسان کی اس قوت وصلاحیت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے۔ چنانچہ دانش مند اور مہذب آدمی کو حکم کہا جاتا ہے اور جو بات عقل اور دل دونوں کے نزدیک بالکل واضح ہو اس کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں''[5]

۱۔ ایضاً، ۱/۱۱۵

۲۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ۱۹۰۳ء بمطابق ۱۳۲۱ھ میں اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔آپ کے آباواجداد میں ایک مشہور بزرگ خواجہ قطب الدین مودود چشتی گذرے تھے جو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے شیخ الشیوخ تھے۔سید مودودی کا خاندان انہی خواجہ مودود چشتی کے نام سے منسوب ہو کر ہی مودودی کہلاتا ہے۔آپ کے مشہور کتب میں چند کے نام یہ ہیں: تحریک آزادی ہند اور مسلمان، تحریک آزادی ہند اور مسلمان، تنقیحات، تعلیمات، تجدید واحیائے دین، تفہیمات، سنت کی آئینی حیثیت، سود، رسائل و مسائل، قرآن کی چار بنیادی اصلاحیں، قادیانی مسئلہ، پردہ، معاشیات اسلام، خلافت و ملوکیت، اسلام اور جدید معاشی نظریات، الجہاد فی الاسلام، تفہیم القرآن۔ تفسیر قرآن کے بعد سیرت النبیؐ پر کام کا آغاز کیا گیا۔تاہم خرابی صحت کے باعث تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ ابتدائی دو جلدیں ہی مرتب کیا گیا اور ''سیرت سرور عالم'' کی پہلی جلد ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ مئی ۱۹۷۹ء میں علاج کی غرض سے امریکا چلے گئے اور ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو امریکا میں انتقال ہو گیا۔ نماز جنازہ لاہور کے قذافی سٹیڈیم میں ۲۶ ستمبر کو ادا کی گئی۔ علامہ یوسف القرضاوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مولانا کی تدفین اچھرہ میں گھر کے باغیچے میں ہوئی (تحریک پاکستان اور علماء۔۔۔ نظریہ پاکستان نمبر۔۔۔چراغ راہ صفحہ نمبر ۲۳۲)

۳۔ المودودی، سید ابوالاعلیٰ، تفہیم القرآن، ۱/۱۷۵

۴۔ غلام اللہ خان، البرہان فی اصول تفسیر جواہر القرآن، ۱/۳۳۱

۵۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، ۱/۲۱۱

یعنی آپ کے نزدیک یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے ایک زائد شے ہے، اگرچہ یہ حکمت سرتاسر قرآن حکیم ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ اسی وجہ سے جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں، ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ حکمت چونکہ حکیمانہ بات کو بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ بات کہنے کی صلاحیت کو بھی، اسی وجہ سے تعلیم حکمت کے معنی جس طرح کسی کو کوئی حکیمانہ بات بتادینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی لوگوں کے اندر حکمت کی صفت و صلاحیت پیدا کرنے کے بھی ہیں۔[1]

متولی الشعراوی (۱۹۱۱ء-۱۹۹۸ء) لکھتے ہیں:

"والحكمة أن يوضع هدف لكل حركة لتنسجم الحركات بعضها مع بعض ويصير الكون محكوما بالحق الذي لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه"[2]

حکمت یہ ہے کہ ہر ایک کام اور عمل کے لیے ہدف مقرر کیا جائے تاکہ ہر کام میں ہم آہنگی اور سلیقہ مندی برقرار رہے تاکہ کائنات میں ہر چیز حقیقت اور حق کے تابع ہو جائے، ایسا حق کہ باطل نہ اس کے سامنے آسکے اور نہ پیچھے سے وار کرسکے۔

یعنی فقہ میں حکمت سے مراد صحیح فیصلہ اخذ کرنا ہے۔ شاعری کی حکمت الفاظ کو اثرات پر تولنا ہے۔ طب کی حکمت یہ ہے کہ بیماری کی علامات اور اس کا علاج کرنے والی دواجان جائے۔ انجینئرنگ کی حکمت یہ ہے کہ ہسپتال کو مریض، ڈاکٹر، علاج کا سامان، ادویات تک رسائی وغیرہ کو ضروریات کے مطابق ڈیزائن کیا جائے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری (۱۹۱۸ء-۱۹۹۸ء) نے حکمت کی تعریف میں دو مقام پر اپنا نقطہ نظر بیان فرمایا ہے، آپ کی تفسیر اور آپ کی کتاب سنت خیر الانام میں بھی حکمت کی قدرے تفصیل مذکور ہے، آپ لکھتے ہیں:

"حکمت سے مراد وہ علم صحیح ہے جو اتنا پختہ اور طاقتور ہو کہ وہ انسانی ارادہ کو حکماً عمل خیر کی طرف متوجہ کر دے۔"[3]

آپ کا مؤقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کو کتاب کے ساتھ حکمت دینے کا بھی وعدہ فرمایا ہے یعنی جس طرح کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس طرح حکمت بھی اسی کی طرف سے ہے۔ حکمت سے مراد اشیاء کی حقیقت کو جاننا اور پھر صحیح علم کے مطابق اس پر عمل کرنا ہے، آپ کے نزدیک لفظ حکمت جب کتاب کے بعد مذکور ہو تو اس کا ایک خاص مفہوم اور معنی ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

لفظ کتاب کے بعد جو لفظ حکمت مذکور ہے اس سے مراد حکمتِ کتاب ہے یعنی کتاب میں جو امر و نواہی، احکامات و ارشادات، دروس و عبر اور پند و نصائح مذکور ہیں ان کی ماہیت و حقیقت کا صحیح علم اور ان پر صحیح صحیح عمل کا نام حکمت ہے۔[4]

۱۔ ایضاً، ۲۱۱/۱

۲۔ الشعراوی، محمد متولی، تفسیر الشعراوی (بیروت، مطابع اخبار العلوم، ۱۹۹۷ء) ۲۵۰/۱

۳۔ کرم شاہ، ضیاء القرآن، ۴۲۱/۱

۴۔ کرم شاہ، سنت خیر الانام، ص ۵۶

اس اعتبار سے یہ حکمت تمام انبیاء علیھم السلام کو عطا فرمائی گئی ، اس سے واضح ہوا کہ کتاب کے بعد جب حکمت مذکور ہو (الکتاب والحکمة) تو اس سے مراد آپ کے نزدیک سنت مراد ہے یعنی کتاب اللہ کی تشریح و توضیح مراد ہوتی ہے۔اسی وجہ سے حکمت کا ایک معنی شکر کی توفیق بھی ہے،آپ نے آیت کریمہ

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِه ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾[1]

اور ہم نے عنایت فرمائی لقمان کو حکمت (ودانائی) اور فرمایا اللہ کا شکر ادا کرو اور جو شکر ادا کرتا ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے اور جو کفران نعمت کرتا ہے تو بیشک اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے۔

آپ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہے :

''آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اسے دانائی عطا فرمائی یعنی اسے شکر کی توفیق بخشی۔اس صورت میں حکمت سے مراد شکر ہوگا۔''[2]

آپ کے نزدیک حکمت کی اصطلاح جب اکیلی استعمال ہوئی تو اس کا مفہوم مضبوط دلائل ہیں جو حق کو واضح کرنے والے ہوں اور شک وشبہ کو ختم کر کے یقین میں بدلنے والے ہوں۔[3]

ڈاکٹر اسرار احمد[4] (۱۹۳۲ء-۲۰۱۰ء) کے نزدیک جس کسی پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے وہ حکیم ہے۔اور حکمت اصل میں انسان کی عقل اور شعور کی پختگی کا نام ہے۔استحکام اسی حکمت سے ہی بنا ہے۔اللہ تعالیٰ عقل و فہم اور شعور کی یہ پختگی اور حقائق تک پہنچ جانے کی صلاحیت جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

آپ کے نزدیک عقل اور علم کی پختگی کی اعلیٰ سطح حکمت ہے، نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کی جن درجات میں تربیت فرمائی ان میں سب سے بلند درجہ حکمت کا ہے،آپ لکھتے ہیں :

۱۔ لقمان:۱۲/۳۱

۲۔ کرم شاہ، ضیاء القرآن، ۱۳۹/۴

۳۔ ایضاً، ۱۹۹/۵

۴۔ ڈاکٹر اسرار ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو موجودہ بھارتی ریاست ہریانہ کے ضلع حصار کے مغل خاندان میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ لاہور منتقل ہو گئے۔ دوران تعلیم آپ اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ رہے اور فعال کردار ادا کرتے ہوئے ناظم اعلی مقرر ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔تاہم جماعت کی انتخابی سیاست اور فکری اختلافات کے باعث آپ نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور اسلامی تحقیق کا سلسلہ شروع کر دیا اور ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھی جس کے وہ بانی قائد مقرر ہوئے۔۱۹۸۱ء میں آپ جنرل ضیا الحق کی مجلس شوریٰ کے بھی رکن رہے۔ ۔آپ نے ۱۰۰ سے زائد کتب تحریر کیں جن میں سے کئی کا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ آپ نے قرآن کریم کی تفسیر بیان القرآن کے نام سے لکھی اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کئی جامع کتابیں تصنیف کیں۔آپ کے مشہور تصنیفات میں ملفوظات ڈاکٹر اسرار احمد، اصلاح معاشرہ کا قرآنی تصور، نبی اکرم سے ہماری تعلق کی بنیادیں، توبہ کی عظمت اور تاثیر، حقیقت و اقسام شرک، قرآن کے ہم پر پانچ حقوق شامل ہیں۔ ڈاکٹر اسرار مؤرخہ ۱۴ اپریل، ۲۰۱۰ء کو ۷۸ برس کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔آپ کو گارڈن ٹاؤن، لاہور کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا(ڈاکٹر مفتی عبدالواحد ''ڈاکٹر اسرار احمد، افکار و نظریات، ص ۳۴)

''حکمت کے سبب کسی انسان کی سوچ اور علم میں پختگی آتی ہے' اس کی گفتگو میں جامعیت پیدا ہوتی ہے اور اس کی تجزیاتی اہلیت بہتر ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ کسی سے بات کرتے ہوئے یا کسی کو دین کی دعوت دیتے ہوئے معروضی صورت حال' مخاطب کے ذہنی رجحان اور ترجیحات کا درست تجزیہ کرنے کے بعد اپنی گفتگو کے نکات اور دلائل کو ترتیب دیتا ہے''[1]

آپ کے نزدیک حکمت تحقیق کا اعلیٰ درجہ ہے جس پر ایک محقق کو تجزیہ کرنا اور بات کو ٹھیک ٹھیک انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت آجاتی ہے۔ پھر اپنے مدعا کو کتنا اور کس انداز سے بھی پیش کرنے کی صلاحیت آجاتی ہے۔ یعنی اِسلوب میں نکھار جو معاشرے اور وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ہو وہ حاصل ہو جاتا ہے۔[2]

وھبہ الزحیلی (۱۹۳۲ء-۲۰۱۵ء) لکھتے ہیں:

''الحكمة (العلم النافع الصحيح) وفهم القرآن، فقد أعطي أفضل ما أعطي من جمع كتب علم الأولين من الصحف وغيرها. والآية تحض على العلم وترفع شأن الحكمة، وتهدي إلى استعمال العقل في أشرف ما خلق له''[3]

حکمت سے علم نافع اور صحیح علم اور قرآن کا صحیح فہم مراد ہے، جس کو حکمت عطا کی گئی گویا اس کو تمام اولین کی کتب اور صحائف وغیرہ کا علم عطا کیا گیا، آیات میں حکمت سے مراد علم ہے اور اس سے حکمت کی شان کو مزید بلند کرنا مقصود تھا۔ حکمت عقل کو اس جانب لے جاتی ہے جو مخلوق میں سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔

مولانا وحید الدین خان (۱۹۲۵ء-۲۰۲۱ء) حکمت کے مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''انسان میں ایسی سمجھ بوجھ کا پیدا ہو جانا کہ دنیا کے ظاہری اور نمائشی فائدوں ہی میں پھنس کر نہ رہ جائے بلکہ حقیقی نفع و نقصان کو سمجھ سکے اور اچھائی اور برائی کی راہوں کا شناسا ہو جائے، ان باتوں میں سے جسے قرآن حکمت سے تعبیر کرتا ہے۔''[4]

آپ مزید لکھتے ہیں کہ حکمت یعنی یعنی دین کے گہرے بھیدوں سے پردہ اٹھانا، بین السطور میں چھپے ہوئے حقائق کو نمایاں کرنا۔''[5]

حکمت کی تعریف میں جدید نقطہ نظر کے طور پر علامہ صابونی (۱۹۳۰ء-۲۰۲۱ء) لکھتے ہیں:

''يعطي العلم النافع المؤدي إلى العمل الصالح من شاء من عباده''[6]

یعنی وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کو وہ علم نافع عطا فرماتا ہے جو نیک عمل تک لے جائے۔

ان تفسیری رجحانات کے آخر میں علامہ حمید الدین فراہی کے حکمت کے مفہوم اور اس کی تفسیر و تشریح میں نکتہ نظر بیان کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ایک تو اس مقالہ سے پہلے اردو زبان میں آپ نے ہی اس موضوع پر قلم اٹھایا اور حکمت کو مفہوم اپنے منفرد انداز میں واضح کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے قدیم تفسیری ادب کو بیان کر کے

۱۔ اسرار احمد، تفسیر بیان القرآن، ۳۹۴/۱

۲۔ ایضاً، ۳۹۴/۱

۳۔ الزحیلی، وھبہ، التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج، (دمشق، دار المعاصر، ۱۴۱۸ھ)، ۶۵/۳

۴۔ وحید الدین، خان، تذکیر القرآن (نئی دہلی، مکتبہ الرسالہ)، ۲۴۵/۱

۵۔ ایضاً، ۳۹۲/۱

۶۔ صابونی، صفوۃ التفاسیر، ۱۵۴/۱

اس اصطلاح قرآنی کے مفہوم میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد رکھی جس سے حکمت کا مفہوم مزید واضح ہو کر سامنے آیا ہے۔اسی وجہ سے اس مقالہ میں ضروری مقامات پر حکمت کے اطلاقات میں علامہ حمید الدین فراہی کے نکتہ نظر کو ذکر بھی کیا گیا ہے۔علامہ حمید الدین فراہی لکھتے ہیں:

"حکمت ایسی قوت، صلاحیت اور ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعے فیصلہ کیا جا سکے"[1]

آپ کے نزدیک حکمت کا صحیح مفہوم اہل عرب کے نزدیک معتبر ہے۔ اہل عرب اس قوت کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں جس قوت کی وجہ سے انسان حق کے مطابق فیصلہ کرے جس انسان میں حق کے موافق کلام کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ وہ حسن اخلاق کا مالک ہو اور ادب اور حلم سے آراستہ ہو۔اس کے اندر حکمت کی قوت موجود ہوتی ہے۔ گویا بہترین اخلاق اور عمدہ کردار حکمت کے پَر تو ہیں۔[2]

فلاسفہ اہل حکمت نہیں ہیں

علامہ حمید الدین فراہی کے نکتہ نظر کے مطابق عالم لوگوں کا یہ تصور کہ "اہل فلسفہ ہی اہل حکمت ہیں" غلط ہے۔فلاسفہ نے علم اور عالم کو تو موضوع بنایا اور ارسطو نے کہا کہ تمام علوم کا احاطہ کر لینا حکمت ہے جب کہ تمام علوم کا احاطہ کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔اس شبہ سے نکلنے کے لیے ارسطو نے علم کو کلیات تک محدود کر دیا اور مابعد الطبیعات کے علم کو اعلیٰ حکمت کا تصور دیا۔ جب کہ آپ کے نزدیک حکیم کے اندر تو حق کی جستجو کا مادہ ہوتا ہے اور جانچ پرکھ کر باطل سے حق کو تلاش کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے لہٰذا فلاسفہ کا حکمت کے موضوع کو تمام علوم کو قرار دینے غلط ہے اس لیے کہ حکمت کو حق کی تلاش ہے اور اس کے لیے اعلیٰ کیفیت کا ہونا ضروری ہے۔

حق کو پا لینے کا نام حکمت ہے۔آپ کے نزدیک کائنات کا سب سے بڑا حق تعالیٰ کی ذات ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا ہے۔جو شخص اس عظیم حق کی پہچان کر لے اور اس کا دل بھی مطمئن ہو جائے تو وہی شخص حکیم ہے۔جو ہر باطل سے رک جائے اور فاسد اعمال چھوڑ کر پاکیزہ اعمال اختیار کر لے وہی شخص حکیم ہے اور اس کو اہل حکمت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص ایمان تک ہی نہیں پہنچ سکا تو دوسرے علوم اور فنون میں اس کی مہارت تامہ بھی ہو جائے تو اِس کی بدولت اس کو حکیم نہیں کیا جائے گا۔[3]

حکمت کے مفہوم میں اختلاف اور تطبیق

امام فراہی کے نزدیک حکمت کے مفہوم میں مذکورہ تمام اقوال[4] ایک ہی حقیقت کی ترجمانی مختلف انداز سے کرتے ہیں۔آپ کے نزدیک سب سے پہلے انسان کے دل پر بصیرت اور توفیق کی حیثیت سے ظاہر ہوتی ہے پھر دل منور ہوتا ہے تو اس نور کا اثر کلام پر بھی ہوتا ہے۔اسی وجہ سے حکمت کا اظہار انسان کے کلام سے شروع ہو جاتا ہے۔وہ خود حق بات کہتا ہے۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پابند ہوتا ہے۔ پھر اگلے مرحلے میں حکمت اس کے

۱۔ الفراہی، حمید الدین، حکمۃ القرآن، ص ۱۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۵

۳۔ ایضاً، ص ۱۹

۴۔ جو اقوال اور قدیم اور جدید مفسرین کی آراء اس مبحث میں بیان کی گئی ہیں۔

عمل سے ظاہر ہوتی ہے اور اچھے، اعلیٰ اور عمدہ اخلاق اختیار کرتا ہے۔اس طرح سے بطور نتیجہ اس کے علم و عمل میں مکمل مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔[1]

خلاصہ

قرآن کریم کی اصطلاح (الحکمة) کی تفسیر میں قدیم اور جدید تفسیری آراء سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ قدیم مفسرین کے نزدیک حکمت سے مختلف فیہ اقوال مذکور ہیں جن میں نبوت قرآن کریم کا علم اور اس کے مواعظ اور احکامات کا علم، نبی کریم ﷺ کی سنت اور اس میں مکمل عبور حاصل کرنا، دین کی مکمل سمجھ بوجھ حاصل کرنا، دین کی اتباع اور دین کے احکامات کے مقاصد اور ان کی حکمتوں اور ان کے حقائق کا مکمل عبور حاصل کرنا۔ علم اور عمل میں مطابقت اور موافقت، علم کے مطابق عمل کرنا، ظاہر اور باطن کی یکسانیت، حق کے مطابق فیصلہ کرنا، حق اور باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت کا ہونا شامل ہیں۔اسی طرح حکمت سے ایسا علم جو نافع ہو اور دین اور دنیا میں کامیابی اور نجات کی طرف لے جانے والا ہو بھی مراد ہے۔

جدید مفسرین نے حکمت کے مفہوم میں سنت کے علاوہ مزید تشریح فرمائی ہے جس میں وقت، زمانے اور حالات کے مطابق قول اور فعل کا صحیح استعمال کرنا مراد ہے۔اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کی آیات کے حقیقتوں کو سمجھ کر اس کی ذات پر کامل اور مکمل یقین کر لینے کا نام حکمت ہے۔اسی طرح جدید مفسرین نے واقعات کی خوب تحقیق کر کے فیصلہ کرنا اور حق کو سمجھنے کی صلاحیت کا پیدا ہو جانا اور پھر حقیقت کے مطابق صحیح اور سچی کلام کرنے کا نام حکمت رکھتے ہیں۔نیز جدید مفسرین نے حکمت کے تعبیر و تشریح میں حکمت کو حکمت عملی کی جانب پھیرتے ہوئے اس کو دو اقسام میں تقسیم کر دیا ہے یعنی حکمت نظریہ اور حکمت عملیہ یعنی دونوں کے اتفاق اور اجتماع سے حکمت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

۱۔ ایضاً، ص ۲۱

مبحث دوم

صوفیاء کے نزدیک حکمت کا تصور اور تفسیری اطلاقات

صوفیاء کے نظریات اور افکار چونکہ ظاہری احوال سے زیادہ باطنی احوال پر مشتمل ہوتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک تزکیہ نفس، مشاہدہ، کشف، اشیاء کے حقائق اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے اشیاء پر تصرف بطور کرامت کی اہمیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اس لیے ان مقامات کے حصول کے لیے صوفیاء کرام اللہ تعالیٰ کی ذکر اور اس کی آیات پر تفکر اور تدبر کرنے، تقویٰ اختیار کرنے، شیطانی وسوسوں اور الہام میں فرق کرنے کے علم سے واقف ہوتے ہیں اور اسی علم اور عمل کو وہ حکمت کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک حکمت کا اعلیٰ مقام اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس معرفت ہے اور حکمت کے حصول کے لیے تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ باقی لازمی امور اس صفت کے حصول کے لیے لازم ہیں۔ صوفیانہ تفسیر جو تفسیر اشاری کے طور پر مشہور ہیں ان کے نقطہ نظر درج کرنے کے ساتھ ساتھ حکمت کے بارے میں کچھ قدیم صوفیاء کے نظریات بھی درج کیے جائیں گے تاکہ حکمت کے بارے میں صوفیاء کا نقطہ نظر زیادہ واضح ہو جائے۔

ابو محمد سہل تستری (۸۱۸ء-۸۹۶ء) اپنی تفسیر میں حکمت میں مختلف اقوال کو جمع کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"الحكمة إجماع العلوم ، وأصلها السنة"[1]

حکمت ان سب علوم کا جامع ہے اور اس کی اصل سنت رسول ﷺ ہے۔

آپ نے حکمت کی اساس اور بنیاد کو نبی کریم ﷺ کی سنت قرار دیا ہے۔

عبدالرحمٰن السلمی (م ۹۶۵ء) اپنی تفسیر کے اندر حکمت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

"الحكمة هي النورُ المفرق بين الإلهام والوسواس"[2]

حکمت سے مراد ایسا نور ہے جس سے الہام ربانی اور وسواس شیطانی کی درمیان تمیز اور فرق کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

صوفیاء کے احوال اور ان کے عقائد پر قدیم کتاب ابو بکر کلابازی (م ۹۹۴ء) کی ہے، صوفیاء کرام نے حکمت کے تصور میں قول و فعل میں مطابقت اور اعمال صالحہ کی راستگی اور پختگی کا ذکر کیا ہے، جو شخص دنیا میں رہ کر بھی اس سے بے رغبت رہتا ہے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انوار و تجلیات کا نزول ہوتا ہے، دنیا سے زہد اختیار کرنے والے کا دل نور سے منور رہتا ہے اور اس کو انشراح صدر نصیب ہوتا ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم میں ہے:

﴿أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾[3]

۱۔ التستری، سہل، تفسیر القرآن العظیم (بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۳ھ)، ۴۳/۱

۲۔ السلمی، ابو عبدالرحمن، حقائق التفسیر تفسیر القرآن العزیز (بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۱ھ)، ۱۱۱

۳۔ الزمر: ۲۲/۳۹

بھلا اللہ نے جس شخص کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیا ہو تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر (فائز) ہو جاتا ہے، (اس کے بر عکس) پس ان لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جن کے دل اللہ کے ذکر (کے فیض) سے (محروم ہو کر) سخت ہو گئے، یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

تہذیب النفس کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں اس سے بجز حکمت کے بچا نہیں جا سکتا، جس کے بارے میں امام کلاباذی لکھتے ہیں:

" فأول ما يلزمه علم آفات النفس ومعرفتها ورياضتها وتهذيب أخلاقها ومكائد العدو وفتنة الدنيا وسبيل الاحتراز منها وهذا العلم علم الحكمة"[1]

صوفیاء کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی بات جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نفس کی آفتوں، اور نفس کی معرفت، نفس کی ریاضت کرنے اور اس کے اخلاق کو مہذب بنانے کا علم سیکھے، نیز دشمن کی چالوں سے ہوشیار رہنے، دنیا کی آزمائشوں کا علم اور اس بات کی معرفت کہ ان سب (برائیوں) سے کیسے بچا جائے، حاصل کی جائے، اس کو حکمت کا علم کہا جاتا ہے۔

ابو بکر کلاباذی ایک اور مقام پر حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صوفیاء کے نزدیک ہر امر میں حق اور صواب کو پالینا حکمت ہے، جب اہل حکمت حق کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں تو اس کی پہچان یہ ہے کہ ان کے دل نرم ہو جاتے ہیں، ان کو اپنی موت اپنے سامنے نظر آنے لگتی ہے اور جس حق کی معرفت ان کو نصیب ہوتی ہے وہ اس حق کو قبول کرنے میں کسی قسم کا تردد اور دیر نہیں کرتے۔[2]

ابو طالب مکی[3] (م ۹۹۶ء) حکمت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" فإذا وقف العبد في الشبهات عن الإمضاء وأوقف الخاطر على الابتداء حتى يكشفه الله عز وجل له بمزيد علم أو قوة يقين أو كشف حجاب الهوى فقد وفق للصواب وهو من معنى قوله عز وجل (ومن يؤت الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا)"[4]

جب سینے میں نور ڈالا جاتا ہے تو علم کے ذریعے قلب اور یقین کے ذریعے نظر سے حجاب دور ہو جاتا ہے اور زبان حقیقت بیان کرنے لگتی ہے۔ یہی وہ حکمت ہے جو اللہ عَزَّ وَجَلَّ نے اپنے اولیائے کرام رَحِمَهُمُ اللهُ السَّلَام کے قلوب میں ودیعت کی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا: جسے حکمت عطا کی گئی گویا اسے خیر کثیر عطا کی گئی۔

ابو طالب مکی حضرت سیدنا فزارہ شامی کے حوالے سے اہل حکمت کے اوصاف لکھتے ہوئے کہتے ہیں

۱۔ الکلاباذی، ابو بکر محمد بن اسحاق ابراہیم بن یعقوب، التعرف لمذہب اہل التصوف (بیروت: دار الکتب العلمیہ ۱۴۰۰ھ)، ۷۸/۱

۲۔ ایضاً: ۷۸/۱

۳۔ آپ کا پورا نام محمد بن علی بن عطا الحارثی ہے۔ آپ ابو طالب مکی کے نام سے مشہور ہیں۔ جو تصوف کی پہلی کتاب قوت القلوب (قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب ووصف طریق المرید الی مقام التوحید) کے مصنف ہیں۔ آپ مکہ کے رہنے والے نہ تھے بلکہ اہل جبل سے تھے پھر مکہ میں مستقل رہائش رکھی اور اسی سے مکی منسوب ہیں۔ بغداد کی جامع مسجد میں وعظ و نصیحت کی مجلس منعقد کرتے۔ ابو الحسن بن سالم بصری شیخ سالمیہ کے طریقے پر تھے۔ ان کی وفات ۳۸۶ھ میں بغداد میں ہوئی اور مقبرہ مالکیہ مین مدفون ہوئے۔ مگر مخزن الاسرار میں سالِ وفات ۳۸۷ھ لکھا ہے۔ (قوت القلوب، شیخ ابو طالب مکی، تعارف مصنف، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

۴۔ ابو طالب مکی، محمد بن علی بن عطیۃ الحارثی، قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب ووصف طریق المرید إلی مقام التوحید (بیروت: دار الفکر ۱۴۱۲ھ)، ۷۴/۱

" صمتهم حكمة وعلمهم قدرة"[1]

یعنی ان کا خاموش رہنا حکمت ہے جس نے خاموشی کو اختیار کیا وہ اہل حکمت میں سے ہے اور ان کا علم اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے عجائبات کی طرف غور وفکر اور تدبر و تفکر کرنا ہی ان کے نزدیک اصل علم ہے جس سے معرفت الٰہی نصیب ہوتی ہے۔ یعنی کم کلام کرنا اور خاموشی اختیار کرنا حکمت کی صفات میں سے ہے۔اسی مؤقف کی تائید ابو اسحاق خواص[2] کے اس قول سے ہوتی ہے جو امام بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے:

"إِنَّ اللهَ يُحِبُّ ثَلَاثَةً وَيُبْغِضُ ثَلَاثَةً، فَأَمَّا مَا يُحِبُّ: فَقِلَّةُ الْأَكْلِ، وَقِلَّةُ النَّوْمِ، وَقِلَّةُ الْكَلَامِ" [3]

بے شک اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں سے محبت کرتا ہے اور تین قسم کے لوگوں سے نفرت، جن سے محبت کرتا ہے ان میں وہ ہیں جو کم کھانے والے، کم سونے والے اور کم کلام کرنے والے ہیں۔

امام قشیری (۹۸۶ء-۱۰۷۶ء) نے بھی فکر وتدبر اور قلّت کلام کو حکمت کے حصول کا ذریعہ لکھا ہے، آپ لکھتے ہیں:

"ورثوا الحكمة بالصمت والتفكر"[4]

خاموشی اور فکر وتدبر پر مداومت کرنے والے ہی حکمت کے وارث بنتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ قلّت کلام والے سے محبت کرتا ہے اور جس سے وہ محبت کرتا ہے وہ قرآن کریم کے مطابق (من یشاء) یعنی الٰہی میں داخل ہوتے ہیں۔اس سے واضح ہوا کہ قلّت کلام حکمت کو مستلزم ہے۔یعنی بقدر حاجت کلام کرنا اور زیادہ سکوت اختیار کرنے والا شخص اہل حکمت میں سے ہوتا ہے۔

تقویٰ اور حکمت

صوفیاء نے بھی حکمت کا تقوی کے ساتھ مربوط کیا ہے، یعنی اہل تقوی ہی اہل حکمت اور حکیم کہلاتے ہیں، جس میں تقویٰ کی صفت جتنی زیادہ راسخ ہوگی اس کو اتنی زیادہ حکمت کی نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے، ابو عبدالرحمٰن السلمی[5] نے لکھا ہے کہ تقویٰ کے بغیر حکمت کا تصور کرنا بے کار ہے، آپ لکھتے ہیں

---

۱ ۔ ایضاً، ۱/۷۵

۲ ۔ آپ کا پورا نام اُبو اسحٰق اِبرھیم بن اُحمد بن اِسماعیل الخواص ہے، آپؒ حضرت شیخ جنید بغدادی رضی اللہ عنہ حضرت شیخ ابوالحسن نوری کے ہم اثر تھے، تیسری صدی ہجری کے اُوائل میں پیدا ہوئے اور ۲۹۱ھ میں وصال ہوا، (تاریخ بغداد، تألیف: الخطیب البغدادی، ۹/۶.)

۳ ۔ بیہقی، شعب الایمان للبیہقی، باب فی المطاعم والمشارب، فصل فی ذم کثرۃ الاکل، ۵/۴۷، رقم الحدیث ۵۷۲۹

۴ ۔ قشیری، عبدالکریم بن ہوازن، الرسالۃ القشیریہ (القاہرہ: دار المعارف ۱۴۱۰ھ)، ۱/۲۴۷

۵ ۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی ۳۲۵ھ مطابق ۵۲ اپریل ۹۳۷ء کو نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ پورا نام محمد بن الحسین بن محمد بن موسیٰ، ابو عبدالرحمٰن السلمی، الازدی تھا، ان کے اساتذہ میں سب سے مشہور شخصیت امام دارقطنی کی ہے۔ جو حدیث کے جلیل القدر امام تھے۔ السلمی نے ان سے طویل عرصے تک استفادہ کیا۔ دارقطنی کے علاوہ ابو نصر السّراج جن کی کتاب اللمع فی التصوف تصوف کی سب سے پہلی باضابطہ تصنیف مانی جاتی ہے، وہ بھی ان کے اساتذہ میں ہیں۔ ان کے علاوہ ابوالقاسم النصر آبادی احمد بن علی بن شاذان ابن حسنویہ، حلیۃ الاولیاء کے مصنف ابو نعیم اصفہانی، ابو بکر القفال شاشی، ابو عبد اللہ محمد بن یعقوب الشیبانی اور بہت فن سے اساتذہ سے انھوں نے اکتساب فیض کیا۔ ان کے تلامذہ میں حدیث کے مشہور امام امام بیہقی بھی ہیں۔ ان کے علاوہ تصوف کے امام امام ابوالقاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری بھی ان کے شاگرد ہیں۔ امام ابوالمعالی جوینی نیشاپوری بھی ان کے شاگرد ہیں۔ تصوف کے جلیل القدر امام شاہ ابو سعید ابوالخیر بھی ان کے شاگرد ہیں۔ مستدرک علی الصحیحین کے مصنف امام حاکم اصلاً توان کے ساتھی ہیں، لیکن تاریخ نیشاپور میں انھوں نے السلمی سے روایات لی ہیں۔ اس لیے

"لَا تطمع فِي إلهام الْحِكْمَة مَعَ ترك التَّقْوَى"[1]

تقویٰ اختیار کرنے کے بعد حکمت کے ملنے کی توقع نہ کرنا۔

سورۃ الاسراء میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾[2]

یہ حکمت و دانائی کی ان باتوں میں سے ہے جو آپ کے رب نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس آیت سے پہلی آیات میں جتنے بھی اعلیٰ اخلاق کا حکم دیا گیا ہے اور جن رزائل اخلاق سے منع کیا گیا تھا، یہ سارے باتیں بذریعہ وحی آپ ﷺ کو بتا دی گئی ہیں

اس آیت کی تفسیر میں عبدالکریم القشیری (۹۸۶ء-۱۰۷۶ء) لکھتے ہیں:

"بالوحی والإلهام، ولأوليائه تعريف بحكم الإلهام"[3]

صوفیاء کرام اور اولیاء کرام کے نزدیک حکمت سے مراد الہام ہے۔

آپ کے نزدیک اہل حکمت ہی انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، انبیاء کے بعد اگر کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ کی جاتی تو وہ حکمت ہی ہے، حکمت کی سب سے پہلی علامت آپ کے نزدیک زیادہ خاموش رہنا اور بقدر حاجت کلام کرنا ہے

عبدالکریم القشیری نے قرآنی کریم کی اصطلاح حکمت میں مختلف قول لکھے ہیں:

۱۔ الإصابة في العقل والعقد والنطق قول و فعل اور عقل کے ذریعے درست رائے تک پہنچنا حکمت ہے

۲۔ متابعة الطريق من حيث توفيق الحق لا من حيث همة النفس نفسانی خواہشات کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ توفیق اور اس کے بتائے ہوئے احکامات کے ذریعے حق تلاش کرنا

۳۔ جذبات اور خواہشات کی پیروی سے رک جانا حکمت ہے

۴۔ کائنات کی تدبیر اور اس میں ہونے والے فیصلوں پر غور کرنا حکمت ہے۔

۵۔ اپنے نفس کی قدر و قیمت کو جاننا (نفس میں غور و فکر کرنا) اس کی برائیوں پر متنبہ ہو کر نفس کا تزکیہ کرنا حکمت ہے۔

ان کو بھی ان کے تلامذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔آپ کی تصانیف میں مشہور حقائق التفسیر، طبقات الصوفیہ، مناہج العارفین، جوامع آداب الصوفیہ، عیوب النفس ہیں، آپ کا وصال شعبان ۴۱۲ ھجری میں ہوا۔ (تاریخ بغداد، تألیف: الخطیب البغدادی، ج۲، ص ۲۴.)

۱۔ السلمی، ابو عبدالرحمٰن محمد بن الحسین بن محمد بن موسیٰ بن خالد بن سالم النیسابوری (م ۴۱۲ھ)، طبقات الصوفیہ، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۹ھ، ج۱، ص ۴۰

۲۔ الاسراء ۳۹/۱۷

۳۔ القشیری، عبدالکریم بن ہوازن بن عبدالملک، لطائف الاشارات (مصر: الهيئة المصرية العامة، ۱۴۲۰ھ)، ۳۴۹/۲

۶۔ ألا تستعصى على من تعلم أنك لا تقاومه جس کا مقابلہ کرنے کی تجھ میں ہمت نہیں، جان بوجھ کر اس کی طرف قدم نہ بڑھانا حکمت ہے۔[1]

أبو محمد بقلی الشیرازی (م ۶۰۶ھ) اپنی تفسیر کے اندر حکمت کو سراسر اخلاق کی معرفت کا نام دیتے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

"الحكمة معرفة الإخلاق وإطلاع لغيوب النفس ودقائق الشيطان"[2]

اخلاق کی مکمل معرفت اور انسان اور اس کی روح میں چھپے رازوں کی حقیقت اور شیطان کی وسوسوں کو پہچان لینے کا نام حکمت ہے۔

ان تمام اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء کے نزدیک بھی حکمت کا تصور قدیم مفسرین کے طرح اشیاء کی حقیقتوں کو پا لینے کا ہی ہے۔ان کے نزدیک اپنے قول کو سچائی اور عمل کو درست جانب پھیرنے کا نام حکمت ہے۔ یعنی ان اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ حکمت کے کچھ ایجابی اور سلبی پہلو نمایاں ہیں کچھ کے کرنے اور کچھ کے نہ کرنے کا نام حکمت ہے یعنی غور وفکر کرنے، قول اور عمل میں سچا ہونے، کائنات میں ہونے والے کاموں کی حکمتوں کو جاننے کی کوشش کرنے کا نام حکمت ہے اور سلبی پہلو میں نفس کی پیدا کردہ برائیوں کی معرفت حاصل کر کے ان سے بچنے، غصہ پر قابو پانے اور لایعنی امور کو ترک کرنے کا نام حکمت ہے۔

سورۃ العنکبوت میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾[3]

اور جو لوگ ہمارے حق میں جہاد (اور مجاہدہ) کرتے ہیں تو ہم یقیناً انھیں اپنی (طرف سیر اور وصول کی) راہیں دکھا دیتے ہیں، اور بیشک اللہ صاحبان احسان کو اپنی معیّت سے نوازتا ہے۔

صوفیاء کرام نے قرآن کریم کی بعض آیات کی تفسیر اپنے منہج واسلوب کے مطابق فرمائی ہے۔سید زبیدی حنفی (م ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

"الذين يعملون بما يعلمون، قال يوفقهم ويهديهم إلى ما لا يعلمون حتى يكونوا علماء حكماء، ".[4]

اس سے مراد ایسے لوگ جو اپنے علم کے مطابق علم کرنے والے ہیں۔اور یہ بھی مراد ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لیے کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو اس کی توفیق عطا فرمائے گا اور جو بات وہ ابھی تک نہیں جانتے اس کی جانب بھی ان کی راہنمائی فرمائے گا یہاں تک کہ وہ علم وحکمت رکھنے والے بن جائیں۔

امام غزالی (۱۰۵۸ء-۱۱۱۱ء) حکمت کا مفہوم اس طرح لکھتے ہیں:

۱۔ ایضاً، ج ۳، ص ۳۳۰

۲۔ البقلی، ابو النصر صدر الدین روز بہان، عرائس البیان فی حقائق القرآن (بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۱ھ)، ۱/۱۱۳

۳۔ العنکبوت ۲۹/۶۹

۴۔ الزبیدی، محمد بن محمد الحسینی، اتحاف السادۃ المتقین بشرح إحیاء علوم الدین (بیروت: دار الفکر ۱۴۱۴ھ)، ۳/۹۱

"فأمهات محاسن الأخلاق هذه الفضائل الأربعة وهي الحكمة والشجاعة والعفة والعدل والباقي فروعها --- وَنَعْنِي بِالْحِكْمَةِ حَالَةً لِلنَّفْسِ بِهَا يُدْرِكُ الصَّوَابُ من الخطأ في جميع الأفعال الاِخْتِيَارِيَّةِ". [1]

صوفیاء کے نزدیک اخلاق کے اصولوں کا دارمدار چار چیزوں کے حصول پر ہے۔ ان میں حکمت، شجاعت، عفت اور عدل ہیں، ان چاروں کی تکمیل سے اخلاق مکمل ہوتا ہے۔ حکمت سے مراد نفس کی ایسی حالت ہے جس کے ذریعے انسان اختیاری افعال میں صحیح اور غلط میں فرق کر سکے۔

اسی اخلاق کی تعلیم کو قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ [2]

ایمان والے تو وہ ہی ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک نہ کیا اور اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہی لوگ سچے ہیں۔

آپ کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر بغیر کسی شک وتردد کے ایمان لانا ہی یقین کی قوت، عقل کا ثمر اور حکمت کا کمال ہے۔ آپ نے حدیث مبارکہ بیان کرتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ الْمُؤْمِنَ قَدْ أُعْطِيَ زُهْدًا فِي الدُّنْيَا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فَاقْتَرِبُوا مِنْهُ فَإِنَّهُ تَلَقَّى الْحِكْمَةَ ". [3]

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم کسی مرد مومن کو دیکھو کہ اس کو دنیا سے بے رغبتی اور قلیل کلام کرنے کی صلاحیت عطا کی گئی ہے تو اس کے قریب ہو جاؤ کہ اس کو حکمت عطا کی گئی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ صوفیاء تہذیب نفس کو حکمت کی اصل قرار دیتے ہیں اور یہ بھی ان کا نظریہ اور رائے ہے کہ اچھے اخلاقیات کی بنیاد ان سابقہ چار فضائل کے ساتھ ہے جن میں سب سے اعلیٰ درجہ اسی حکمت کا ہے جس کی تعریف سابق میں بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح حکمت میں صوفیاء اخلاق، سکوت یعنی خاموشی اختیار کرنے، دنیا سے بے رغبت اختیار کرنے کا نام حکمت قرار دیتے ہیں۔

علامہ اسماعیل حقی [4] (۱۱۲۷ھ) اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"الإصابة في القول والعمل ولا يسمى حكيماً إلا من اجتمع له الأمران كذا قال الإمام: من أحكمت الشيء أي: رددته عما لا يعنيه وكأن الحكمة هي التي ترد عن الجهل والخطأ" [5]

۱۔ الغزالی، ابوحامد محمد بن محمد، احیاء علوم الدین، (بیروت، دار المعرفہ، ۱۴۱۰ھ)، ۳/۳۳

۲۔ الحجرات: ۴۹/۱۵

۳۔ الطبرانی، سلیمان بن احمد بن ایوب، المعجم الکبیر (قاہرہ: مکتبہ ابن تیمیہ، ۱۴۱۵ھ)، مَنْ يُكَنَّى أَبَا خَلَّادٍ أَبُو خَلَّادٍ، رقم ۹۷۵

۴۔ ابوالفداء اسمٰعیل حقی بن مصطفیٰ استانبولی: تفسیر روح البیان کے مصنف اور سلسلہ خلوتیہ کے صوفیا میں سے ہیں۔ علامہ اسماعیل حقی کی ولادت ۱۰۶۳ھ آیدوس میں ہوئی۔ بروصہ، قسطنطنیہ میں زندگی کا اکثر حصہ گزارا۔ آپ کی مشہور تصنیفات میں روح البیان فی تفسیر القرآن، الرسالہ الخلیلیہ فی التصوف، کتاب الذکر والشرف، کتاب النجاۃ، وسیلۃ المرام ہیں۔ آپ کی وفات ۱۱۲۷ھ بمطابق ۱۷۱۵ء میں ہوئی۔ (ہدیہ العارفین اسماء المؤلفین وآثار المصنفین مؤلف: اسماعیل بن محمد امین بن میر سلیم البابانی)

۵۔ الحقی، اسماعیل بن مصطفیٰ، روح البیان (بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۱ھ)، ۱/۲۰۵

قول اور عمل میں حق اور سچ کو پالینے کا نام حکمت ہے اور دونوں کے اجتماع کے بغیر حکمت حاصل نہیں ہوتی۔ جیسے اہل عرب کہتے ہیں میں نے اس کو ایسی باتوں سے روک دیا جو اس کے لیے مفید نہیں تھیں۔ چونکہ حکمت عقل کو جہالت اور غلطیوں سے روکتی ہے اس لیے اس کا نام حکمت ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے قرب کے لیے اعمال صالحہ کے ذریعے کوشش کرنے سے حکمت حاصل ہو جاتی ہے گویا اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والے، اس سے محبت کرنے والے اہل حکمت ہیں۔

علماء اور اہل حکمت

سورۃ فاطر میں ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾[1]

بس اللہ کے بندوں میں سے اس سے وہی ڈرتے ہیں جو (ان حقائق کا بصیرت کے ساتھ) علم رکھنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں علماء کا وصف خشیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، ایسے علماء جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر غور وفکر کرنے والے اور بصیرت کا علم رکھنے والے ہیں، صوفیاء کرام نے اس آیت کے ضمن میں علم اور عمل کا تعلق واضح کیا ہے اور لکھا ہے کہ عمل کے بغیر علم حکمت سے عاری ہے۔ ابو طالب مکی (م ۳۸۶ھ) ربیع بن انس کے قول نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”من لم يخش الله تعالى فليس بعالم ألا ترى أن داود صلى الله عليه وسلم قال ذلك بأنك جعلت العلم خشيتك والحكمة والإيمان بك فما علم من لم يخشك وما حكم من لم يؤمن بك“[2]

جو اہل علم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے گویا وہ عالم نہیں ہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ تم اپنے علم کو خشیت، حکمت اور ایمان والا بناؤ، اگر تم میں خشیت نہیں تو گویا تمہارے پاس علم ہی نہیں اور حکمت تو تب ہی ملے گی جب تم اس علم پر عمل کرو گے۔

آپ کے اس قول سے واضح ہوا کہ حکمت اس بات کا متقاضی ہے کہ علم کے ساتھ عمل ہو ورنہ ایسا علم بے نور، بے حکمت اور باحجاب ہو گا، جو علم نافع اور علم معرفت وتدبر کی صفات والا نہیں کہلائے گا۔

قرآن کریم کا ارشاد:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾[3]

جسے چاہتا ہے دانائی عطا فرما دیتا ہے، اور جسے (حکمت و) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہو گئی، اور صرف وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو صاحب عقل و دانش ہیں۔

۱۔ فاطر: ۲۸/۳۵

۲۔ ابو طالب مکی، قوت القلوب، ۲۳۷/۱

۳۔ البقرہ: ۲۶۹/۲

امام قشیری اپنے اسلوب کے مطابق آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہیں جس سے صوفیاء کے نزدیک حکمت کا تصور اور اس کا معنی و مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے، آپ لکھتے ہیں کہ حکمت کسی کام کی حقیقت اور اس کی باریکی کو پالینا ہے، صوفی کو چاہیے کہ بشری خرافات اور خواہشات نفسانی اس پر غالب نہ ہوں:

"الحكمة: أن يحكم عليك خاطر الحق لا داعي الباطل، وأن تحكم قواهر الحق لا زواجر الشيطان"[1]

حکمت یہ ہے کہ تیرا دل ہر لمحہ حق کے مطابق فیصلہ کرے، تیرے دل میں باطل اور حق کے علاوہ کسی چیز کا گزر نہ ہو، حکمت یہ ہے کہ تو حق کی قوت کے ساتھ معاملے کی حقیقت تک پہنچے نہ کہ شیطان کی مدد اور اس کی مدد سے حقیت حال تلاش کرے۔

آپ کے نزدیک حکمت امور کی درستگی کا نام ہے، صوفی یہ خیال کرے کہ لایعنی امور اور بشری برائیاں اس پر غلبہ نہ پالیں، جو اپنے نفس کو حکمت سے قابو نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے نفوس کا تزکیہ کیسے کرے گا۔ جس شخص کے پاس خود حکمت اور معاملات کی درستگی نہیں ہے وہ دوسروں کو حکمت کا علم کیسے عطا کرے گا۔ حکمت اللہ تعالیٰ کے احکام کی موافقت (ان پر کماحقہ عمل پیرا) کرنا ہے۔ جہل اور بے وقوف شخص اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہے، حکمت میں ایک قول یہ ہے کہ اہل حکمت حق کو اپنے سامنے پاتے ہیں جب کہ سفہاء حق کے علاوہ ہر چیز کو حاضر پاتے ہیں۔[2]

صوفیاء کرام نے حکمت کا جو تصور دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان جسم میں جو ایسی چیزیں ودیعت کی ہیں جن کا تعلق حواس خمسہ ظاہرہ کے ساتھ ہے، ان صلاحتیوں کو مزید نکھار پیدا کر کے ان کو اس قابل بنانا کہ ان میں کائنات میں غور و فکر اور تدبر و تعقل کرنے کی اور اس سے مثبت نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ ان حواس میں اتنی مہارت پیدا ہو جائے کہ معرفت کی راہیں آسان ہو جائیں اور حق اور باطل میں فرق پیدا کرنے کی صلاحیت اجاگر ہو جائے۔ حکمت کا صوفیانہ تصور یہ ہے کہ عقل کو اس منزل تک لے کر جانا جہاں سے ذات باری کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ عقل کا یہ بام عروج علم اور عمل، زہد اور معرفت یعنی تزکیہ سے حاصل ہوتا ہے

صوفیاء کرام کے نزدیک حکمت اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اسرار و رموز اور اس کی طرف سے عطا ہونے والے انوار و تجلیات کا نام ہے۔ صاحب حکمت پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اسرار اور اس کے عجائبات الہام ہوتے ہیں، ان کے نزدیک ساری کائنات کا نظام حکمت پر مبنی ہے، اشیاء کو پیدا کرنے اور انسانی نگاہوں سے اوجھل کرنے کی حکمت، ہر ایک تخلیق کا دوسری تخلیق سے ربط اور تعلق حکمت ہے۔ کسی تخلیق میں اس کی حکمت کا ظاہر ہونا اور کسی شے میں حکمت کا پوشیدہ ہونا صاحب حکمت پر عیاں ہوتا ہے۔ جس کو حکمت عطا کر دی جاتی ہے کائنات کے حجابات اس کے لیے ختم ہو جاتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ کی ذات بھی اس پر پوشیدہ نہیں رہتی اور وہ اپنی نگاہوں سے ذات باری کی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ صوفیاء حکیم اس کو کہتے ہیں جو ہر بات کو کریدتا نہیں بلکہ کائنات میں ہر تخلیق کو بے عبث اور بے کار نہیں جانتے اور ہر ایک تخلیق پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرتے ہیں ایسے شخص کو حکیم اور اللہ تعالیٰ کا محبوب کہا جاتا ہے۔

---

۱ ۔ القشیری، عبد الکریم بن ہوازن بن عبد الملک، لطائف الاشارات، ۲۰۸/۱

۲ ۔ دیکھیے: لطائف الاشارات، ۲۲۰/۴

کامل عارف صاحب حکمت ہوتا ہے جو ہر لمحہ اس کی ذات بے عیب ہونے اور اس کے لازوال بادشاہی کی تصدیق کرتا رہتا ہے۔ ہر چیز اور ہر کام کو اس کے مقام اور مرتبے پر رکھتا ہے۔ حکیم ہر ایک کو اس کا حق ادا کرتا ہے ،اس کو یہ حکمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ کشف اور الہام عطا کی جاتی ہے اور اس کا تعلق علم (ظاہری) کے ساتھ نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور پھر وہ خیر کثیر کا مالک ہو جاتا ہے۔

خلاصہ

صوفیاء کرام کے نزدیک قلیل کلام، خاموشی اختیار کرنے، تقویٰ کی صفت پیدا کرنے کا نام حکمت ہے۔ یہ امور حکمت کے حصول کے لیے ضروری بھی ہیں اور ان صفات سے متصف شخص اہل حکمت میں سے ہوتا ہے۔ جس شخص کو حکمت عطا ہو جاتی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی چھپی ہوئی حکمتیں ظاہر کر دی جاتی ہیں۔ کائنات کے اسرار اور رموز اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ جہلات، سفاہت اس شخص سے دور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جس شخص کے پاس بصیرت ہو اور اشیاء کے حقائق پا لینے کا ملکہ ہو جسے صوفیاء کشف کہتے ہیں ایسا شخص اہل حکمت میں سے ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کے ذریعے قدم بقدم راہ نمائی ملتی رہتی ہے تاکہ حق اور باطل اس پر خفیہ نہ رہے۔ لہٰذا ان صفات کے حامل شخص ہی اہل حکمت ہوتے ہیں۔

فصل چہارم
حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاحات اور تفسیری اطلاقات

قرآن مجید میں حکمت کی قریب المعنی کئی ایک اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں، جن کی اجمالی تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے:

مبحث اول: **الإصلاح**	مبحث دوم: **التدبر**	مبحث سوم: **التذکر**
مبحث چہارم: **التفکر**	مبحث پنجم: **السدید**	مبحث ششم: **العقل**
مبحث ہفتم: **الفرقان**	مبحث ہشتم: **القسط**	مبحث نہم: **المتوسم**
مبحث دہم: **النُّهَى**	مبحث یازدہم: **أولو الالباب**	مبحث دوازدہم: **أولى الابصار**
مبحث سیزدھم: **الحلم**		

مبحث اول
الإصلاح

لغوی معنی

قرآن کریم کی اصطلاح "اصلاح" باب افعال (أصلَحَ يُصلِحُ) کا مصدر ہے، جس کا معنی ہے درست کرنا، صلح کروانا اور قرآن کریم میں اس کی ضد "الفساد" استعمال ہوئی ہے۔[1]

اور "صَلُحَ الشئُ يَصْلُحُ صَلَاحاً" کوئی چیز درست اور ٹھیک ہوئی اور "صَلَحَ" لام کے فتحہ کے ساتھ بھی آتا ہے جس کا مصدر "صُلُوح" ہوتا ہے۔ شاعر کا قول ہے:

۱۔ الجوهری، الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية (بیروت: دار العلم للملايين، ۱۴۰۷ھ)، ۱/۳۸۳

وكيف بأطرافي إذا ما شتمتني .. وما بعد شتم الوالدين صلوح"[1]

اور اس وقت میرے پلکوں کی حالت کیا تھی جب تم نے مجھے گالیاں دیں، اور والدین کو گالیاں دینے کے بعد کوئی اچھائی (حکمت اور دانائی) نہیں۔

ابن منظور لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں اصلاح، فساد کی ضد ہے۔ خراب چیز کو درست کرنا اصلاح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے جانور کے ساتھ اصلاح کی یعنی جانور کی بیماری میں حکمت و دانائی کا استعمال کیا تو وہ تندرست ہو گیا۔[2]

اصلاحی مفہوم

اصلاح کسی چیز، امر یا کسی شخص کی ذاتی اچھائی پر دلالت کرتا ہے۔ ایک شخص کی ذاتی اصلاح یعنی درستگی کی وجہ سے کتنے فساد ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فساد اور فتنہ کو دور کرنے کے لیے "اصلاح" کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے۔[3]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۖ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾[4]

(ہم جو رسول بھیجتے ہیں اسی لیے تو بھیجتے ہیں کہ وہ نیک کردار لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والے اور بدکرداروں کے لیے ڈرانے والے ہوں۔ پھر جو لوگ ان کی بات مان لیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔)

ڈاکٹر حسن الدین احمد لکھتے ہیں:

قرآن کریم کی اصطلاح "اصلاح" اہم اصطلاح ہے، جو ص، ل، ح سے مشتق ہے، اس کا معنی دیانت دار اور کھرا ہونا ہے، اگرچہ یہ لفظ فساد کی ضد ہے لیکن اردو میں مصلحت، حکمت اور ڈپلومیسی (Diplomacy)، اور موقع پرستی کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی حالات دیکھ کر اپنے عمل کا تعین کرنا[5]

اس سے ثابت ہوا کہ اصطلاح "اصلاح" بھی حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

امام فخر الدین رازی درج بالا آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَالْإِصْلَاحِ الَّذِي هُوَ عَمَلُ الْجَسَدِ"[6]

۱۔ ابن فارس، مقاییس اللغۃ (بیروت: دار الفکر، ۱۳۹۹ھ)، ۲/۱۸۷

۲۔ ابن منظور، لسان العرب (بیروت: دار صادر، ۱۴۱۴ھ)، ۸/۲۳۱

۳۔ شیخ صالح بن حمید، نضرة النعيم في مكارم أخلاق الرسول الكريم صلى الله عليه وسلم (جدہ: دار الوسیلۃ، ۱۴۳۰ھ)، ۲/۳۶۴

۴۔ الانعام: ۶/۴۸

۵۔ حسن الدین احمد، ڈاکٹر، قرآنی فہمی، (دہلی، جید پریس، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۲

۶۔ الرازی، ابو عبداللہ محمد بن عمر، مفاتیح الغیب، (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۸ھ) ۱۲/ ۵۳۷

اصلاح کا تعلق ظاہری جسم سے ہے۔

جب کہ ایک اور مقام پر امام رازیؒ نے اصلح کے تین معانی لکھے ہیں جن میں سے ایک معنی یہ بھی لکھا ہے:

"أَنَّهُ أَصْلَحَهَا فِي أَخْلَاقِهَا وَقَدْ كَانَتْ عَلَى طَرِيقَةٍ مِنْ سُوءِ الْخُلُقِ وَسَلَاطَةِ اللِّسَانِ تُؤْذِيهِ وَجَعَلَ ذَلِكَ مِنْ نِعَمِهِ عَلَيْهِ."[1]

اصلاح کا معنی یعنی اس کے اخلاق کو پاکیزہ کر دیا اس سے پہلے وہ مخلوق کے لیے ایذا رساں اور زبان کی سخت تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس عظیم نعمت سے سرفراز فرمایا۔

ابوالاکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں مولانا اشرف علی تھانوی نے بیان القرآن، ابوالاعلی مودودی نے تفہیم القرآن، پیر کرم شاہ نے ضیاء القرآن میں اور علامہ قطب شہید نے اپنے ترجمہ میں "اصلاح" کا ترجمہ "اپنے طرز عمل کی اصلاح" کی ہے اور قرآنی اصطلاح "الحکمة" بھی اسی مفہوم کا تقاضا کرتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ "اصلاح" بھی حکمت کی ہم معنی قرآنی اصطلاح ہے۔[2]

پیر کرم شاہ الازہری نے بھی اسی مفہوم کو تفصیلا بیان کیا ہے کہ رسولوں کی آمد کا مقصد نئے معجزات دکھانا نہیں کہ جس نے جب بھی جس کی فرمائش کی معجزہ دکھانا ضروری ہو گیا بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ نیکی کرنے والوں کو نیکی کی فضائل اور اس کے اجر و ثواب کی بشارتیں سنائیں اور بدکار لوگوں کو ان کا کارستانیوں کا انجام یاد کروائیں تا کہ نیک لوگ مراتب میں اعلیٰ مراتب تک پہنچ جائیں اور بُرے اعمال کرنے والے اپنے اعمال بد سے توبہ کر لیں۔[3]

"اصلاح" کے اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ﴾[4]

پس ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

حکمت اعلیٰ اخلاقی قدروں اور اخلاق کی پاکیزہ اور معطر ہونے کا نام ہے اس لیے أَصْلَحَ کی اس قرآنی اصطلاح سے یہ بھی واضح ہوا کہ قرآن کریم میں بعض مقامات پر یہ اصطلاح بھی حکمت کے ہم معنی استعمال ہوئی ہے۔

۱۔ مفاتیح الغیب، ۱۸۲/۲۲

۲۔ قطب شید، سید، فی ظلال القرآن، (مترجم سید معروف شاہ شیرازی) (لاہور: ادارہ منشورات اسلامی، ۲۰۰۸ء) ۵۵/۲

۳۔ دیکھیے ضیاء القرآن، ۹۹/۳

۴۔ الانبیاء: ۹۰/۲۱

"اصلاح" کا ایک معنی معاشرے کے لیے مفید اور باعث امن اور حسن اخلاق کا باعث ہونا بھی ہے۔ علامہ سید محمود آلوسی نے "اصلاح" کا معنی لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو معاشرت یعنی امور خانگی اور گھر کے جملہ مسائل کے لیے فائدہ مند بنا دیا۔ تاکہ وہ معاشرے اور خصوصا رہن سہن کے جملہ مسائل سے نہ صرف آگاہ رہے بلکہ ان مسائل کو حل کرنے میں مفید ثابت ہو۔ آپ لکھتے ہیں:

"أَصْلَحْنا لَهُ زَوْجَهُ أي أصلحناها للمعاشرة بتحسن خلقها" [1]

اس کو بہترین اخلاق سے مزین کر دیا جس کی وجہ سے ہو معاشرت (اِمور خانگی) کے لیے مفید بنی گئی۔

امام آلوسیؒ آیت کریمہ

﴿إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ﴾ [2]

(میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی مرا بس چلے اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں)

کی تفسیر میں لکھا ہے کہ میں تمہاری قبیح اور فاسد اُمور سے اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی اصلاح کا اس آیت کریمہ میں "اصلاح" مفہوم فاسد اور بُرے اعمال سے اصلاح کر کے اعمال کو پاکیزہ اور مستحسن بنانا ہے۔ قرآن کریم میں حکمت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ ایسی بُری عادتوں اور خصلتوں سے چھٹکارا حاصل کر کے نیک اعمال کرنا اور اپنی ذات کو احسن اعمال کا پابند بنانا۔ امام آلوسیؒ لکھتے ہیں:

"أي ما أريد إلا أن أصلح ما استطعت إصلاحه من فاسدكم" [3]

اللہ تعالیٰ نے سورۃ ھود میں حضرت شعیب علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب ذکر فرمایا، جس میں حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میرا کام تو صرف تمہاری حالت سنوارنا اور تمہارے اخلاق درست کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ﴾ [4]

شعیب (علیہ السلام) نے کہا "تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا اور پھر اس نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا (تو اس کے بعد میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں تمہارا شریک حال کیسے ہو سکتا ہوں؟) اور میں ہر گز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو

۱۔ الآلوسی، روح المعانی، ۸۳/۹

۲۔ ھود: ۸۸/۱۱

۳۔ الآلوسی، روح المعانی، ۳۱۵/۶

۴۔ ھود: ۸۸/۱۱

اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی مرا بس چلے اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں)

علامہ محمود نسفی لکھتے ہیں:

﴿إِنْ أُرِيدُ إِلاَّ الإصلاح﴾ ما أريد إلا أن أصلحكم بموعظتي ونصيحتي وأمري بالمعروف ونهي عن المنكر[1]

میرا مقصود فقط اصلاح ہے میں اپنے وعظ و نصیحت سے تمہاری اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بھی میرا مقصود یہی ہے۔

ان آیات بینات میں اصلاح کا معنی حکمت کا ہم معنی ہے یعنی نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا اور اپنی حالت کو درست کرنا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصلاح بھی حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

پیر کرم شاہ کے بقول "اصلاح" کا معنی یہ ہے کہ میری ان ساری کاوشوں کا ایک ہی مقصد ہے کہ تمہارا عقیدہ بھی درست ہو جائے اور تمہارے اعمال بھی پاکیزہ ہو جائیں۔ تمہاری ساری مخالفتوں کے باوجود میں حتی المقدور یہ کوشش جاری رکھوں گا۔[2]

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت" کا نعرہ صرف حضرت شعیب (علیہ السلام) کا نعرہ نہیں تھا بلکہ تمام انبیاء اور تمام سچے رہبروں کا نعرہ یہی تھا، ان کی رفتار و گفتار اس مقصد پر شاہد ہے۔ یہ نہ تو لوگوں کا دل بہلانے کے لئے آئے تھے اور نہ گناہوں کو معاف کرانے، نہ بہشت پہنچنے کے لئے آئے تھے اور نہ آرزومندوں کی حمایت کرنے کیلئے، بلکہ ان کا مقصد مطلق اصلاح تھا، فکر و نظر میں اصلاح، اخلاق، تہذیب و تمدن، اقتصاد، سیاست اور معاشرہ کے تمام امور کی اصلاح تھا اور اس مقصد کو کامل کرنے کیلئے یہ لوگ خدا پر تکیہ کرتے تھے اور کسی بھی طرح کے فتنہ اور دھمکی سے ڈرتے نہیں تھے۔[3]

سورۃ الاعراف کی آیت مبارکہ کی تفسیر میں قطب شہید لکھتے ہیں:

﴿وَٱلَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِٱلْكِتَٰبِ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُصْلِحِينَ﴾[4]

اور جنھوں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے کتاب کو اور قائم کیا نماز کو بیشک ہم ضائع نہیں کریں گے اجر اصلاح کرنے والوں کا

علامہ قطب شہید نے اس آیت کی تفسیر میں اپنی ذات اور معاشرے کی بھی اصلاح کی بات کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں صرف اپنی اصلاح مقصود نہیں بلکہ اس شخص سے جڑے ہر فرد کی اصلاح کرنی مقصود ہے۔ اس طرح یہ لفظ حکمت کے قریب المعنی اس طرح ہوتا ہے کہ حکمت کا تعلق بھی صرف اپنے نفس اور اپنی ذات کی معرفت کے ساتھ نہیں بلکہ سارے معاشرے کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔[5]

۱۔ النسفی، عبداللہ بن احمد بن محمود، مدارک التنزیل وحقائق التأویل، (بیروت: دار الکلم، ۱۹۹۸) ۷۹/۲

۲۔ دیکھیے: ضیاء القرآن، ۲۲۲/۳

۳۔ الطباطبائی، تفسیر نمونہ، ۲۶۷/۹

۴۔ الاعراف: ۱۷۰/۷

۵۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۳۱۹/۴

امین احسن اصلاحی بھی لکھتے ہیں کہ اصلاح سے مراد اپنوں کی اصلاح ہے یعنی جب اپنے ارد گرد اہل معاشرہ کی اصلاح کرے گا تو اس کا اجر ضائع نہیں ہو گا۔[1]

قرآن کریم کی اصطلاح (الحكمة) کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح (الإصلاح) ہے۔ اور (الحكمة) کے مختلف اجزا میں سے بھی اس کا ایک جز ہے جس کا معنی درست کرنا اور اپنی ذات کے اندر برائیوں اور گناہوں کو ختم کرنا اور ساتھ ہی اپنے ارد گرد معاشرہ بھی قائم کرنا اور یہ صلاحیت اور صفت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے اور یہ (الحكمة) کے قریب المعنی اور اس کے اجزاء میں سے ایک جز لاینفک ہے یعنی اس سے جدا نہیں ہے۔

---

۱ ۔ دیکھیے: اصلاحی، تدبر قرآن، ۲۲۰/۴

۲۔ التدبر

قرآن کریم اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کی آیات اور اس کے مفاہیم میں غور وفکر کیا جائے۔ انسان کے عقل اور غور وفکر کا زاویہ جدا جدا ہے۔ قرآن کے فہم کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی کائنات میں پھیلی ہوئے بے شمار آیات کو سمجھنے کے لیے (التدبر) کی اصطلاح ذکر کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں کلمہ (التدبر) چار مقام پر وارد ہوا ہے، کلمہ (يَتَدَبَّرُونَ)، (يَدَّبَّرُوا) اور (لِيَدَّبَّرُوا) کے کلمات استعمال ہوئے ہیں۔[1]

لغوی معنی

علامہ فراہیدی نے دبر کا معنی (دُبُرَ كلِّ شيءٍ خلاف قُبُله ما خلا قولهم) پیٹھ کو کہا جاتا ہے، ہر وہ چیز جو قُبل کے مخالف ہو اس کو دبر کہا جاتا ہے قُبل کے مخالف دُبر یعنی پیٹھ کا اطلاق ہوتا ہے، جب ایک شخص اپنے دوست سے چہرہ پھیر لیتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے کہ اس نے پیٹھ دکھا دی۔ رَجُلٌ دَابِرٌ کا معنی بولا جاتا ہے۔ لغت کے مشہور ائمہ نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے:

"الأدابر هو الرجل يقطع رحمه؛ وذلك أنّه يدبر عنها ولا يقبل عليها"[2]

ایسا آدمی جس سے رحمت و نرمی منقطع کر دی جاتی ہے اور وہ پیچھے کر دیا جاتا ہے اور اس کا کوئی عمل یا اس سے کیا گیا کوئی عمل قبول نہیں کیا جاتا۔

اصطلاحی مفہوم

قرآن کریم میں مذکور لفظ التدبر کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ کسی کام یا معاملہ کے انجام پر نظر رکھنا اور پھر اس میں غور وفکر کرنا تدبر کہلاتا ہے۔ علامہ جرجانی لکھتے ہیں:

"التدبر: عبارة عن النظر في عواقب الأمور أن التفكر تصرف القلب بالنظر في الدليل والتدبر تصرفه بالنظر في العواقب"[3]

تدبر کا مفہوم کسی کام کے انجام کی طرف دقت نظر سے دیکھنا، مگر تفکر کا تعلق قلب کے ذریعے دلائل کے ساتھ غور وفکر کرنے جب کہ تدبر کا تعلق کسی امر کے نتائج اور اس کے انجام کار پر نظر کرنے سے ہے۔

۱۔ فواد عبد الباقی، المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم، ۲۸۸/۵

۲۔ احمد بن فارس، معجم مقاييس اللغة، ۹۷/۲

۳۔ الجرجانی، التعریفات، ۷۶/۱

علامہ راغب اصفہانی کے مطابق یہ لفظ جب باب تفعیل کے وزن پر استعمال ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ غور و فکر کر کے کسی کام کے انجام پر نظر رکھنا۔

"التدبيرُ: التفكّر في دبر الأموريعني: ملائكة موكّلة بتدبير أمور"[4]

اسی لفظ (دبر) سے التدبیر بھی ہے جس کا معنی اِمور میں غور فکر کرنا۔ اسی وجہ سے وہ فرشتے جو دنیوی اِمور کے منتظم ہیں ان کو قرآن کریم میں المدبرات کہا گیا ہے۔

پھر تدبر کا وسیع مفہوم یہ ہے کہ کلام کی ہر جانب کا بنظر غائر جائزہ لینا۔ پھر اس کے بعد مزید غور و حوض کرنا تدبر کہلاتا ہے اسی وجہ سے تدبر کا صیغہ تَفَعُّل کے وزن پر آتا ہے جیسے تجرع، تفہم اور تبین یعنی کسی امر میں وسیع غوطہ زن ہونا تدبر کہلاتا ہے۔ علامہ زبیدی نے تاج العروس میں بھی یہی لکھا ہے کہ کسی فعل یا کسی امر کی ہر جانب کا وسیع جائزہ لینے کو تدبر کہا جاتا ہے۔ علامہ زبیدی لکھتے ہیں:

"والتَّدْبِيرُ: النَّظَرُ فِي عاقِبَةِ الأَمْرِ) ، أَي إِلى مَا يَؤُوُل إِليه عاقِبَتُه، (كالتَّدَبُّرِ) . وَقيل: التَّدَبُّرُ التَّفكُّر أَي تَحْصِيل المعْرِفَتَيْنِ لتَحْصِيل مَعْرِفةٍ ثَالِثَة، وَيُقَال عَرَف الأَمرَ تَدَبُّراً، أَي بأَخَرَةٍ. قَالَ جَرير:وَلَا تَتَّقُون الشَّرَّ حتَّى يُصِيبَكُمْ - وَلَا تَعْرِفون الأَمرَ إِلاَّ تَدَبُّرَا"[5]

کسی کام کے انجام اور نتیجہ پر گہری نظر رکھنا، ہر کام اور ہر امر کو اس کی آخری حد تک اور اس کے نتیجے تک پرکھنا، تدبر کا ایک معنی تفکر ہے دونوں اطراف سے غور و فکر کرنا، عرف عام میں تدبر کو حرف آخر کہا جاتا ہے، ابن جریر کہتا ہے کہ جب بھی تم کو مصیبت پہنچے تو اس سے بچنے کا طریقہ سوچو اور کسی امر کو تدبر کے بغیر انجام نہ دو۔

علامہ ابن قیم اپنی کتاب کے اندر قرآن کریم کی اصطلاح تدبر کی وضاحت اس انداز میں لکھتے ہیں:

"تحديق ناظر القلب إلى معانيه، وجمع الفكر على تدبّره وتعقّله"[6]

دل کی آنکھوں سے معانی و مطالب کی طرف غور کرنا اور غور و فکر کو تدبر اور عقل کے ذریعے جمع کرتے ہوئے استدلال کرنا۔

نبی کریم ﷺ اپنی اُمت کو تدبر اور تفقہ کے بارے میں تلقین فرماتے ہیں، ارشاد نبوی ہے:

(لا خير في عبادة لا علم فيها ولا علم لا فهم فيه ولا قراءة لا تدبر فيها)[7]

۴۔ الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ج۲، ص۲۷۷

۵۔ الزبیدی، تاج العروس من جواھر القاموس، ج۱۱، ص۲۶۵

۶۔ ابن القیم، مدارج السالکین بین منازل إیاک نعبد وإیاک نستعین، ج۱، ص۴۴۹

۷۔ الدارمی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن إبو محمد، سنن الدارمی، ج۱، ص۱۰۱

جس کی قرآت یعنی تلاوت قرآن کریم میں تدبر نہ ہو اور جس شخص کی عبادت میں تفقہ (سمجھ بوجھ) نہ ہو، اس میں کوئی خیر نہیں۔

یعنی قرآن کریم کی تلاوت کا تدبر کے بغیر مقصودی فائدہ حاسل نہیں ہو سکتا۔ اس روایت کی روشنی میں یہ واضح ہوا کہ تدبر کا تعلق تلاوت میں سمجھ اور بوجھ کے ساتھ ہیں یعنی غور وفکر کر کے پڑھنا۔ اور جس کو تدبر کی نعمت عطا کر دی جاتی ہے اسے اللہ تعالیٰ کی آیات سمجھنے اور ان کے اندر غور وحوض کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ تو ان دلائل سے واضح ہوا کہ اصطلاح'' تدبر ''قرآنی اصطلاح''الحکمة'' کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾ [8]

تو کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے، اور اگر یہ (قرآن) غیر خدا کی طرف سے (آیا) ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

علامہ ابن قیم'' تدبر '' کے مفہوم کی وضاحت فرماتے ہیں:

''تدبر الْكَلَام ان ينظر فِي اوله وَآخره ثمَّ يُعِيد نظره مره بعد مرّة وَلِهَذَا جَاءَ على بِنَاء التفعل'' [9]

کلام میں تدبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کلام کے اول وآخر کو باریک بینی سے دیکھنا اور اس کے اندر بار بار غور وحوض کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ باب تفعل سے ہے جس کے اندر بار بار کوشش اور تکرار کے معنی پائے جاتے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ تدبر کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

''لِيَدَّبَّرُوا آياتِهِ اى ليتفكروا فيها يعنى تتفكر أنت وعلماء أمتك فيعرفوا ما يدبر ظاهرها من التأويلات الصحيحة والمعاني المستنبطة او يتفكر كل من له عقل فيعلم انه من الله ولا يتصور إتيانه من البشر ----- فان الكتب الالهية بيان لما لا يعرف الا من الشرع وارشاد الى ما لا يستقل به العقل ولعل التدبر للمعلوم الاول'' [10]

تا کہ لوگ غور کریں، یعنی آپ اور آپ کی امت کے علماء غور کریں۔ اس کے ظاہر کو پڑھیں اور صحیح تاویلات کو سمجھیں اور صحیح طور پر معانی کا استنباط کریں۔ یا یہ مطلب ہے کہ تمام اہل دانش غور کریں اور سمجھیں کہ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے۔ انسان کی ساختہ پرداختہ ہونے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ خارجی دلائل کی روشنی میں معرفت خداوندی کے حصول پر عقل سلیم والوں کو فطری طور پر قدرت حاصل ہے۔ صحیح دانش والوں کی عقلوں میں دلائل سے معرفت کا حصول مذکور ہے۔ اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں سے ان

۸۔ النساء: ۸۲/۴

۹۔ ابن القیم، محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد (م۷۵۱)، مفتاح دار السعادة ومنشور ولایة العلم والإرادة، ج۱، ص۱۸۳

۱۰۔ پانی پتی، ثناء اللہ، التفسیر المظہری، ج۸، ص۱۷۴

افکار و احکام کا علم حاصل ہو جاتا ہے جو تنہا عقل کی رسائی اور دائرہ دانش سے خارج ہیں اور بغیر شرع کے صرف عقل اپنی فکری جولانی سے وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔

اس آیت میں تدبر کا تعلق عقل کے اس مقام تک ہے جہاں افکار اور احکام کا علم حاصل ہوتا ہے۔ بندہ مومن صرف اپنی بساط اور طاقت سے تدبر کا وہ مقام حاصل نہیں کر سکتا جو اس کو عطیہ الٰہی سے ہوتا ہے۔تدبر سے مراد ایسی معرفت اور آیات کے اندر وہ معانی و مفاہیم کا سمجھنا ہے جو انسانی عقل کے اندر مخفی ہیں مگر تدبر کے بغیر وہ مستحضر نہیں ہوتی، ان کو صفحہ قلب پر لانے کے لیے تگ ودو کرنی پڑتی ہے۔اپنی عقل کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے جھکانا پڑتا ہے تب حکمت کا ایک پہلو اور ایک گوشہ مقام تدبر حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کا فلسفہ التدبر ہمیں قوت علمی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔قرآن کریم کو سمجھنے اور اس کے دقیق مسائل کو حل کرنے کے لیے علمی طور پر جو وسائل بھی میسر ہوں ان کو کام میں لایا جائے تاکہ قرآنی فلسفہ تدبر کی تکمیل ہو سکے اور قرآن کریم کی آیات میں تدبر کر کے ان کے اندر باریک لطائف کو چھان بین کی جائے تاکہ قرآن کریم کا پیغام ان لوگوں تک بھی پہنچے جو صرف ثواب کی غرض سے ہی قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں۔"[11]

تدبر کرنے والے کو صرف ایمان کے بڑھ جانے کی نعمت نہیں ملے گی بلکہ اس کی تصدیق میں یقین کامل کی منزل اور اس کے علم و یقین میں پختگی اور اس کے اعمال صالحہ کی ادائیگی میں برکت اور اس پر دوام حاصل ہو گا۔اس پر مزید یہ کہ چونکہ تدبر کا تعلق حکمت کے ایک پہلو سے ہے تو اس کو علم اور معرفت کی دولت نصیب ہو جائے گی قرآن کریم میں حکمت اور اس کے قریب المعنی الفاظ کا تعلق اسی سے ہے، علامہ طنطاوی لکھتے ہیں:

"أی: زادتهم قوة في التصديق، وشدة في الإذعان، ورسوخا في اليقين، ونشاطا في الأعمال الصالحة، وسعة في العلم والمعرفة"[12]

آیات میں تدبر کی وجہ سے ایمان میں تصدیق کا کامل ہونا۔تسلیم کرنے میں مضبوطی، یقین میں راسخ، اعمال صالحہ کی ادائیگی مین دوام اور ہمیشگی اور علم و معرفت کا حصول ہے۔

خلاصہ

قرآن کریم کی اصطلاح (التدبر) اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے وسیع مفہوم پر مشتمل ہے۔ جہاں جہاں پر یہ اصطلاح استعمال ہوئی ہے وہاں ہر ایک مقام پر اس کا ایک خاص مقصد اور حکمت ہے۔قرآن کریم میں اس اصطلاح کا مفہوم ایمان کی زیادتی، صالح اعمال، حق اور ہدایت کی طرف رہنمائی، علم نافع کا حصول بیان کیا گیا ہے۔اس کے مفہوم اور اس کے منافع اور مقاصد پر نظر ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اصطلاح (الحكمة) کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔اور حکمت کے اجزاء میں سے ایک جُز اور اس کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔

۱۱۔ دیکھیے: تفسیر عثمانی، ص۲۵۵

۱۲۔ الطنطاوی، محمد سید، التفسیر الوسیط للقرآن الکریم، ۲۵/۶

۳۔ التذکر

قرآن کریم اپنے پڑھنے والے کو تدبر کے ساتھ ساتھ تذَکُّر کی بھی دعوت دیتا ہے۔ حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح تذکر بھی ہے، اس سے پہلے کہ ہم اس کی تفصیل لکھیں، یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو قرآن کریم میں تفکر کرے گا اور اس کے اندر غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو گی وہ تدبر کے مقام تک پہنچ جائے گا یعنی قرآنی آیات میں بار بار تدبر کرنا اور اللہ تعالیٰ کی تخلیقات میں بار بار غور وحوض کرنا، تفکر اور تدبر کے نتیجہ تذکر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے ہم نے تذکر کو تفکر اور تدبر کے بعد ذکر کیا ہے۔

لغوی معنی

لفظ ذکر (ذال کی زیر کے ساتھ) کا معنی کسی چیز کو اس طرح تکرار کے ساتھ یاد کرنا کہ وہ چیز ہمیشہ یاد رہے۔ابن فارس کے مطابق

ذكرت الشيء بلساني وقلبي ذكراً، وأجعله منك على ذكر، أي: لا تنسه[1]

کسی چیز کا زبان کے ساتھ بار بار ذکر اور تکرار کرنا کہ وہ چیز ہمیشہ یاد رہے اور نہ بھولے

اسی سے لفظ تذکر ہے جس کا معنی نصیحت لینا یا نصیحت حاصل کرنا ہے۔ قرآن کریم مین تذکر کو صاحب عقل ودانش کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے

اصطلاحی مفہوم

ابن عاشور قرآن کریم کی اصطلاح تذکر کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: التذكر مصدر الذكر، بضم الذال- وهو حضور الصورة في الذهن[2] (تذَکُّر، ذکر یذکر کا مصدر ہے، ذ کی فتحہ کے ساتھ ہے۔ جس کا معنی ذہن میں مذکورہ صورت کو حاضر کرنا)

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ قرآن کریم میں وارد کلمہ التذکر کا ایک مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

"والتذكر للثاني.. ويتفكر كل من له عقل فيعلم انه من الله ولا يتصور إتيانه من البشر"[3]

اس آیت کریم میں التذکر سے ہمارا بیان کردہ دوسرا مفہوم مراد ہو سکتا ہے کہ تمام اہل دانش غور کریں اور سمجھیں کہ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اس میں بشری قوتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ سعیدی لکھتے ہیں:

۱۔ ابن الفارس، مجمل اللغۃ، ۱/۳٦۰

۲۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۱/۲۲٦

۳۔ پانی پتی، ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ۳۲/۴

تذکُّر کا تعلق عقل کے ساتھ ہے اور کسی چیز سے نصیحت اس وقت حاصل کی جاتی ہے جب دل میں اللہ کا ڈر اور خوف پیدا ہوتا ہے اور یہ چیز صاحبان عقل کے ساتھ مخصوص ہے یعنی اکابر علماء کے ساتھ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب دل پر معصیت کے حجابات ہوں اس وقت تفکر کی ضرورت ہوتی ہے اور جب یہ حجابات اٹھ جائیں اس وقت تذکر کی ضرورت ہوتی ہے۔[۴]

قرآن مجید میں تذکر کا معنی نصیحت حاصل کرنا ہے، نصیحت لینے اور حاصل کرنے کا تعلق عقل سلیم کے ساتھ ہے، جاہل اور بے عقل آدمی نصیحت حاصل نہیں کر سکتا۔ جس دل میں تقویٰ اور خوف خدا ہو وہ ہی دل نصیحت قبول کر سکتا ہے، حکمت کا بھی یہی تقاضا ہے۔ تذکر کا تعلق ایسے علماء کے ساتھ ہے جن میں خشیت الٰہی کی صفت پائی جاتی ہے، کیوں کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾[۵]

اور اگر شمار کرو اللہ کی نعمتوں کو نہ پورا کر سکو گے ان کو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تذکر کا معنی نصیحت حاصل کرنا، اس کو صاحبان عقل کے ساتھ مخصوص کیا ہے، کیونکہ تذکر کا تعلق عقل کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم میں التذکر کا ایک معنی اپنی عملیہ کو صحیح اور درست کام مین لانا اور ان کی تکمیل کے لیے تگ و دو کرنا مراد لیا گیا ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے التذکر سے مراد قوت عملی لی ہے۔ یعنی انسانی معاشرے میں فتنہ و شر کے انسداد کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا اور اپنی طاقت اور استعداد کو کام میں لانا ہی قرآن کریم کا فلسفہ تذکر ہے۔[۶]

قرآن کریم کی اصطلاح التذکر حکمت ہی کی قریب المعنی اصطلاح ہے۔ ایمانی قوت کی زیادتی والے اور واقعات سے عبرت و نصائح حاصل کرنے والے اہل تذکر ہیں۔ جس طرح حکمت کی صفت ایمان کامل کی طرف لے جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی سے عبرت حاصل کرنے کے بغیر آگے نہیں بڑھتی اسی طرح تذکر کی بھی ایسی ہی صفات ہیں۔ ابن عاشور لکھتے ہیں:

"المراد التذكر الشامل الذي يزيد المؤمن عبرة وإيمانا"[۷]

صفت تذکر مومن کی عبرت حاصل کرنے اور ایمان کی قوت کو زیادہ کرتا ہے

آپ کے نزدیک تذکر کا تعلق باریک بینی سے کائنات کی اشیاء کے مطالعہ کرنے اور عقل کے ساتھ ہے۔

علامہ فیروزآبادی لکھتے ہیں:

"تدبر، تفکر اور تذکر کے تعلق قرآن کریم میں مذکور حکمت کے ساتھ ہے۔"[۸]

۴۔ دیکھیے: تبیان القرآن، ۱۵۵/۴

۵۔ النحل: ۱۸/۱۶

۶۔ دیکھیے: تفسیر عثمانی، ص ۳۱۰

۷۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۱۸۴/۸

۸۔ فیروزآبادی، ابوطاہر محمد بن یعقوب، بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز، ۲۷۰/۱

تذکر اور تدبر کا تعلق

ارشاد ربانی ہے:

﴿كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾[9]

یہ کتاب برکت والی ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے تاکہ دانش مند لوگ اس کی آیتوں میں غور وفکر کریں اور نصیحت حاصل کریں۔

قرآن کریم مختلف مقامات پر جس تذکر کی دعوت دی گئی ہے۔اس میں جہد مسلسل، غور وتدبر اور فکر کے تکرار کی ضرورت ہوتی ہے۔اور پھر تذکر بھی اس درجے کا ہو کہ اس میں اعتدال اور توسط ہو، امام آلوسی لکھتے ہیں:

''لا بد فيها من الاجتهاد والفكر الكثير حتى يقف على موضع الاعتدال وهو التذكر''[10]

جس میں حد درجہ غور وفکر اور اجتہاد ہو اور یہ کوشش اعتدال کے مقام پر لے جائے اس کو تذکر کہا جاتا ہے۔

امام آلوسی نے اس بات کی طرف زور دیا ہے کہ تذکر کے لیے کثرت سے غور وفکر کرنا اور اعتدال کی راہ پر رہنا ہی قرآنی تذکر ہے اور یہی قرآن کریم میں مذکور اصطلاح التذكر کا تقاضا ہے۔تذکر کے بعد بصیرت کی نعمت ملتی ہے، اس لیے کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ﴾[11]

جن کے دل میں ڈر ہے جہاں پڑ گیا ان پر شیطان کا گزر چونک گئے پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے

بصیرت کی آنکھ کھلنے کے لیے تذکر اس چیز کی طرف دھیان کرنا پڑتا ہے اور بار بار اپنی توجہ ایک خاص جانب مبذول کرنی پڑتی ہے، نواب صدیق حسن خان اپنی تفسیر میں تذکر کو بصیرت کی شرط اور وجہ قرار دیتے ہیں(فإذا هم) بسبب التذكر (مبصرون)[12]، یعنی جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو بصیرت کی نعمت اور خوبی ملے اسے چاہیے کہ وہ تذکر کو اپنا شعار بنالے۔

امام رازیؒ کے نزدیک قرآن کریم میں مذکور تذکر اور ذکر کا باریک سا فرق ہے، آپ لکھتے ہیں:

''التذكر وهو أن الصورة المحفوظة إذا زالت عن القوة العاقلة فإذا حاول الذهن استرجاعها فتلك المحاولة هي التذكر---- وهو أن التذكر صار عبارة عن طلب رجوع تلك الصورة الممحية الزائلة فتلك الصورة إن كانت مشعورا بها فهي حاضرة حاصلة الذكر فالصورة الزائلة إذا

۹۔ صٓ:۳۸/۲۹

۱۰۔ آلوسی، روح المعانی، ۲۹۹/۴

۱۱۔ الاعراف ۷/۲۰۱

۱۲۔ صدیق حسن خان، فتح البیان فی مقاصد القرآن، ۱۱۰/۵

حاول استرجاعها فإذا عادت وحضرت بعد ذلك الطلب سمي ذلك الوجدان-----هو التذكر الذي لا يحصل إلا لأولي الألباب[۱۳]"

وہ صورت جو عقل میں (پہلے کبھی) محفوظ تھی جب زائل ہو جائے اور ذہن اس کو لوٹانے کا ارادہ کرے تو یہ لوٹانے کا ارادہ کرنا تذکر ہے یعنی تذکر کا عمل یہ ہے کہ ذہن میں محو اور مٹ جانے والی صورت کو واپس لانا، جب کہ ذکر یہ ہے کہ زائل ہونے والی صورت کی واپسی کا جب ارادہ کیا اور وہ اس ارادہ کے بعد لوٹ آئی تو اس حالت کا نام ذکر ہے۔ تذکر کی صفت اولوالباب کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

ان آیات میں پہلے تذکر اور پھر تقویٰ کی ترغیب دی گئی ہے، امام رازی کے نزدیک تذکر کو تقوی پر فوقیت حاصل ہے اس لیے کہ جب وہ تذکر اور اس کی معرفت حاصل کرلے گا اور پھر اس کی تمام جزئیات اور ارکان سے واقف ہو جائے گا تو دینی اور دنیوی امور میں اس کو احتیاط اور تقویٰ کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔[۱۴]

خلاصہ

حکمت کا پہلو تذکر بھی قلب سلیم اور عقل سلیم کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کا تذکرہ ذکر، تذکر، اور ذکر کی صفات کے ساتھ ذکر کیا ہے، ثابت ہوا کہ تذکر بھی حکمت کی صفات میں سے ایک ہے۔ اور الحكمة کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

۱۳۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۵۹/۷

۱۴۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۴۵۰/۲۶

۴۔ التفکر

قرآن کریم میں مذکور اصطلاحات التفکر ،التدبر اورالتذکر[1] نہ صرف الحکمۃ کے قریب المعنی ہیں بلکہ یہ آپس میں بھی ہر ایک دوسرے کی قریب المعنی قرآنی اصطلاحات ہیں۔ تفکر کا تعلق بھی عقل کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم ہر شخص سے چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم ۔ تفکر کا تقاضا کرتا ہے ۔ اگرچہ اس کتاب حکیم سے ہدایت متقی لوگوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ قرآن اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اس میں فکر کرنے والے کی کوئی شخصی تخصیص نہیں ہے کہ پہلے ایمان لائے ، پھر اعمال صالحہ کرے اور پھر قرآن کریم میں فکر کرے ، بلکہ جو بھی انسان اس پہلو کی طرف سوچنا چاہتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق خود بخود ہوئی یا اس کی پیچھے کوئی ہستی کارفرما ہے ، پھر اس نظام کو کون چلا رہا ہے ، تو قرآن اسے دعوت فکر دیتا ہے کہ کائنات اور کائنات میں ہر ایک تخلیق میں فکر کرو اور دیکھو ، کون ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے۔ قرآنی اصطلاح التفکر ایک ایسی قوت اور صلاحیت اور ملکہ کا نام ہے جو حکمت کے اجزاء کا ایک جز اور اس کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔

لغوی معنی

تفکر لغت میں کسی کام کو بار بار دہرانے کے ہیں اور اس کے اندر مختلف زاویوں سے سوچنے کے ہیں۔ ابن فارس لکھتے ہیں :

> ''تردد القلب في الشيء. يقال: تفكر إذا ردّد قلبه معتبراً. ورجل فكّير: كثير الفكر''[2]
>
> تفکر دل کو کسی ایک جانب بار بار پھیرنے کو کہا جاتا ہے ، جب کسی کا دل بہت زیادہ غور وفکر میں مبتلا ہو ، رجل فکیر اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ سوچنے والا ہو ، یعنی معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر اس کی چھان بین کرنے والا ۔

اصطلاحی مفہوم

تفکر ایسی صلاحیت کا نام ہے کہ قلب یعنی دل کو اشیاء کے معانی (ان کی تہہ) کی طرف پھیرنا تاکہ اشیاء کی حقیقت تک رسائی حاصل ہو سکے ،اصطلاحات قرآنیہ تفکر کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اشیاء کی معرفت اور حقیت کو دل کے سامنے لانا (تاکہ کوئی حجاب باقی نہ رہے) ،علامہ جرجانی نے اسی طرح لکھا ہے :

> ''تصرّف القلب في معاني الأشياء؛ لدرك المطلوب، وقيل :هو إحضار ما في القلب من معرفة الأشياء''[3]

۱۔ قرآنی اصطلاحات التدبر اور التذکر کی تفصیل اس سے پہلے گزر چکی ہے۔

۲۔ ابن الفارس ، مجمل اللغۃ ،۱/ ۷۰۴

۳۔ دیکھیے : التعریفات للجرجانی ،۱/ ۶۰۷

دل کے اشیاء کے معانی کی طرف پھیرنا تاکہ مطلوب و مقصود حاصل ہو سکے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اشیاء کی معرفت کو دل کے سامنے لانے کا نام تفکر ہے۔

علامہ راغب اصفہانی کے نزدیک تفکر اس قوت کو کہتے ہیں جو علم کو معلوم کی طرف لے جانے والی ہو، تفکر کا معنی نظر اور عقل کے مطابق اپنی سوچنے اور غور و فکر کرنے کی قوت کو بڑھانے کے ہیں۔[۴] قرآن کریم میں فکر ، تفکیر اور تفکر کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کی تخلیق اور دن اور رات کی تبدیلی اور ان کی تغیر پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔

تفکر کے صحیح مقاصد اور فوائد تب ہی حاصل ہو سکتے ہیں جب انسان تفکر کو صرف دنیوی معاملات کے حصول تک ہی محدود نہ رکھے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کے فوائد کے لیے تفکر کرنا ضروری ہے تب ہی انسان عقل کامل اور صحیح علم تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن کریم اس تفکر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے مقاصد اشیاء کی معرفت ہو اور اللہ تعالیٰ کی کائنات میں پھیلی ہوئی نشانیوں سے عبرت اور سبق حاصل کرنے کے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر مکمل یقین حاصل کرنے کے لیے ہو۔ قرآن کریم ایسی فکر اور تفکر کا تقاضا کرتا ہے جس کا مقصد حق کی تلاش اور ہدایت کا حصول ہو، اگر تفکر کے مقاصد محض خواہشات کی اتباع اور اپنے ذاتی اغراض اور مقاصد ہوں تو تفکر میں وقت کے ضیاع کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوا۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾[۵]

وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں کہتے ہیں اے رب ہمارے تو نہ یہ عبث نہیں بنایا تو پاک ہے سب عیبوں سے سو ہم کو بچا دوزخ کے عذاب سے۔

امام بیضاوی لکھتے ہیں:

"ترك متابعة الهدى إلى متابعة الهوى فكأنه يعبده فلا يبالي بالمواعظ ولا يتفكر في الآيات فلا ينظر بعين الاستبصار والاعتبار"[۶]

۴۔ دیکھیے: الاصفہانی، راغب، المفردات فی غریب القرآن، ۱/۱۳۳

۵۔ آل عمران: ۱۹۱/۳

۶۔ البیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل، ۱۸۲/۵

تفکر میں ہدایت کو چھوڑ کر خواہشات نفسانی کی پیروی کرنا گویا خواہشات کو اپنا معبود بنانے کے مترادف ہے۔ اگر تفکر ایسا ہوا تو وعظ و نصیحت بھی فائدہ نہ دے گی اور نہ ہی آیات کے حقیقی مقاصد اور فوائد حاصل ہو سکیں گے۔ ایسے عمل سے عبرت اور بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی۔

اسی کی مزید وضاحت ابن عاشور ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"التفكر جولان العقل في طريق استفادة صحيح"

حقیقی علم کے حصول کے لیے عقل کے ذریعے سے بار بار کوشش کرنے کا نام تفکر ہے۔

علامہ سعیدی لکھتے ہیں:

"تفکر کا معنی ہے: الفاظ کے مطلوبہ معانی کی تلاش میں ذہن کو متوجہ کرنا۔"[7]

اس سے واضح ہوا کہ اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرنا جس سے علم صحیح تک اور اشیاء کی معرفت اور اشیاء کی حقیقتوں تک رسائی حاصل ہو سکے، اس عمل یا قوت کو تفکر کہتے ہیں۔ قرآنی اصطلاح (الحكمة) بھی اسی صلاحیت اور ملکہ کا نام ہے، اس طرح یہ اصطلاح (التفکر) بھی (الحكمة) کے قریب المعنی اصطلاح ثابت ہوتی ہے۔

تدبر اور تفکر میں فرق

اگر ان دونوں کا مفہوم غور و فکر کرنا اور دونوں ایک ہی عمل کا نام ہیں کہ دونوں میں اشیاء کی حقیقت تلاش کی جاتی ہے تو ان میں ضرور بالضرور فرق ہو گا اس لیے کہ قرآنی اعجاز ہے کہ ہر ایک لفظ اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے اور اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے قریب المعنی ہو سکتا ہے لیکن ہم معنی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی قرآنی اصطلاحات میں مترادف کا پہلو ہو سکتا ہے۔

قرآنی اصطلاح التدبر کا تعلق اشیاء کی حقیقت اور اَفعال کے انجام تک ہے جب کہ تفکر کا مطلب یہ ہے کہ دل کے ذریعے باریک بینی سے دلائل میں غور و حوض کرنا۔ فکر کا تعلق کائنات کی ان اشیاء کے ساتھ ہے جو وقوع پذیر ہو رہی ہیں اور جن کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جب کہ تدبر کا تعلق اس کے نتیجہ کے ساتھ ہے۔ جو کہ آیات قرآنیہ میں ظاہر ہوتا ہے۔

علامہ عسکری نے اپنی کتاب میں اس فرق کو اسی طرح واضح کیا ہے:

"إن التدبر: تصرّف القلب بالنظر في العواقب. والتفكر: تصرّف القلب بالنظر في الدلائل"[8]

تدبر کے عمل میں چیزوں یا اِمور کے انجام کی طرف توجہ کی جاتی ہے جب کہ تفکر کے عمل میں باریک بینی سے دلائل پر غور و فکر کیا جاتا ہے۔

امام آلوسی تفکر کے بارے میں لکھتے ہیں:

۷۔ سعیدی، تبیان القرآن، ۸۲/۴

۸۔ دیکھیے: العسکری، الفروق اللغویہ، ص ۷۵

"لأنها كانت لبيان الأحكام والمصالح والمنافع والرغبة فيها التي هي محل تصرف العقل والتبيين للمؤمنين فناسب التفكر"[9]

(آیت کریم میں فکر کرنے کی دعوت اس لیے دی گئی ہے) کہ احکام اور ان کی مصالح اور منفعتیں لوگوں کو پتہ چل سکیں اور اسی وجہ سے احکام کی ادائیگی میں ان کی رغبت بڑھے اس لیے کہ فکر کا محل عقل ہے ،اسی وجہ سے فکر اور تفکر کے مخاطبین مومنین کو بنایا گیا ہے تاکہ کہ وہ کماحقہ فکر اور تفکر کر سکیں۔

خلاصہ

قرآن کریم کی اصطلاح (التفکر) جتنے مقامات پر بھی استعمال ہوئی ہے ، ہر ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے قصص، آیات ، اور انعامات کے بعد ان بندوں کے لیے یہ اصطلاح استعمال فرمائی ہے جو ان قصص، آیات اللہ، انعامات باری تعالیٰ، ایام اللہ وغیرہ سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کی لگن اور شوق رکھتے ہیں۔ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر تفکر کر کے اللہ تعالیٰ کی پاکی ، اس کی الوہیت اور اس کی عظمت کا یقین کرنا اور ان سے ہدایت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ تفکر کرنے والا بار بار مختلف دلائل پر غور و فکر کرتا ہے اور اس سے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔اسی صحیح مقصد اور اچھی نیت کی وجہ سے اس کے تفکر کی صلاحیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید تقویت ملتی ہے اور وہ اس قوت و صلاحیت میں کامل ہو جاتا ہے۔ حتی کہ وہ کائنات میں پھیلی ہوئی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی نشانیوں پر کامل غور و فکر کر کے صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے۔اسی عمل کا نام حکمت بھی ہے ۔ تفکر بھی حکمت کی صلاحیت میں سے ایک صلاحیت ہے اور قرآنی اصطلاح (الحكمة) کے قریب المعنی اصطلاح ہے۔

۹۔ الآلوسی، روح المعانی،۱/۵۱۴

۵۔ السدید

لغوی معنی

السدید کا ایک معنی جو حق کی جانب مائل ہونے والی بات یا قول ہو، لفظ سد بمعنی سداد یعنی ایسی بات کرنا جس کا محل اور موقعہ ہو اور وہ بہترین اور مستقیم وصف کی حامل ہو۔ اہل عرب جب تیر اپنے نشانے پر صحیح لگے اور اپنی سمت اور نشانے سے ذرا بھی نہ ہٹے تو لفظ سدید کا استعمال کرتے ہیں۔

امام جعفر النحاس نے معانی القرآن میں لکھتے ہیں:

"أي سدادا و أي صدقا"[1]

سدیدا کا معنی سدادا ہے یعنی صدق اور سچی بات کہنے کے ہیں۔

یعنی قول اور عمل میں صاف اور سیدھی بات کرنا سدید ہے۔

قرآن کریم میں لفظ سداد کا ایک معنی دیوار یا پہاڑ کے معنی میں آیا ہے، جیسا کہ سورۃ الکھف میں ارشاد ربانی ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ﴾[2]

یہاں تک کہ جب وہ (ذوالقرنین) پہنچا دو پہاڑوں کے درمیان

اسی سورت میں دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا﴾[3]

تو کیا ہم تیرے لیے (جمع) کر دیں کچھ مال؟ تاکہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنادے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ سدیداً کا معنی دیوار اور آڑ کو بھی کہا جاتا ہے۔

اصطلاحی مفہوم

علامہ قرطبیؒ مالکیؒ لکھتے ہیں:

أَيْ قَصْدًا وَحَقًّا. وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: أَيْ صَوَابًا[4]

ایسا قول جو اعتدال پر ہو اور حق پر ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سدید سے مراد درست قول ہے۔

۱۔ النحاس، ابو جعفر النحاس (م ۳۳۸ھ)، معانی القرآن (بیروت: دار القلم، ۱۹۸۸)، ۳۸۲/۵

۲۔ الکہف: ۹۳/۱۸

۳۔ الکہف: ۹۴/۱۸

۴۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۲۵۳/۱۴

علامہ قرطبیؒ نے السدید کے معانی میں مختلف اقوال نقل فرمائے ہیں جو حکمت سارے کے قریب المعنی مترادفات میں سے ہیں۔آپ نے ایک قول یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ دو جھگڑا کرنے والوں کے درمیان صلح کرنے کو بھی سدید کہا جاتا ہے۔ لفظ سدید (تَسْدِيدِ السَّهْمِ) سے ہے یعنی صحیح نشانے پر تیر چلانا۔ لفظ سدید ہر ایسے شخص کے قول پر بولا جاتا ہے جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو اور ہر قول سدید سے مراد ایسا قول جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کیا گیا ہو۔ لفظ سدید تمام خوبیوں اور ہر حسن اخلاق کی چھوٹی بڑی خوبی اور کمال کو عام ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند ہے اور جسے معاشرے اور اہل معاشرہ میں پسند کیا جاتا ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا﴾[۱]

اور چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ کہ اگر چھوڑی ہے اپنے پیچھے اولاد ضعیف تو ان پر اندیشہ کریں یعنی ہمارے پیچھے ایسا ہی حال ان کا ہوگا، تو چاہیے کہ ڈریں اللہ سے اور کہیں بات سیدھی۔

ابن کثیر الدمشقی نے قول سدید کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

{قَوْلا سَدِيدًا} أَيْ: مُسْتَقِيمًا لَا اعْوِجَاجَ فِيهِ وَلَا انْحِرَافَ قَالَ عِكْرِمَةُ: الْقَوْلُ السَّدِيدُ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ.وَقَالَ غَيْرُهُ: السَّدِيدُ: الصِّدْقُ. وَقَالَ مُجَاهِدٌ: هُوَ السَّدَادُ. وَقَالَ غَيْرُهُ: هُوَ الصَّوَابُ. والكل حق [۲]

قول سدید سے مراد یہ ہے کہ بات بالکل صاف، سیدھی، سچی، اچھی بولا کریں عکرمہ فرماتے ہیں قول سدید لا الٰہ الا اللہ ہے۔ حضرت خباب فرماتے ہیں سچی بات قول سدید ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں ہر سیدھی بات قول سدید میں داخل ہے۔

علامہ المراغی لکھتے ہیں

''القول الصدق الذي يراد به الوصول إلى الحق قولا قاصدا غير جائر، حقا غير باطل، يوفقكم لصالح الأعمال''[۳]

حکمت کا بھی ایک معنی یہ ہے کہ حق اور کھری بات کہنا اور ظاہر اور باطن کے موافق قول کرنا جس میں نفاق نہ ہو۔

یعنی قول سدید سے مراد ایسا قول یا ایسی بات جو حق کی طرف لے جائے جس میں دھوکہ دہی، نفاق، باطل کی آمیزش نہ ہو۔ جو بات اعمال صالحہ کے موافق ہوں وہ ہی قول سدید ہیں۔

۱۔ النساء: ۹/۴

۲۔ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ۴۸۷/۶

۳۔ المراغی، احمد بن مصطفیٰ، تفسیر المراغی، ۴۶/۲۲

حکمت سے حق مقصود ہوتا ہے اور اس آیت کریمہ میں بھی سدید سے ایسا قول یا ایسی بات کرنا مقصود ہے جو حق اور سچ ہو۔ پھر مزید یہ ہے لوگوں کو غیر عدل اور غیر حق سے روکنا اور میانہ روی اور عدل سے مزین گفتگو کرنا بھی السدید ہے۔ علامہ محمود نسفی نے سدیدا کا وہ ہی معنی لکھا ہے جو حکمت کا ہے یعنی:

''والبعث على أن يسددوا قولهم في كل باب لأن حفظ اللسان وسداد القول رأس كل خير''[1]

لوگوں کو اس بات کی ترغیب دلانا کہ وہ حق اور سچ بات کہیں اور اپنی زبان کی حفاظت کریں اس لیے کہ درست بات (حکمت بھری بات) کہنا ہر خیر کی جڑ ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا﴾[2]

اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور کہو بات سیدھی

اسماعیل حقی لکھتے ہیں:

''وخص القول الصدق بالذكر وهو ما أريد به وجه الله ليس فيه شائبة غير وكذب أصلا ---- فلا يدخل فيها وقال بعضهم القول السديد داخل فى التقوى وتخصيصه لكونه أعظم أركانها''[3]

(کلمہ) سدید کا اطلاق اس جگہ پر ہوتا ہے جہاں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو۔ اس میں نہ غیر کی ملاوٹ ہو اور نہ کذب کی شائبہ ہو۔ جس کی اندر تقوی کی دولت ہو گی وہ قول سدید ہی اختیار کرے گا اور ان اِمور کا ارتکاب نہیں کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی سزا کو لازم کرنے والی ہوں۔ بعض کے نزدیک کلمہ السدید تقوی میں داخل ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ لفظ سدید کا الگ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ سدید تقویٰ کا بہت بڑا رکن ہے۔

ثابت ہوتا ہے کہ ان آیات کی روشنی میں قرآن کریم میں مذکور کلمہ سدّ، سدّاد، اور سدّید کا معنی روکنا، دیوار بنانا کے ساتھ ساتھ یہ بھی مراد ہے کہ ایسا قول جو حق و باطل، سچ اور جھوٹ کے درمیان دیوار کی مانند ہو۔ اور حکمت کا ایک معنی بھی روکنا، لگام دینا کے ہیں یعنی ظلم، فساد، برائی وغیرہ سے رکنے کا نام بھی حکمت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ (السدید) قرآنی اصطلاح بھی (الحکمة) کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

قول سدید اور تقوی

عبدالماجد دریاآبادی لکھتے ہیں:

۱۔ النسفی، محمود، تفسیر مدارک التنزیل، ۴۸/۳

۲۔ النساء: ۹/۴

۳۔ الحقی، روح البیان، ۲۹۹/۳

''افراط و تفریط سے الگ اور عدل و اعتدال کے مطابق بات جچی تلی اور پکی منہ سے نکالو۔'' قول سدید تو خود بھی تقویٰ ہی کی ایک فرد ہے، خصوصیت کے ساتھ اس کے الگ بیان کرنے سے مقصود زبان کی اہمیت کو ظاہر کرنا ہے، جہاں تک اعضاء وجوارح کا تعلق ہے جو اہمیت و مرکزیت وہمہ جہتی زبان کو حاصل ہے۔ کسی اور عضو کو نصیب نہیں اور یہ اگر قابو میں آگئی تو انسان گناہوں کی کتنی بڑی تعداد سے بچ سکتا ہے۔[۱]''

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''قرآن کریم نے اس جگہ صادق یا مستقیم وغیرہ کے الفاظ چھوڑ کر سدید کا لفظ اختیار فرمایا، کیونکہ لفظ سدید ان تمام اوصاف کا جامع ہے آپ نے روح البیان کے حوالے سے لکھا ہے کہ قول سدید وہ قول ہے جو سچا ہو جھوٹ کا اس میں شائبہ نہ ہو، صواب ہو جس میں خطاء کا شائبہ نہ ہو، ٹھیک بات ہو، ہزل یعنی مذاق و دل لگی نہ ہو، نرم کلام ہو دلخراش نہ ہو۔''[۲]

ڈاکٹر اسرار قرآن کریم کی اصطلاح السدید کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے درج بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''السدید سے مراد یہ ہے کہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ گفتگو میں بھی راست گوئی اور راست بازی کا خیال رکھو''[۳]

آپ کے نزدیک السدید کا معنی سچی اور کھری بات کے ہیں اور ہمارا مدعا بھی یہ ہے کہ حکمت کا ایک معنی حقیقت کے مطابق بات کرنا اور ظاہر و باطن میں یکسانیت کا نام حکمت ہے اور السدید بھی حکمت کی صفات میں سے ایک ہے۔ الیاس گھمن قول سدید اور قول صواب میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قول سدید اس کو کہتے ہیں جس میں کذب نہ ہو جب کہ قول صواب اس قول کو کہتے ہیں جس میں خطا نہ ہو۔''[۴]

اس اعتبار سے بھی سدید کا معنی سچی بات جو حقائق کے عین مطابق ہو، لہذا یہ صلاحیت اور ملکہ بھی حکمت سے ہی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی بیان کردہ یہ صفت بھی حکمت کی صلاحیتوں میں سے ایک ہے۔

جس طرح حکمت بھی دعوت الی اللہ کے طریقوں اور اصولوں میں سے سب سے پہلا اِصول اور لوگوں کے اصلاحِ اِحوال کا ایک طریقہ ہے علامہ کاندھلوی کے نزدیک آیت کریمہ میں اصلاح کے دو طریقے ذکر فرمائے ایک تقویٰ اور ایک قول سدید۔ تقویٰ کے معنی خوف خداوندی کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے اور قول سدید یعنی ٹھیک بات کہنا اس کا تعلق

۱۔ دریاآبادی، تفسیر ماجدی، ۱۸۸/۳

۲۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۷۷/۴

۳۔ اسرار احمد، بیان القرآن، ۱۹۴/۴

۴۔ گھمن، الیاس، تفسیر دروس القرآن، مکتبہ اہل السنہ والجماعہ، ۲۲۱/۴

زبان سے ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان باتوں کو اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمادیں گے جب قلب درست اور زبان درست ہو جائے تو لامحالہ باقی اعمال درست ہو جائیں گے۔ اعمال کا دارومدار انہی دو چیزوں پر ہے ایک دل اور ایک زبان جب یہ دونوں درست ہو جائیں گے تو باقی بھی درست ہو جائیں گے۔ تمام اعضا میں سب سے زیادہ تیز اور رواں زبان ہے ہر عضو تھک جاتا ہے مگر زبان بولنے سے نہیں تھکتی۔[1]۔ السدید کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہر وہ کام جس کو تم کرتے ہو اور جس کو تم ترک کرتے ہو ان میں تم اللہ سے ڈرا کرو، خاص طور پر ان کاموں کو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں، چہ جائیکہ ایسے کام کر دیا ایسی باتیں کہو جن سے اللہ کے رسول اور اس کے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اذیت پہنچے۔[2]

حدیث مبارکہ کے مطابق بھی سدید کا معنی درست اور سیدھا ہونے کے آتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"قُلِ اللهُمَّ اهْدِنِي وَسَدِّدْنِي، وَاذْكُرْ، بِالْهُدَى هِدَايَتَكَ الطَّرِيقَ، وَالسَّدَادِ، سَدَادَ السَّهْمِ"[3]

یوں کہو کہ اے اللہ! مجھے ہدایت دے اور سیدھا کر دے اور ہدایت کی دعا کرتے ہوئے صحیح راستے پر جانے کو دل میں رکھو اور سیدھا کرنے کی دعا کرتے ہوئے تیر کے سیدھا کرنے کو دل میں رکھو۔

امام نووی اس حدیث مبارکہ کی شرح کرتے ہوئے سداد کے مفہوم کو یوں واضح کرتے ہیں:

"وأصل السداد الاستقامة والقصد في الأمور"[4]

سداد استقامت اور اِمور میں باقاعدہ سعی اور کوشش کرنے کا نام ہے۔

استقامت اور اِمور کو کامل توجہ اور سعی سے انجام دینے کا نام سداد ہے اور اسی کا نام حکمت اور حکمت عملی بھی ہے۔

خلاصہ

قرآن کریم میں موجود اصطلاح السدید کے مفہوم سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی صلاحیت اور قوت کا نام ہے جس میں انسان کے اندر استقامت، ارادے اور فیصلوں میں استحکام، مسلسل جدوجہد کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، اس اعتبار سے قرآن کی اصطلاح الحکمۃ کا مفہوم اور معنی بھی اس کے قریب قریب ہے۔ حکمت کے جتنے بھی مفہوم ذکر کیے گئے ہیں ان میں ایک معنی یہ بھی ہے جو السدید کا کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ اصطلاح بھی الحکمۃ کے قریب المعنی اصطلاح ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ کاندھلوی، ادریس، معارف القرآن، ۸۷/۵

۲۔ سعیدی، تبیان القرآن، ۱۶۶/۳

۳۔ القشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، الذکر والدعاء، باب فی الأدعیۃ، کتاب العلم: ۲۷۲۵

۴۔ النووی، ابوزکریا یحی بن شرف، المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۳۹۲ھ، ۹۲/۱۳

۶۔ العقل

قرآن کریم کی ایک اصطلاح (العقل) بھی قرآن کریم میں اکثر مقامات پر وارد ہوئی ہے۔(العقل) بھی حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔اکثر مفسرین کے نزدیک (العقل) ایک جوہر نورانی ہے۔

لغوی معنی

علامہ جرجانی لکھتے ہیں:

''جوهر روحاني خلقه الله تعالى متعلقًا ببدن الإنسان، وقيل: العقل: نور في القلب يعرف الحق والباطل''[1]

عقل ایک جوہر روحانی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بدن سے متعلق کر کے پیدا کیا ہے۔ عقل دل میں ایک ایسا نور ہے جو حق اور باطل کی معرفت رکھتا ہے۔

علامہ راغب اصفہانی کے مطابق

''وأصل العَقْل: الإمساك والاستمساك، كعقل البعير بالعِقَال'' [2]

عقل کا لغوی معنی رکنا اور منع کرنا کرنے کے ہیں۔ عقل کو عقل اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بری باتوں سے روکتی ہے' رسی کو بھی عقل کہتے ہیں اور رسی سے باندھنے کو بھی عقل کہتے ہیں۔اسی وجہ سے مقتول کی دیت ادا کرنے والوں کو بھی عاقلہ کہا جاتا ہے۔

اصطلاحی مفہوم

قرآن کریم میں وارد درج ذیل اصطلاحات بھی عقل [3] کے ہم معنی استعمال ہوئی ہیں:

۱۔ الألباب (وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ) [4]

۲۔ النهي (إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ) [5]

---

۱ ۔ الجرجانی، التعریفات، ۲۸۸/۳

۲ ۔ الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ۷۲/۲

۳ ۔ قرآن کریم میں فعل (العقل) کا صیغہ مختلف مشتقات ﴿تَعْقِلُونَ﴾، ﴿يَعْقِلُونَ﴾، ﴿ يَعْقِلُهَا﴾، ﴿نَعْقِلُ﴾، ﴿عَقَلُوهُ﴾ انچاس مرتبہ استعمال ہوا ہے۔﴿ تَعْقِلُونَ ﴾کا صیغہ ۲۴ مرتبہ استعمال ہوا ہے جب کہ ﴿ يَعْقِلُونَ ﴾کا صیغہ ۲۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ (دیکھیے: فواد عبدالباقی، المعجم المفہرس لألفاظ القرآن الکریم، ۴۸۷/۳)

۴ ۔ البقرہ: ۲۶۹/۲

۵ ۔ طٰہٰ: ۵۴/۲۰

۳۔ القلب (لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُونَ بِهَا)[1]

۴۔ الفؤاد (مَا كَذَبَ الفُؤَادُ مَا رَأَى)[2]

۵۔ الحِجر (هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِذِي حِجْرٍ)[3]

قرآن کریم میں العقل کی اصطلاح بھی حکمت کے قریب المعنی استعمال ہوئی ہے۔ اس لیے کہ حکمت کا ایک معنی عقل بھی ہے، سید محمد مرتضی زبیدی لکھتے ہیں:

اَلْحِكْمةُوَهُوَ المنْع لمنعِه صاحِبَه ممّا لَا يَلِيق"[4]

حکم کے معنی ہیں منع کرنا' حکمت کو حکمت اس لیے کہتے ہیں کہ عقل اس کے خلاف کرنے کو منع کرتی ہے

لہٰذا واضح ہوا کہ اصطلاح قرآنی العقل بھی حکمت کی ہم معنی قرآنی اصطلاح میں سے ہے۔ امام ماتریدی نے بھی جہالت، سفاہت، شر کے مقابلے میں حکمت اور عقل کا استعمال فرمایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"لا لين يعرف الحكمة من السفه، والولاية من العداوة، والخير من الشر، والرغبة من الرهبة، لا معنى له بما فيه تضييع الحكمة، وجمع بين الذي حقه التفريق في الحكمة والعقل، وذلك آية السفه"[5]

کوئی نرمی ایسی نہیں ہے جو حکمت کو حماقت سے، وفاداری کو دشمنی سے، نیکی کو برائی سے اور خواہش کو خوف سے جانتی ہو، اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ اشیاء حکمت کو ضائع کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ اور وہ ان چیزوں کو جوڑتی ہے جو حکمت اور عقل میں فرق کرنے کا حق رکھتی ہے، اور وہ جہالت ہے۔

امام طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے العقل کا معنی (أَفَلَا تَعْقِلُونَ) أَفَلَا تَفْقُهُونَ وَتَفْهَمُونَ)[6] تفقہ اور تفہم سے کیا ہے۔

قرآن کریم کی آیت کریمہ

﴿أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُم بِهَٰذَا ۚ أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ﴾[7]

کیا ان کی عقلیں انہیں یہ (بے عقلی کی باتیں) سُجھاتی ہیں یا وہ سرکش و باغی لوگ ہیں۔

میں لفظ احلام جس کا معنی عقل (عقول) آتی ہیں۔ اس سلسلے میں محی الدین درویش لکھتے ہیں:

۱۔ الاعراف: ۱۷۹/۷

۲۔ النجم: ۱۱/۵۳

۳۔ الفجر: ۵/۸۹

۴۔ الزبیدی، تاج العروس، ۹۸/۴

۵۔ الماتریدی، ابو منصور محمد بن محمد بن محمود، تاویلات اہل السنہ، ۵۵۸/۲

۶۔ الطبری، جامع البیان ۳۳۶/۱

۷۔ الطور: ۳۲/۵۲

"والأحلام جمع الحلم وهو الإمهال الذي يدعو إليه العقل والحكمة"[1]

احلام حلم کی جمع ہے یعنی مہلت دینا۔ یہ عقل اور حکمت کی طرف بلاتی ہے۔

جس طرح اہل لغت نے العقل کے لغوی معنی منع کرنے اور بندش کے لکھے ہیں۔ اسی طرح مفسرین کرام نے بھی حکمت کے قریب المعنی اصطلاح ہونے کی حیثیت سے عقل کے معانی ذکر فرمائے ہیں۔ علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

"ومنه العقل في الديت لأنه يمنع ولى المقتول من قتل الجانى والعقل نقيض الجهل"[2]

دیت میں عقل کا معنی روکنا اور باز رکھنا کے ہیں۔ اس لیے کہ یہ عقل[3] مقتول کی زبان کو بند رکھتی ہے (یعنی خون ریزی سے روکتی ہے)، عقل جہالت کی ضد ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو ذہنی قوت انسان کو بُرے کام سے روکے اس کو عقل کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عقل بھی حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔ عقل بھی حکمت کی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت کا نام ہے یعنی جس کو عقل عطا کی گئی اس کو حکمت کا ایک جُز عطا کیا گیا۔

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ﴾[4]

اللہ نے صرف انہی لوگوں کی توبہ قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے جو نادانی کے باعث برائی کر بیٹھیں

کے تحت علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

"لأنّ ارتكاب القبيح مما يدعو إليه السفه والشهوة، لا مما تدعو إليه الحكمة والعقل"[5]

کہ قبیح گناہ کرنا جہالت اور شہوت کی طرف رغبت دلاتا ہے اور یہ کام حکمت اور عقل کے خلاف ہے۔

آپ نے اس مقام پر حکمت اور عقل کو ہم معنی کے طور پر ذکر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اصطلاح قرآنی العقل حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

حکمت اور عقل دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے جس طریقے پر امن اور اصلاح کی بات کی ہے اس طریقے پر امن اور معاشرے کی اصلاح کی جائے اور معاشرے اور اہل معاشرہ کو فتنہ اور شر انگیزی سے دور رہنے کی طریقے اختیار کیے جائیں۔ قرآن کریم میں عقل کا یہی فلسفہ ہے اور حکمت کا بھی یہی مفہوم ہے۔

قرآن کریم کی روشنی میں العقل کا مفہوم یہ ہے کہ ایسی عقل جس میں خطا اور غلطی نہ ہو جب کہ حکمت کا بھی ایک مفہوم یہ ہے کہ ایسی عقل و دانش جو درست اور صواب پر مبنی ہے جس کے دور اندیشی، مصلحت، تدبیر اور تدبر، فکر اور تفکیر ہو،

۱۔ الدرویش، محی الدین بن احمد مصطفیٰ، اعراب القرآن وبیانہ، ص ۴۶۵

۲۔ الشوکانی، فتح القدیر، ۷۸/۱

۳۔ فقہ کی اصطلاح میں عاقلہ وہ لوگ ہیں جو قاتل کی خطا پر عائد دیت کا بوجھ برداشت کرتے ہیں۔ (سُرخسی، المبسوط، ۱۲۵/۲۷)

۴۔ النساء: ۱۷/۴

۵۔ الزمخشری، الکشاف، ۲۳۳/۴

علامہ رازی کے نزدیک اس آیت کریمہ ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ﴾ کے تحت حکمت اور عقل کا ایک ہی مفہوم مراد لیا ہے۔

آپ لکھتے ہیں:

''وَلَا شَكَّ أَنَّ حُكْمَ الْحِكْمَةِ وَالْعَقْلِ هُوَ الْحَكَمُ الصَّادِقُ الْمُبَرَّأُ عَنِ الزَّيْغِ وَالْخَلَلِ، وَحُكْمَ الْحِسِّ وَالشَّهْوَةِ وَالنَّفْسِ تُوقِعُ الْإِنْسَانَ فِي الْبَلَاءِ وَالْمِحْنَةِ فَكَانَ حُكْمُ الْحِكْمَةِ وَالْعَقْلِ أَوْلَى بِالْقَبُولِ''[1]

حکمت اور عقل (سلیم) دونوں ہی ایسے سچائی کے راستے کی متلاشی ہیں جو انحراف اور عیب سے پاک ہو۔ اور انسانی لالچ، شہوت اور نفس انسان کو تکلیفوں اور آزمائشوں میں ڈال دیتی ہے۔ پس اولی یہ بات ہے کہ حکمت اور عقل کا حکم کو قبول کیا جائے۔

علامہ سراج الدین حنبلی (م ۷۵۰ھ) نے اپنی تفسیر میں حکمت اور عقل کو ہم معنی لکھا ہے[2]۔ علامہ نظام الدین نیشاپوری (م ۸۵۰ھ) نے بھی حکمت اور عقل کو مترادفات میں ذکر فرمایا ہے[3]۔ علامہ شربینی شافعی (م ۹۷۷ھ) نے بھی حکمت اور عقل کو ہم معنی مراد لیا ہے[4]۔

شیخ طوسی لکھتے ہیں:

''والفرق بين الحكمة والعقل: أن العاقل هوالعاقد على مايمنع من الفساد، والحكيم هوالعارف بمايمنع من الفساد''[5]

عقل اور حکمت میں فرق یہ ہے کہ عقل مند وہ ہے جو فساد اور نقصان دینے والے چیزوں کو روکے اور حکیم وہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ فساد اور قبیح امور کیا ہیں اور ان سے کیسے بچا جا سکتا ہے، معرفت اور عقل مستقیم کے درمیان حکمت مشترک چیز ہے اس لیے کہ یہ دونوں قبیح امور سے بچاتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ قرآنی اصطلاح العقل بھی الحکمۃ کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

علامہ وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

''السفه والخفة التي تقابل الحكمة والعقل''[6]

جہالت اور سستی اور کاہلی حکمت اور عقل کے مقابل ہیں۔

۱۔ رازی، مفاتیح الغیب ۳۳/۳

۲۔ عادل النعمانی، سراج الدین، اللباب فی علوم الکتاب، ۴۳۳/۱۱

۳۔ النیشاپوری، نظام الدین، غرائب القران ورغائب الفرقان، ۴۷/۲

۴۔ الشربینی، شمس الدین محمد بن احمد الخطیب، السراج المنیر فی الإعانة علی معرفة بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر (بیروت: دارالکتب العربیہ ۱۴۱۳ھ)، ۱/۲۷۹

۵۔ الطوسی، التبیان فی تفسیر القرآن، ۶/۴۴۱

۶۔ الزحیلی، وھبہ بن مصطفیٰ، التفسیر المنیر، ۴/۲۳۱

جس طرح حکمت کے مقابل جہالت اور خفت ہے اسی طرح عقل کے مقابل جہل اور جہالت ہے، علامہ زحیلی کے نزدیک بھی حکمت اور عقل کا ایک ہی مفہوم ہے۔

العقل کا مفہوم روکنا اور کنڑول کرنا کے ہیں جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان غفلت اور نفسانی خواہشات کر روکے اور عقل کو غلط استعمال ہونے سے کنڑول کرے، اسی اعتبار سے العقل حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔[1]

خلاصہ

انسانی معاشرے میں عقل کو قیاس، آراء اور اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم جس عقل کا تقاضا کرتا ہے وہ حکمت سے مزین عقل ہے۔ قرآن کریم کے مطابق عقل انسانی اور راہ ہدایت یا معرفت الٰہی کے درمیان کوئی حجاب اور تضاد نہیں ہے بلکہ جہاں عقل ہے وہاں معرفت الٰہی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت، راہ حق کی پہچان، گمراہی کی تمیز، خیر و شر کے درمیان فرق اور اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان رشتہ اور تعلق کو سمجھنے کے لیے قرآن ایک ایسی حکمت کا تقاضا کرتا ہے جو انسانی جسم کے اندر built in میں رکھی گئی ہے یعنی جس طرح کمپیوٹر میں ایک پروسیسر بلٹ ان میں رکھا جاتا ہے اسی طرح ایک ایسی نور اور خوبی اور حکمت جو انسانی جسم کے اندر رکھی گئی ہے وہ عقل ہے، قرآن کریم یہ تقاضا کرتا ہے کہ کتاب الٰہی اور اللہ کے رسولوں کے احکامات کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے ایک ایسا نور جو اس کو معرفت الٰہی کی طرف راغب کرتا ہے وہ عقل ہے، اگر اس نے اس کو حکمت سے کام لیا تو یہ حکمت ہی ہو گی ورنہ عقل محض ہو گی۔

---

۱ ۔ وضاحت کے لیے دیکھیں: مودودی، تفہیم القرآن، ۱۲۹/۵

۷۔ الفرقان

قرآن کریم کی اصطلاح (الفرقان) نو مقامات پر وارد ہوئی ہے۔ایک مقام پر تورات کو فرقان کہا گیا ہے اور جنگ بدر کو فرقان کہا گیا ہے اور ایک جگہ قرآن کریم کو بھی فرقان کا لقب دیا گیا ہے، مومن کو جو نور حق و باطل میں فرق کرنے کا دیا جاتا ہے اسے بھی فرقان کہا گیا ہے۔

لغوی معنی

الفرقان کا معروف معنی یہ ہے کہ جو حق اور باطل کے درمیان تمام تر فرق اور امتیاز کو واضح طور پر بیان کرے یا حد فاصل کرے۔ابن فارس الفرقان کے معنی کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"فَرَقَ بِهِ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ"[1]

فرقان کا معنی جو حق اور باطل میں تمیز کردے

آپ کے نزدیک اسی وجہ سے قرآن کریم نے جنگ بدر میں مسلمانوں کو کامیاب ہوئے اور قرآن کریم نے اس دن کو یوم الفرقان کا نام دیا[2]۔

اصطلاحی مفہوم

اُردو کے تمام مترجمین نے اس آیت کریمہ میں اصطلاح "فُرْقَانًا" کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

۱۔ حق باطل میں تمیز کی قوت

۲۔ ایسی کسوٹی جو برائیوں سے دور کردے[3]

۳۔ فرقان عطا کرے گا[4]

۴۔ فیصلہ کن بات[5]

۵۔ کفار سے الگ اور ممتاز[6]

---

۱ ۔ ابن الفارس، مقاییس اللغۃ، ۴/۴۹۴

۲ ۔ ﴿إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز، یعنی دونوں فوجوں کی مڈ بھیڑ کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی، (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو) اللہ ہر چیز پر قادر ہے) (الانفال ۸/۴۱)

۳ ۔ المودودی، ۵/۳۵، قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۴/۱۳۳

۴ ۔ وحید الدین خان، تذکیر القرآن، ۳/۱۲۲

۵ ۔ سواتی، معالم القرآن، ۵/۲۰۲

۶ ۔ غلام رسول سعیدی، تبیان القرآن، ۴/۴۹

۶۔ فیصلہ کرنے والے چیز لکھا۔[1]

ان تراجم سے واضح ہوتا ہے کہ الفرقان بھی الحکمۃ کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے اور اس کے ارکان میں سے ایک رُکن ہے۔

سورۃ الانفال میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[2]

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اتاری اپنے بندے پر فیصلہ کے دن جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے ابن إسحاق کی بیان کردہ تفسیر کے مطابق لکھتے ہیں:

''وفق لمعرفة الحق من الباطل ، فكان ذلك سبب نصره ونجاته ومخرجه من أمور الدنيا ، وسعادته يوم القيامة ، وتكفير ذنوبه – وهو محوها – وغفرها : سترها عن الناس – سببا لنيل ثواب الله الجزيل''[3]

''فرقان سے مراد نجات ہے دنیوی بھی اور اخروی بھی اور فتح و نصرت غلبہ و امتیاز بھی مراد ہے۔ جس سے حق و باطل میں تمیز ہو جائے۔ بات یہی ہے کہ جو اللہ کی فرماں برداری کرے۔ نافرمانی سے بچے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔ جو حق و باطل میں تمیز کر لیتا ہے، دنیا و آخرت کی سعادت مندی حاصل کر لیتا ہے اس کے گناہ مٹ جاتے ہیں لوگوں سے پوشیدہ کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اللہ کی طرف سے اجر و ثواب کا وہ کامل مستحق ٹھہر جاتا ہے۔''

علامہ ثناء اللہ پانی پتیؒ لکھتے ہیں

''فرقان سے مراد وہ نصرت ہے جس سے اہل حق اور باطل پرستوں میں فرق ہو جاتا ہے' اہل ایمان کو باعزت اور اہل کفر کو ذلیل کر دیا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: یعنی اللہ تعالیٰ دونوں جہان میں متقیوں کیلئے تمام خطرات اور ہولناکیوں سے بچاؤ کا راستہ بنا دے گا۔ مقاتل بن حیان نے کہا کہ دین میں شبہات و شکوک واقع ہونے سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتادے گا۔ مقاتل کا قول اول الذکر تفسیر کے قریب ہے (جس میں فرقان سے بصیرت قلبی مراد قرار دی گئی ہے) عکرمہ نے نجات اور ضحاک نے ثبات فرقان کا ترجمہ کیا

---

۱ ۔ اشرف علی تھانوی، بیان القرآن، ص ۴۲۷

۲ ۔ الانفال: ۴۱/۸

۳ ۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱۸۶/۵

ہے۔ابن اسحاق نے کہا: یعنی حق و باطل میں فیصلہ کر دے گا جس سے تمہاری حقانیت ظاہر اور تمہارے مخالفوں کی باطل پرستی ثابت ہو جائے گی۔[1]

فرقان کی تفسیر ابوالکلام آزاد نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

> ''اس آیت کریمہ میں لفظ فرقان سے معلوم ہوا کہ جو جماعت متقی ہو گی اس میں حق و باطل اور خیر و شر کے امتیاز کی ایک خاص قوت پیدا ہو جائے گی اور اس لیے کبھی باطل و شر کی طرف قدم نہیں اٹھائے گی۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اس اعتبار سے صدر اول کے مسلمانوں کا کیا حال تھا؟ عرب کے صحرا نشین جن کی ساری زندگیاں اونٹ چرانے میں بسر ہوئی تھیں یکایک ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں کی قسمتوں کے مالک ہو گئے لیکن خیر و شر میں امتیاز کی ایک ایسی قوت ان کے قبضہ میں آ گئی تھی کہ جو کچھ کرتے تھے اور جس طرح کرتے تھے، وہ حق و عداوت اور خیر و سعادت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔''[2]

یہ فرقان وہی چیز جس کو معرفت یا بصیرت کہا جاتا ہے۔ بصیرت کسی آدمی میں وہ اندرونی روشنی پیدا کرتی ہے کہ وہ ظاہری پہلوؤں سے دھوکا کھائے بغیر ہر بات کو اس کے اصل روپ میں دیکھ سکے۔ جب بھی کوئی آدمی کسی معاملہ میں اپنے کو اتنا زیادہ شامل کرتا ہے کہ وہ اس کی پروا کرنے لگے۔ وہ اس کے بارے میں اندیشہ ناک رہتا ہو تو اس کے بعد اس کے اندر ایک خاص طرح کی حساسیت پیدا ہوتی ہے جو اس کو اس معاملہ کے موافق اور مخالف پہلوؤں کی پہچان کرا دیتی ہے۔ یہ فرقانی معاملہ ہر ایک کے ساتھ پیش آتا ہے خواہ وہ ایک مذہبی آدمی ہو یا ایک تاجر اور ڈاکٹر اور انجینئر۔ کوئی بھی آدمی جب اپنے کام سے تقوی (کھٹک) کی حد تک اپنے کو وابستہ کرتا ہے تو اس کو اس معاملہ کی ایسی معرفت ہو جاتی ہے کہ ادھر ادھر کے مغالطوں میں الجھے بغیر وہ اس کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔[3]

کسی آدمی کے اندر یہ خدائی بصیرت (فرقان) پیدا ہونا اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ وہ برائیوں سے بچے، وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرے اور بالآخر خدا کے فضل کا مستحق بن جائے۔ یہ فرقان (حق و باطل کی نفسیاتی تمیز) پیدا ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی اپنے آپ کو حق کے ساتھ اتنا زیادہ وابستہ کر چکا ہے کہ اس میں اور حق میں کوئی فرق نہیں رہا۔

عبدالماجد دریاآبادی لکھتے ہیں:

> ''فرقان کی تشریح اہل تفسیر نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ لیکن بہتر ہو گا کہ لفظ ان سب مفہوموں کا جامع سمجھا جائے اور ہدایت اور نور قلب جس سے حق و باطل میں فیصلہ ہو جائے اور غلبہ علی الاعداء اور نجات آخرت جس سے حق و باطل میں عملی فیصلہ ہو جائے سب کو شامل رہے۔''[4]

۱۔ پانی پتی، تفسیر مظہری، ۳۸۵/۴

۲۔ آزاد، ترجمان القرآن، ۱۲۳/۴

۳۔ وحیدالدین خان، تذکیر القرآن، ۱۶۶/۳

۴۔ دریاآبادی، تفسیر ماجدی، ۸۸/۴

آپ کی تفسیر سے واضح ہوتا ہے کہ فرقان سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ حکمت ہے جس کو فرقان کا نام دیا گیا ہے۔اور یہ بھی واضح ہوا ہے کہ قرآنی اصطلاح الفرقان حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾[1]

اے ایمان والو اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو کردے گا تم میں فیصلہ اور دور کردے گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

پیر کرم شاہ تفسیر مظہری کے حوالے سے فرقان سے مراد صوفیاء کے نزدیک کشف مراد لیتے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

"فرقان مصدر ہے اور حق و باطل میں تمیز کرنے والی قوت کو فرقان کہتے ہیں۔ ای بصیرة فی قلوبکم تفرقون بین الحق والباطل، عارفین کاملین کا ارشاد ہے کہ ذکر الٰہی سے ایک نور پیدا ہوتا ہے جس سے حقائق اشیاء منکشف ہو جاتی ہے۔ اور غلط و صحیح میں فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ (ویسمی هذانی اصطلاح الصوفية بالكشف) صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اسے کشف کہتے ہیں۔ اور حضور علیہ افضل الصلوات و اجمل التسلیمات کے اس ارشاد گرامی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے (اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله) مومن کی فراست سے ڈرا کرو وہ تو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"[2]

علامہ شبیر احمد عثمانی نے فرقان کی تفسیر عین حکمت کے طور پر فرمائی ہے، آپ لکھتے ہیں: تقویٰ کی برکت سے حق تعالیٰ تمہارے دل میں ایک نور ڈال دے گا جس سے تم ذوقاً و وجداناً حق و باطل اور نیک و بد کا فیصلہ کر سکو گے۔[3]

سورۃ البقرہ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾[4]

اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنے والے احکام تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ۔

علامہ مودودی نے فرقان کا معنی کسوٹی لکھا ہے اور پھر اس کی تفصیل میں جو لکھا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسوٹی اس چیز کو کہتے ہیں جو کھرے اور کھوٹے کے امتیاز کو نمایاں کرتی ہے۔ یہی مفہوم "فرقان" کا بھی ہے اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ اس لفظ سے کیا ہے۔ ارشاد الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو تمہاری دلی خواہش یہ ہو کہ تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو، تو اللہ تعالیٰ تمہارے اندر وہ قوت تمیز پیدا کر دے گا جس سے قدم قدم پر تمہیں خود یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ کونسا رویہ صحیح ہے اور کونسا غلط، کس رویہ میں خدا کی رضا ہے اور کس میں

۱۔ الانفال: ۲۹/۸

۲۔ ضیاء القرآن، ۲۳۳/۴

۳۔ تفسیر عثمانی، ص۳۸۸

۴۔ البقرہ: ۵۳/۲

اس کی ناراضی۔ زندگی کے ہر موڑ، ہر دوراہے، ہر نشیب اور ہر فراز پر تمہاری اندرونی بصیرت تمہیں بتانے لگے گی کہ کدھر قدم اٹھانا چاہیے اور کدھر نہ اٹھانا چاہیے، کونسی راہ حق ہے اور خدا کی طرف جاتی ہے اور کونسی راہ باطل ہے اور شیطان سے ملاتی ہے۔[1]

علامہ قطب شہید فرقانا کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ کی وجہ سے انسان کے دل میں وہ دوٹوک بصیرت پیدا ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی راہ کی مشکلات میں صحیح فیصلے کر سکتا ہے۔ لیکن یہ وہ حقیقت ہے کہ تمام روحانی تجربات کی طرح اس کو بھی عملاً اپنانے کے بعد ہی اس کی پوری ماہیت انسان پر منکشف ہوتی ہے۔ صرف کلام وبیان سے اس کی ماہیت کو پوری طرح بیان نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً ان لوگوں پر جن کا کوئی ذوق ہی نہ ہو۔''[2]

غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''اس سے مراد یا دنیا میں الگ اور ممتاز کرنا ہے یا آخرت میں۔ اگر دنیا میں مسلمانوں کو کافروں سے الگ اور ممتاز کرنا مراد ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں اپنے احوال باطنہ اور احوال ظاہرہ کے لحاظ سے کافر سے ممتاز ہوتا ہے۔ احوال باطنہ سے اس لیے کہ کافر کے دل میں اللہ کا انکار ہوتا ہے اور مسلمان کے دل میں اللہ پر ایمان ہوتا ہے اور کافر کا دل کینہ، بغض، حسد اور مکروفریب سے پر ہوتا ہے اور مومن کا دل ان تمام اوصاف رذیلہ سے پاک اور صاف ہوتا ہے۔''[3]

عبدالکریم اثری الفرقان کا وہی معنی کرتے ہیں جو حکمت کا معنی ہے، آپ کے نزدیک فرقان ایسی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے بندے کے اندر قوت فیصلہ قوی ہوجائے۔[4]

خلاصہ

مفسرین کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ الفرقان حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے اور حکمت کے اوصات اور ارکان میں سے ایک رکن اور ایک وصف الفرقان بھی ہے، اور یہ صفت انہی لوگوں میں ہوتی ہے جن کو حکمت عطا کردی جاتی ہے۔

۱۔ المودودی، تفہیم القرآن، ۸۹/۳

۲۔ سید قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۱۸۸/۳

۳۔ سعیدی، غلام رسول، تبیان القرآن، ۳۴/۴

۴۔ اثری، عبدالکریم، تفسیر عروۃ الوثقی، ۲۰۶/۱

۸۔ القسط

لغوی معنی

قسط کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق، عدل، انصاف وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔اس کا ضد ظلم، جور اور اس معنی کے دوسرے الفاظ ہیں۔ فکر، عمل، قول، اخلاق، کردار مظاہر اور اشکال غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں القسط کی اہمیت کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

عبدالقادر حنفی رازی لکھتے ہیں:

"الْقِسْطُ بِالْكَسْرِ الْعَدْلُ تَقُولُ مِنْهُ: (أَقْسَطَ) الرَّجُلُ فَهُوَ (مُقْسِطٌ) وَمِنْهُ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾"[1]

لفظ قِسط (قاف کی زیر کے ساتھ) کا معنی عدل کے ہیں، جیسا کہا جاتا ہے اقسط الرجل عدل کرنے والا مرد، اسی سے قرآن مجید میں ہے اللہ تعالیٰ عدل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اصطلاحی مفہوم

کلمہ (القِسط) (قاف کی زیر کے ساتھ) کا معنی عدل اور انصاف ہے، اسی معنی میں قرآن کریم[2] میں لفظ (إقساط) آیا ہے، (قاف کی زبر کے ساتھ) قَسط کا معنی جور اور ظلم کے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾[3]

اور جو ظالم ہیں تو وہ دوزخ کا ایندھن ہونگے۔[4]

جلال الدین محلّی نے تفسیر جلالین میں القسط کا معنی العدل سے کیا گیا ہے۔[5] (بِالْقِسْطِ بِالْعَدْلِ)، علامہ ابوحیان اندلسی نے بھی (أَقْسَطَ الرَّجُلُ أَيْ عَدَلَ)[6] سے کیا ہے۔

مفسرین کرام نے قائما بالقسط سے مراد اپنی تدبیر سے نظام عالم کو کیفیت متوسطہ پر قائم رکھنے والا اور دین اور شریعت میں متوسط عقائد اور احکام کا مکلّف کرنے والا مراد لیا ہے۔[7]

---

۱ ۔ زین الدین، عبدالقادر، مختار الصحاح (بیروت: المکتبۃ العصریۃ، ۱۹۹۹ء)، ۱/۲۵۳

۲ ۔ قرآن کریم میں لفظ ﴿القسط، قسطاس اور قاسط﴾ کے صیغے ۲۷ مقامات پر وارد ہوا ہے۔ تمام مقامات پر اس لفظ کا معنی عدل اور انصاف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ (عبدالباقی، فواد، المعجم المفارس لالفاظ القرآن الکریم، ۳۱۰/۲)

۳ ۔ الجن: ۱۵/۷۲

۴ ۔ الاصفہانی، المفرادات فی غریب القرآن، ۴۳۲/۲

۵ ۔ تفسیر جلالین، ۱۲۸/۴

۶ ۔ الاندلسی، ابوحیان، البحر المحیط فی التفسیر، ۲۲/۲‏۷

۷ ۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۹۷/۲

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ﴾[1]

اے ایمان والو ! تم انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے (محض) اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ۔

تمام معروف مترجمین نے القسط کا معنی انصاف کے ساتھ مضبوطی سے قائم رہنا، حق پر جم جانا کے معنی لیے ہیں[2]۔ اہل لغت، مفسرین کرام اور مترجمین کے کلام سے ثابت ہوتا ہے القسط کا مفہوم عدل، سیدھی راہ کے ہیں اور حکمت کا ایک مفہوم بھی انہی معانی کا تقاضا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ ﷺ کو ہر حال میں حق اور عدل پر قائم رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو امت وسط اور امت خیر کا عظیم لقب عطا فرمایا، اس امت کو بھاری ذمہ داریوں اور فرائض سے بھی آگاہ فرمایا۔ جس طرح نبی کریم ﷺ کا فریضہ تلاوت قرآن کریم، تعلیم کتاب، تزکیہ نفس اور تعلیم حکمت ہے اسی طرح اس امت کا بھی فریضہ یہی ہے کہ وہ اپنے آخری نبی ﷺ کی پیروی اور اتباع میں ان فرائض کو ادا کرے۔

حکمت کا ایک معنی نام عدل و انصاف بھی ہے۔ اگرچہ قرآن کریم میں عدل اور قسط کا الگ الگ مفہوم ہیں[3]۔ لیکن دونوں حکمت کی قریب المعنی قرآنی مترادفات ہیں۔ جس طرح حکمت کا ایک مفہوم عدل و انصاف ہے اور القسط بھی اسی معنی کو متضمن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[4]

اللہ نے اس بات پر گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی (اور ساتھ یہ بھی) کہ وہ ہر تدبیر عدل کے ساتھ فرمانے والا ہے، اس کے سوا کوئی لائقِ پرستش نہیں وہی غالب حکمت والا ہے

۱۔ النساء: ۱۳۵/۴

۲۔ اسی مفہوم میں ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے: ﴿ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (بیشک ہم نے اپنے رسولوں کو قوی دلائل کے ساتھ بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور میزان (عدل) کو نازل فرمایا تا کہ لوگ عدل پر قائم رہیں) (الحدید ۲۵/۵۷)

۳۔ اس لیے کہ قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ربانی ہے: ﴿فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔) (الحجرات ۹/۴۹)

۴۔ النساء: ۱۳۵/۴

حکمت کا ایک مفہوم کہ درمیانی چال اور افراط و تفریط سے پاک کلام اور پاک افعال جب کہ القسط کا یہی مفہوم علامہ بیضاوی نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

" (بالقسط) بالعدل وهو الوسط من كل أمر المتجافي عن طرفي الافراط والتفريط"[1]

عقائد اور اعمال میں ہر امر میں ہر قسم کی بے راہ روی اور افراط اور تفریط سے بچنا اور مبالغہ آمیزی سے دامن بچا کر اوسط راہ اختیار کرنا القسط ہے۔

القسط کا ایک معنی عام ہیں یعنی افراط و تفریط کے درمیان رہنا اور ہر کام میں فضیلت اور بہتر راہ اختیار کرنا چاہیے جیسا کہ توحید اہل عدل کا وصف ہے جو نہ شرک اور نہ معطلہ کی طرح راہ افراط کی طرف لے جاتا ہے۔اسی طرح احسان بھی کنجوسی اور اسراف کے مابین راہ اعتدال ہے۔ توحید اختیار کرنے والے کے اندر قسط کی صفت پائی جاتی ہے اس لیے کہ یہ صفت نہ صرف شرک سے بچاتی ہے بلکہ فواحش اور برے کاموں سے بھی روکتی ہے اور جو فواحش سے اجتناب نہیں کرتا اس کے اندر مقسط کی صفت نہیں ہے۔ مثلاً حد سے کم لباس اور ضرورت سے زیادہ لباس بھی قسط کو متضمن نہیں ہے اسی طرح رہن سہن اور معاشرے کے تمام کاموں میں اعتدال کی صفت اختیار کرنا قرآنی قسط ہے۔ان عاشورؒ لکھتے ہیں:

"فَالْقِسْطُ صِفَةٌ لِلْفِعْلِ فِي ذَاتِهِ بِأَنْ يَكُونَ مُلَائِمًا لِلصَّلَاحِ عَاجِلًا وَآجِلًا، أَيْ سَالِمًا مِنْ عَوَاقِبِ الْفَسَادِ---- كَلَامٌ جَامِعٌ لِإِبْطَالِ كُلِّ مَا يَزْعُمُونَ أَنَّ اللَّهَ أَمَرَهُمْ بِهِ مِمَّا لَيْسَ مِنْ قَبِيلِ الْقِسْطِ." [2]

القسط ایک ایسی صفت ہے جو جلدی یا دیر میں اصلاح اور امن کے لیے انتہائی موزوں ہے اور فساد اور ہلاکت سے محفوظ رکھنے والی ہے۔ پس اس آیت کریمہ میں قسط کی صفت ایک جامع وصف ہے اور یہ ہر اس چیز کو باطل کرتا ہے جس کا وہ دعوی کرتے ہیں کہ اس کام کا حکم اللہ نے دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں راہ اعتدال اختیار کرنے اور افراط و تفریط سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے۔امام آلوسیؒ لکھتے ہیں:

"اَلْقِسْطُ عَلٰى مَا قَالَ غَيْرُ وَاحِدٍ اَلْعَدْلُ وَ هو الْوَسْطُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اَلْمُتَجَافِيْ عَنْ طَرَفِيِ الْإِفْرَاطِ وَ التَّفْرِيْطِ"

القسط عدل سے الگ چیز ہے جس کا معنی درمیانی راہ چلنے کے ہیں، یعنی افراط اور تفریط کی درمیانی راہ کو القسط کہا جاتا ہے۔

ان اقوال سے حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے ہر کام میں توسط و اعتدال پر رہنے اور افراط و تفریط سے بچنے کی ہدایت کی ہے پھر بھلا فواحش کا حکم کیسے دے سکتے ہیں۔ قسط سے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق کی مکمل ادائیگی کے ساتھ ہے۔علامہ اشرف علی تھانوی نے قسط سے مراد حقوق العباد لیا ہے۔ [3]

جیسا کہ حکمت کا ایک معنی ظاہر و باطن میں، اور قول و فعل میں یکسانیت ہے اسی طرح القسط کا بھی یہی مفہوم ہے، علامہ سعیدی القسط کی تفصیل لکھنے کے بعد بطور خلاصہ لکھتے ہیں:

۱۔ البیضاوی، ۱۶/۳

۲۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۲۳۵/۵

۳۔ التھانوی، بیان القرآن، ص ۲۵۳

خلاصہ یہ ہے کہ تمہارا ہر عمل اللہ کے لیے ہو حتی کہ ہر حرکت اور ہر سکون ٗہر قول اور ہر فعل اللہ کے لیے ہو ٗاور یہی انسانیت کی معراج ہے ٗورنہ محض پیٹ بھرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ سے کھالینا اور جس سے چاہے قضاء شہوت کرلینا ہی مقصود ہو تو پھر انسان میں اور جانوروں اور درندوں میں کیا فرق رہے گا![1]

حکمت کا ایک معنی عمل صالح بھی ہے یا ایسا علم جو نفع دینے والے ہو۔اسی طرح القسط بھی قرآن کریم میں اسی مفہوم کا شامل ہے۔ سورۃالنساء کی اس آیت کریمہ میں شہادت سے پہلے القسط یعنی انصاف کو رکھنے میں حکمت یہ ے کہ انسان پہلے اپنی ذات کے ساتھ عدل اور انصاف کرے یعنی انسان پہلے خود برے اعمال اور رزائل اخلاق سے کنارہ کش ہو کر اعمال صالحہ بجالائے اور حسن اخلاق کی طرف مائل ہو۔اس لیے کہ گواہی کے لیے انسان کو خود اس قابل ہونا ضروری ہے کہ وہ انسان معاشرے میں حسن اخلاق سے پہنچانا جاتا ہو۔اس لیے کہ جب تک وہ خود القسط یعنی انصاف کے مرتبے پر فائز نہیں ہو جاتا وہ الشادہ یعنی گواہی کے مرتبے کے لائق نہیں۔قرآن کریم میں القسط کا یہی فلسفہ ہے اور یہی قرآنی اصطلاح حکمت کا بھی ایک مفہوم اور معنی ہے۔

درج بالا آیات اور ان کے تراجم اور پھر اس ضمن میں مفسرین کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ القسط کا قرآنی مفہوم انصاف ہے اور انصاف کا تعلق معاشرے کے ہر فرد کے ساتھ ہے اپنے ساتھ اور اپنوں کے ساتھ بھی انصاف لازم ہے، جس طرح حکمت سے انسان کو معرفت قلبی نصیب ہوتی ہے اور وہ حق اور باطل کی پہچان کرلیتا ہے۔اس کے قول و فعل میں یکسانیت آجاتی ہے اور حکمت کے نور سے اس کے قلب میں شیطانی اور خواہشات نفسانی کے وسوسے دور ہو جاتے ہیں اور وہ ہر وقت تقویٰ کے مرتبے میں رہتا ہے۔اسی طرح القسط کا ایک قرآنی مفہوم یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے نفس کی معرفت حاصل کرے اور اس کے لیے اس کی غلاظتوں ،اس کے وسواس اور اس کے تزکیہ کے طرق اور سب سے بڑھ کر اپنے نفس کو نقصان دینے والے چیزوں سے دور کرے۔یہی اپنے نفس کے ساتھ القسط یعنی انصاف کا تقاضا ہے اور یہی قرآنی اصطلاح الحکمۃ کا بھی ایک مفہوم ہے۔اس سے واضح ہوا کہ صفت القسط صفت الحکمت کی قرآنی قریب المعنی اصطلاح ہے۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی ذات کا خوف اور ڈر نہیں ہوتا وہ خواہشات نفسانی پر چل پڑتے ہیں جن لوگوں کے اندر خوف خدا نہیں ہوتا ان کے اندر مصلحت اور حکمت نہیں ہوتی وہ ہر ایک معاملہ میں صرف اپنے مفاد کو مد نظر رکھتے ہیں جب کہ وہ لوگ جن کے دلوں میں خوف الٰہی کی دولت ہوتی ہے وہ معاملات کو تمام تر زاویوں سے دیکھتے ہیں اور اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر ہوتی ہے اور وہ کام بھی اسی کے مطابق کرتے ہیں جو حق اور انصاف کا متقاضی ہو۔

اسی طرح جس شخص میں قسط کی صلاحیت ہوتی ہے وہ کسی کام میں ناانصافی برداشت نہیں کرتا، حق اور انصاف کے خلاف ہونے والے کام پر وہ آواز اٹھاتا ہے۔قرآن کریم میں القسط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنے ساتھ اور معاشرے کے تمام افراد کے ساتھ ناحق اور ناانصافی نہ ہونے پائے۔اگر اس کے اندر القسط کی طاقت ہوئی تو وہ ضرور اس پر عمل کرے گا

۱۔ السعیدی، تبیان القرآن، ۸۸/۴

وگرنہ ایک ایسا شخص جو ظلم وزیادتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یا خاموش رہتا ہے یا آنکھیں پھر لیتا ہے تو ایسا شخص قرآن کریم کی اس دولت سے دور ہے۔اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہر وقت دیکھنے والا اور سننے والا نہیں سمجھتا۔[1]

خلاصہ

قرآن کریم میں مذکور اصطلاح القسط قرآن کی اصطلاح حکمت کے قریب المعنی ایک جامع قرآنی اصطلاح ہے۔ اس کے معنی اعتدال اور انصاف کے ہیں، ہر ایک چیز اور ہر ایک کام میں اعتدال کا اہتمام کرنا قسط کا تقاضا ہے۔اس اصطلاح میں اتنی جامعیت پائی جاتی ہے کہ اس کا تعلق معاشرے کے کسی ایک فرد کے ساتھ نہیں اور نہ ہی حیات انسانی کے کسی ایک پہلو کے ساتھ ہے بلکہ معاشرے کے ہر فرد کے ساتھ ہر پہلو میں اس کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔اعمال صالحہ، اخلاق، انسانی معیشت اور معاشرت وغیرہ میں قسط کی اہمیت مسلمہ ہے اور یہی قرآنی اصطلاح الحکمة کا بھی تقاضا اور مفہوم ہے۔قرآن کریم کے اس اصطلاح کے مطابق پوری زندگی نقطہ اعتدال پر قائم کی جائے۔ قسط کا مقصود یہ ہے کہ ایک خاص مصلحت اور حکمت کے تحت زندگی گزاری جائے جو افراط و تفریط سے پاک ہو۔ نفسانی خواہشات سے پاک ہو اور شریعت اسلامیہ کے مقرر کردہ حدود سے متجاوز نہ ہو۔اسی وجہ سے قرآن کریم جس قوم میں نازل ہوا وہ قوم قسط کی خوبی سے خالی تھی اس معاشرے اور پوری عالم انسانیت کو ایک نقطہ اعتدال پر لانے کے لیے القسط کی صفت سے مزین فرمایا تاکہ کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی نہ ہو۔القسط کا مقصد یہ کہ مسلمان کا ہر قول و فعل اللہ کی عبادت سے پُر ہونا چاہیے، حکمت یہ ہے کہ قول و عمل میں یکسانیت ہو گی تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی محبت حاصل ہو گی۔القسط کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اپنی قول و عمل اور اپنی عبادات میں اخلاص پیدا کرو ، عبادات میں اخلاص سے یہ ہو گا کہ مسلمان کی ظاہری اور باطنی حالت پاکیزہ جائے گی یعنی تزکیہ نفس ہو جائے گا۔ اسلام کا یہ مقصد اور مدعا ہے کہ صرف ظاہری زندگی میں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہوں بلکہ اعمال صالحہ قلبی اور باطنی طور پر بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہونے چاہییں۔القسط کا مفہوم یہ بھی ہے کہ مسلمان کی زندگی اس طرح نہ ہو کہ ظاہری معاملات اللہ تعالیٰ کے لیے اور دل میں رغبت اور محبت کسی اور کے لیے ہو۔ ورنہ اس طرح معاشرے میں بدامنی، فساد اور طبقاتی تقسیم شروع ہو جائے گی۔صفت القسط کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جس قوم میں القسط کی حکمرانی ہو گی اس میں اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے اور اس کے نتیجے میں ایسا معاشرہ تشکیل پائے گا جو عین شریعت اسلامیہ کا پابند ہو گا۔اصطلاح قرآنی الحکمة کا بھی یہی مفہوم اور یہی تقاضا ہے

حکمت کے معانی ومفاہیم سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ القسط بھی حکمت کے اوصاف میں سے ایک ہے اور اس کا ایک ادنی جُزہے۔

---

۱ ۔ دیکھیے تفسیر وحید الدین خان، تفسیر تذکیر القرآن، ۹۵/۳

۹۔ المتوسم

لغوی معنی

کلام عرب میں وسم کا معنی اثر کرنا' نشان ڈالنا کے ہیں، جب کہ سِمَۃٌ کا معنی اثر یا نشان کے ہیں۔ زین الدین عبد القادر لکھتے ہیں:

''وَسَمَهُ مِنْ بَابِ وَعَدَ، وَ (سِمَةً) أَيْضًا إِذَا أَثَّرَ فِيهِ''[۱]

(و س م) وسم باب وَعَدَ یَعِدُ سے ہے وَسَمَ (سین کی زبر اور وسِمَ (سین کی زیر کے ساتھ) بھی مستعمل ہے اس کا معنی نشان اور اثر کے ہیں۔

اسی اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے لوگ جو ظاہری طور پر علامتیں اور اثرات یا آثار دیکھ کر اس چیز کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے والے ہوں۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو متوسمین کا خطاب دیا ہے۔

اصطلاحی مفہوم

امام راغب لکھتے ہیں:

''سَمْتُ الشيءَ وَسْماً: إذا أثّرت فيه بِسِمَةٍ، قال تعالى: سِيماهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ''[۲]

کلام عرب میں بطور محاورہ کہا جاتا ہے میں نے اس پر نشان لگایا۔ قرآن کریم میں ہے (ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگا دیں گے)

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ﴾[۳]

بے شک اس (واقعہ) میں اہل فراست کے لیے نشانیاں ہیں

مترجمین نے متوسم کا معنی ان مشہور و معروف الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

۱۔ بصیرت رکھنے والے ۲۔ اہل فراست

۳۔ اہل عقل ۴۔ دھیان رکھنے والے ۵۔ حقیقت کو پہچاننے والے

۶۔ عبرت حاصل کرنے والے۔ ۷۔ غور و فکر کرنے والے[۴]

---

۱ ۔ زین الدین، عبد القادر، مختار الصحاح (بیروت: المکتبۃ العصریۃ، ۱۹۹۹ء)، ۳۳۸/۱

۲ ۔ الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ۹۷/۷

۳ ۔ الحجر: ۷۵/۱۵

۴ ۔ مترجم، شاہ رفیع الدین، بر تفسیر شاہ عبد القادر، ص ۴۴۰، مودودی، تفہیم القرآن، ۲۲۳/۵، کرم شاہ، ضیاء القرآن، ۱۲۲/۵

جلال الدین سیوطی نے المتوسم کا معنی (هم المتفرسون)[1] اہل فراست سے کیا ہے۔ وسم کا معنی معرفت اور پہچان کے ہیں، وسم کے اسی مفہوم میں قرآن کریم میں (تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ) [2] (تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لو گے) ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

﴿سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾[3]

ان کی نشانی ان کے چہروں پر سجدوں کا اثر ہے۔

علامہ راغب ؒ توسم کے اصطلاحی مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں:

"أي للمعتبرين العارفين المتّعظين، وهذا التَّوَسُّمُ هو الذي سمّاه قوم الزَّكانةَ، وقوم الفراسة، وقوم الفطنة" [4]

آثار و قرائن کی مدد سے کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنا، اس کو علم فراست، علم زکانت اور علم فطانت بھی کہا جاتا ہے۔

علامہ قرطبیؒ کے مطابق التوسم تفعل کے وزن پر الوسم سے ماخوذ ہے۔ اور اس سے مراد ایسی علامت ہے جس سے اس کے سوا مطلوب پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے: توسمت فيه الخير (یہ تب کہا جاتا ہے) جب تو اس میں خیر اور بھلائی کی علامت دیکھ لے؛ اور اسی سے نبی کریم ﷺ کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

انی توسمت فیک الخیر أعرفه   واللہ یعلم أن ثابت البصر [5]

بلاشبہ میں نے آپ میں خیر کی علامت دیکھی ہے میں اسے پہچانتا ہوں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں صحیح البصر ہوں۔

قرآن کریم میں فراست

قرآن کریم میں مذکور متوسم کی اصطلاح سے مراد اہل فراست ہیں۔ توسم حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔ اس لیے کہ اس اصطلاح کا مفہوم علامہ قرطبیؒ نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

"وذاك يكون بجودة القريحة وحدة الخاطر وصفاء الفكر. زاد غيره"[6]

---

۱ ۔ السیوطی، الدر المنثور، ۶۳۸/۲

۲ ۔ البقرہ: ۲۷۳/۲

۳ ۔ الفتح: ۲۹/۴۸

۴ ۔ الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ۲۸۸/۲

۵ ۔ القرطبیؒ، احکام القرآن، ۴۲/۱۰

۶ ۔ ایضاً، ۴۳/۱۰

اور یہ صفت توسم و فراست (قوت) طبیعت اور مزاج کی عمدگی، دماغ کی تیزی اور صاف ستھری فکر سے حاصل ہوتی ہے

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے متوسمین کا معنی (لأهل الصلاح والخير) اہل صلاح اور اہل خیر کے لیے لکھا ہے۔[1] مجاہد کے نزدیک شناخت کرنے والے۔ قتادہ کے نزدیک عبرت حاصل کرنے والے مراد ہیں، مقاتل کہتے ہیں متوسمین کا معنی غور کرنے والے ہیں۔

جار اللہ زمخشری لکھتے ہیں:

"وحقيقة المتوسمين النظار المتثبتون في نظرهم حتى يعرفوا حقيقة سمة الشيء. يقال: توسمت في فلان كذا، أي عرفت"[2]

متوسمین سے مراد ایسے لوگ ہیں جو اشیاء کی معرفت اور حقیقت کو پہچاننے والے ہیں حتی کہ یہ دیکھ کر ہی جان لیتے ہیں کہ اس کا باطن اور اس کی حقیقت کیا ہے۔

علامہ ابن عطیہؒ لکھتے ہیں:

"فالمتوسم هو الذي ينظر في وسم المعنى فيستدل به على المعنى"[3]

توسم سے مراد انسانی زندگی پر اثرانداز ہونے والے عوامل اور اسباب ہیں، جیسے سکون، طمانیت قلب، معاشی طور پر انسان کو پریشانیوں سے محفوظ رہنا وغیرہ۔

علامہ محمود نسفیؒ اپنی تفسیر میں متوسمین کا معنی لکھتے ہیں:

"للمتفرسين المتأملين كأنهم يعرفون باطن الشيء بسمة ظاهرة"[4]

توسم ظاہری علامات سے اندرونی نتائج معلوم کرنے کا نام ہے۔ گویا کہ وہ ظاہری علامت سے ان چیزوں کے باطن کو پہچان لیتے ہیں۔

مفسرین کی آراء سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی اصطلاح (التوسم) کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اس کی حقیقت اور اس کے معانی تک نظر کرنا۔

ان اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ متوسمین کا معنی اہل فراست ہیں۔ جب کہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حکمت اور فراست قریب المعنی ہیں۔ قرآنی اصطلاح الحکمة کا بھی معنی عقل، دانش مندی، سلیقہ مندی، فہم اور سمجھ بوجھ کے ہیں جب کہ فراست بھی ایسی خوبی، کمال اور ملکہ کو کہا جاتا ہے جو کثرت تجربات اور علم کی کمال مہارت کے بعد حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ ایسی نظر ہوتی جس کے بعد انسان بآسانی صحیح فکر کے ذریعے صحیح اور درست نتیجہ تک پہنچ

۱۔ الواحدی، تفسیر الوسیط، ۴۷/۳

۲۔ الزمخشری، جار اللہ، الکشاف، ۵۸۶/۲

۳۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۳۷۰/۳

۴۔ النسفی، مدارک التنزیل وحقائق التأویل، ۱۹۶/۲

سکتا ہے۔ اور حکمت بھی اسی خوبی اور صفت کا نام ہے لہٰذا ان دلائل سے متوسم بھی حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاح ثابت ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾[1]

(خیرات) ان فقرا کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں (کسب معاش سے) روک دیئے گئے ہیں وہ (امور دین میں ہمہ وقت مشغول رہنے کے باعث) زمین میں چل پھر بھی نہیں سکتے ان کے (زُہداً) طمع سے باز رہنے کے باعث نادان (جو ان کے حال سے بے خبر ہے) انہیں مالدار سمجھے ہوئے ہے، تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لو گے، وہ لوگوں سے بالکل سوال ہی نہیں کرتے کہ کہیں (مخلوق کے سامنے) گڑگڑانا نہ پڑے، اور تم جو مال بھی خرچ کرو تو بیشک اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

وھبہ زحیلی (بِسِيمَاهُمْ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

تَعْرِفُهُمْ بِسِيماهُمْ أي علامتهم، والتّعرّف عليهم يحتاج إلى فراسة المؤمن ، وخبرة المجرّب، وحنكة ذوي البصيرة والعقل، ------ وربما لا يكون ذلك دليلا مقنعا[2]

وہ ان کے چہرے کی علامات سے پہچان لیتے ہیں، ایسی معرفت کا تعلق مؤمن کی فراست کے ساتھ ہے، اس کے ماہرانہ تجربات، اس کی عقل وبصیرت اور اس کے ارد گرد سے ذہن میں اُٹھنے والے سوالات اس کی اس فراست کے ذرائع ہیں، کبھی وہ ظاہری چال ڈھال سے بھی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے، اور کبھی اس کی فراست میں کوئی چیز دال نہیں ہوتی (پھر بھی حقیقت حال تک پہنچ جاتا ہے)

ایک اور مقام پر مؤمن کی فراست کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَاهُمْ ۚ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ﴾[3]

اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو بلاشبہ وہ (منافق) لوگ (اس طرح) دکھا دیں کہ آپ انہیں ان کے چہروں کی علامت سے ہی پہچان لیں، اور (اسی طرح) یقیناً آپ ان کے انداز کلام سے بھی انہیں پہچان لیں گے، اور اللہ تمہارے سب اعمال کو (خوب) جانتا ہے۔

ابن عاشور نے (فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَاهُمْ) کی تفسیر کو فراست اور توسم کے مفہوم کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"ولكون هذه الآيات آيات فراسة وتوسم"[4]

۱۔ البقرہ: ۲/۲۷۳

۲۔ الزحیلی، وھبہ، التفسیر المنیر، ۳/۷۸

۳۔ محمد: ۴۷/۳۰

۴۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۴/۶۵

آیت کریمہ میں یہ نشانیاں اہل فراست اور اہل توسم کی ہیں۔

یعنی اس طرح کی آیات توسم اور فراست پر دلالت کرتی ہیں۔

قاضی ثناء اللہؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"يعنى الناظرين فى ظواهر الأشياء وسماتها حتّى يتفرسوا بواطنها بسمات ظواهرها" [1]

یعنی متوسمین اور اہل فراست سے مراد وہ لوگ ظاہری علامات و آثار کو دیکھ کر اندرونی نتائج و معانی کی شناخت کرنے والے ہیں

اس کی مزید وضاحت میں علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

"متوسم "اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بعض ظاہری علامات وقرائن دیکھ کر محض فراست سے کسی پوشیدہ بات کا پتہ لگالے۔ حدیث میں ہے "اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّه يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ" بعض روایات میں "وَبِتَوْفِيْقِ اللهِ" کی زیادت ہے، یعنی مومن کی فراست سے ڈرتے رہو، وہ خدا تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے نور توفیق سے دیکھتا ہے۔ شاید "کشف" اور "فراست" میں بقول امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم اتنا ہی فرق ہو جتنا ٹیلیفون اور ٹیلیگراف میں ہوتا ہے۔" [2]

امین احسن اصلاحی نے متوسم کا معنی حکمت کے قریب المعنی کے طور پر ذکر کیا ہے، آپ لکھتے ہیں

"توسم' کے معنی بھانپنے تاڑنے اور کسی عبرت انگیز چیز سے درس عبرت حاصل کرنے کے ہیں" [3]

امام ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہا سے روایت نقل فرمائی ہے:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ، فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ [4]» ثُمَّ قَرَأَ { إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِينَ }قَالَ أَبُو عِيسَى هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ إِنَّمَا نَعْرِفُهُ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ وَقَدْ رُوِيَ عَنْ بَعْضِ أَهْلِ الْعِلْمِ فِي تَفْسِيرِ هَذِهِ الْآيَةِ { إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِينَ } [5]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله (تم مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے) پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ان فی ذلک

---

۱ ۔ پانی پتی، ثناء اللہ، التفسیر المظھری، ۲۰۳۱/۱

۲ ۔ عثمانی، تفسیر عثمانی، ۵۵/۳

۳ ۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۱۵۵/۴

۴ ۔ الترمذی، سنن ترمذی، ج ۱۰، ص ۳۹۹، رقم الحدیث ۳۰۵۲

۵ ۔ اس حدیث مبارکہ کو امام ترمذی کے علاوہ امام طبرانی نے اپنی اوسط میں (حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، ۳۱۲/۳، رقم الحدیث ۳۲۵۴)، اور امام ہیثمی نے مجمع الزوائد میں (ج ۱۰، ص ۲۶۸، رقم الحدیث ۱۷۹۴۰) میں ذکر کیا اور فرمایا کی اس کی اسناد حسن ہے۔ امام سیوطی نے الالی المصنوعہ میں اس حدیث کے بارے حسن صحیح کا حکم لگایا ہے۔ ج ۲، ص ۲۷۸، نیز شیخ البانی نے اس حدیث کو سلسۃ الصحیحہ میں ذکر فرمایا ہے: رقم ۱۶۴۴

لایت للمتوسمین ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔اور بعض اہل علم نے یہ حدیث مبارکہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِينَ }

حدیث مبارکہ میں ہے:

عن أنس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن لله عبادا يعرفون الناس بالتوسم ".[1]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جو لوگوں کو علامت اور نشانی سے پہچان لیتے ہیں۔

خلاصہ

قرآن کریم کی اصطلاح (متوسمین) سے مراد غور وفکر کرنے والے، دھیان کرنے والے، حقیقت کی تلاش کرنے والے اور اہل فراست مراد ہے۔اصطلاح (الحکمة) بھی اس مفہوم اور اسی صفت اور صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے۔جو مفہوم حکمت ہے اسی کے قریب مفہوم (متوسمین) کا بھی ہے۔اس طرح مفہوم کے اعتبار سے یہ اصطلاح بھی(الحکمة) کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ثابت ہوتی ہے۔اور یہ قوت اور صلاحیت کے اعتبار سے حکمت کی ایک جز ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ اس حدیث مبارکہ کو امام ترمذی کے علاوہ امام طبرانی نے اپنی اوسط میں ج ۳، ص ۳۱۲، رقم الحدیث ۳۲۵۴، اور امام بزار نے)، اور امام ہیثمی نے مجمع الزوائد میں (ج ۱۰، ص ۲۶۸، رقم الحدیث ۱۷۹۳۹) میں ذکر کیا اور فرمایا کی اس کی اسناد حسن ہے۔ شیخ البانی نے اس حدیث کو سلسة الصحیحہ میں ذکر فرمایا ہے: رقم ۱۶۴۴

۱۰۔ النُّہَی

لغوی معنی

النُّھَی ''نُھیَۃٌ'' کی جمع ہے، جس کی تعبیر عقل سے کی گئی ہے۔ اس لیے کہ عقل انسان کو نامناسب کاموں سے منع کرتی ہے۔ "نَھٰی یَنْھٰی کا معنی ہے منع کرنا۔ اسی طرح النُّھَی کا معنی روکنے والی چیز۔ کیونکہ عقل سلیم انسان کو برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے۔ اسی لیے یہاں بھی النھی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ لفظ استعمال فرما کر فرعون اور اس کے ساتھیوں کو بتلایا کہ اگر تمہاری عقل کام کرتی ہے تو تمہیں اپنے باطل عقیدہ اور ظالمانہ رویے سے باز آجانا چاہیے۔ حماد جوہری لکھتے ہیں:

''النُهْيَةُ بالضم: واحدة النُهى، وهي العُقول، لأنها تَنْهى عن القبيح''[۱]

لفظ(النُهْيَةُ)نون کلمہ کے پیش کے ساتھ، جس کی واحد(النُّھَی) آتی ہے، اس کا معنی عقل کے ہیں اس لیے کہ یہ صفت بھی آدمی کو قبیح کام سے روکتی ہے۔

اسی مناسبت سے حکمت کا بھی ایک معنی روکنا، لگام دینا کے ہیں جیسا کہ سابق سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

اصطلاحی مفہوم

امام فراء نے معانی القرآن میں النُّھَی کا معنی اہل عقل سے کیا ہے۔

''لذوي العقول. وتقول للرجل. إنه لذو نُهْية إذا كان ذا عقل''[۲].

اہل عقل، اہل نُھَی ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو عقل (کامل) رکھتا ہو

علامہ راغب اصفہانی النُّھَی کے متعلق لکھتے ہیں:

''النُّهيَةُ: العقل الناهي عن القبائح. جمعها: نُهًى قال تعالى: إِنَّ فِي ذلِكَ لَآياتٍ لِأُولِي النُّهى'' [۳]

قرآن کریم میں وارد لفظ نُھًی، جس کی جمع النُّھیَۃُ آتی ہے، اس سے مراد ایسی عقل جو انسان کو قبیح افعال سے روکتی ہے، جیسا کہ آیت کریمہ میں وارد ہے۔

مجد الدین فیروز آبادی نے بھی النُّھَی کو کامل عقل قرار دیا ہے:

''أَی مُتناهی العَقْلِ كامِلُ الفِطْنة والكَيْسِ'' [۴]

۱۔ الجوہری، اسماعیل بن حماد، الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية، ۲۵۱۷/۶

۲۔ الفراء، معانی القرآن، ۱۸۱/۲

۳۔ الاصفہانی، المفردات، ۸۷۲/۲

۴۔ فیروز آبادی، بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز، ۱۳۱/۵

النُّھَی سے مراد عقل استعداد کی انتہاء ہے، فطانت و ذہانت اور دانش مندی اور باریک بینی میں کامل ہونے والے کو قرآن النُّھَی کہتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِأُولِي النُّهَى﴾[1]

تم کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ، بیشک اس میں دانش مندوں کے لیے نشانیاں ہیں

النُّھَی کا مفہوم تمام مترجمین نے عقل مندوں[2]، دانش مندوں[3]، دانش وروں[4] کے ساتھ کیا ہے۔

امام طبری النُّھَی کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"لأَنَّهُمْ أَهْل التَّفَكُّر وَالاعْتِبَار , وَأَهْل التَّدَبُّر وَالاتِّعَاظ"[5]

(اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں خصوصی طور پر کی یہ صفت اس لیے ذکر کی ہے کہ) اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں تفکر کرنے، عبرت حاصل کرنے والے، تدبر کرنے والے اور نصیحت حاصل کرنے والے ہیں۔

اس طرح قرآنی اصطلاح الحكمة کی صفت انہی لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اہل تدبر و تفکر ہوں، اس طرح اس دلیل سے بھی یہ اصطلاح الحكمة کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ثابت ہوتی ہے۔

علامہ شوکانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَالنُّهَى: الْعُقُولُ، جَمْعُ نُهْيَةٍ، وَخَصَّ ذَوِي النُّهَى لِأَنَّهُمُ الَّذِينَ يُنْتَهَى إِلَى رَأْيِهِمْ ـــــــ لِأَنَّهُمْ يَنْهَوْنَ النَّفْسَ عَنِ الْقَبَائِحِ"[6]

عقل کو نُھیہ اور عقل مند کو ذو نُھیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ بالآخر انہی کی رائے پر معاملہ انتہا پذیر ہوتا ہے، یا اس لیے کہ یہ نفس کو گناہوں سے روکتے ہیں، النُّھَی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ قبیح اور ناپسندیدہ کاموں سے روکتی ہے (حکمت کا بھی یہی مفہوم ہے)

اس مفہوم سے واضح ہوا کہ النُّھَی کی صفت جن کو عطا کی گئی گویا ان کو حکمت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت عطا فرمائی گئی۔

سورۃ طٰہٰ میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

---

۱ ۔ طٰہٰ: ۵۴/۲۰

۲ ۔ آزاد، ابوالکلام، ص ۲۶۶، ترجمان القرآن، کیلانی، عبدالرحمٰن، تیسیر القرآن، ص ۴۲۲

۳ ۔ التھانوی، بیان القرآن، ص ۳۹۹، مودودی، تفہیم القرآن، ۹۹/۴، اصلاحی، تدبر قرآن، ۳۲۱/۵

۴ ۔ کرم شاہ، ضیاء القرآن، ۲۲۱/۶

۵ ۔ الطبری، جامع البیان، ۳۶۴/۱۸

۶ ۔ الشوکانی، فتح القدیر، ۴۳۷/۳

﴿أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ﴾ [1]

علامہ ماتریدی نے اس جگہ النھی سے (أي لأولي العقول ، لآيات لأولي الورع) [2] مراد اہل عقل، اہل تقوی اور اہل زہد ورع مراد لیے ہیں اسی طرح امام رازی النُھی کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''أي لأهل العقول والأقرب أن للنهية مزية على العقل، والنهى لا يقال إلا فيمن له عقل ينتهي به عن القبائح، كما أن لقولنا: أولو العزم مزية على أولو الحزم، فلذلك قال بعضهم: أهل الورع وأهل التقوى '' [3]

قرآنی اصطلاح النُھی کا معنی اہل عقل ہیں۔ اور اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد ایسی صفت ہے جو عقل کو مزید سنوارنے اور نکھارنے والی ہو۔ النُّھَی کا اطلاق ہوتا ہمیشہ صرف ایسی عقل پر ہوتا ہے جو انسان کو قبیح کاموں سے روکے جیسا کہ قرآن نے اولوالعزم کی اصطلاح بیان فرمائی ہے یعنی اولوالعزم (ارادے میں کامل مضبوط)، بعض نے النُھی کا معنی اہل زہد و تقوی سے لیا ہے۔

امین احسن اصلاحی نے النُّھَی کا ایسا مفہوم لکھا ہے جس سے مزید واضح ہو جاتا ہے کہ النُّھَی حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔آپ لکھتے ہیں:

''پروردگار کے اس اہتمام و انتظام کے اندر اہل عقل کے لیے بہت سی دلیلیں ہیں۔ یہاں ان دلیلوں کی وضاحت نہیں فرمائی ہے لیکن اس نظام ربوبیت کے اندر اس کے خالق کی قدرت، حکمت، رحمت کی جو دلیلیں ہیں وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں ہو سکتیں جن کے اندر عقل ہے اور وہ اپنی عقل سے کام بھی لیتے ہیں'' [4]

مفتی محمد شفیع نے اپنی تفسیر میں بھی النُھی کا مفہوم حکمت والا لکھا ہے۔آپ ک نقطۂ نظر یہ ہے کہ النُھی کو عقل سے تعبیر اس لیے کیا گیا ہے جب عقل صفت النُھی پر پہنچ جاتی ہے تو تب وہ انسان کو برے اور مضر کاموں سے منع کرتی ہے۔ [5]۔ جیسا کہ کہ سابقہ مباحث میں واضح کیا گیا ہے کہ حکمت کا ایک معنی عقل سلیم بھی ہے، علامہ مودودی نے النُھی کو عقل سلیم سے تعبیر فرمایا ہے اور پھر اس پر مزید آپ لکھتے ہیں:

۱۔ طٰہٰ: ۱۲۸/۲۰

۲۔ الماتریدی، تاویلات اہل السنہ، ۲۸۶/۲

۳۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۱۱۲/۲۲

۴۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۱۴۱/۴

۵۔ مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ۱۰۱/۵

"النُھی سے مراد اہل عقل و اہل حکمت ہیں جو حق کے متلاشی ہوتے ہیں اور حق کی جستجو کرنے والوں کے لیے منزل اور منزل کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔"[1]

پیر کرم شاہ نے النُھی کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِأُولِي النُّهَى﴾[2]

بے شک اس میں (ہماری قدرت و حکمت کی) نشانیاں ہیں دانشوروں کے لیے[3]

آپ سے النُھی سے مراد ایسے شخص کی صفت مراد لیتے ہیں جو تعلیم یافتہ ہو، عالمی اور ملکی سطح پر سماجی، ادبی، سیاسی اور تہذیبی مسائل پر غور و فکر کرنے کا ملکہ رکھتا ہو اور صاحب الرائے بھی ہو۔[4] اس سے واضح ہوا کہ ایسا شخص جو کی النُھی صلاحیت عطا کی گئی ہو گویا اس کو حکمت کی صفات میں سے ایک صفت عطا کی گئی ہے۔ اس طرح یہ النُھی قرآنی اصطلاح بھی الحکمۃ قریب المعنی قرآنی اصطلاحات میں سے ایک ہے۔

خلاصہ

النُھی قرآن کریم کی اصطلاح حکمت کی قریب المعنی اصطلاح ہے۔ جس کو امام طبریؒ، امام رازیؒ اور دیگر مفسرین نے بھی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے یعنی اہل عقل، اہل زہد اور اہل تقوی کی صفت والوں کا اطلاق قرآن کریم میں النُھی کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ النُھی حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔ اور اس کے ارکان میں سے ایک رکن اور حکمت کی صفات میں سے ایک قرآنی صفت ہے۔

۱۔ دیکھیے: المودودی، تفہیم القرآن، ۹۵/۶

۲۔ طٰہٰ: ۱۲۸/۲۰

۳۔ کرم شاہ، ضیاء القرآن، ۱۹۹/۵

۴۔ دانشور کا معنی مختلف لغات میں دیکھا گیا تو اس کے اندر دانش ور کی یہ ساری صفات ذکر کی گئی ہیں۔

۱۱۔ اولو الالباب

قرآن کریم میں سولہ[1] مقامات پر﴿أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾[2]

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کی گردش میں عقل سلیم والوں کے لیے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں

ایسی صفات کے حامل افراد کو قرآن کریم نے اولو الالباب کہا ہے یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت کا ایک گوشہ عطا کر دیا جاتا ہے کہ ان کے اندر لُب کی صفت رکھ دی جاتی ہے۔ اور یہی لُب والی صفت حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔ جس کو حکمت عطا کی گئی گویا وہ اولوالالباب کے لقب سے سرفراز کر دیا جاتا ہے۔ قرآنی اصطلاح حکمت کی صفات میں سے ایک صفت اولو الباب بھی ہے۔ یہ صفت قرآنی ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کو حکمت عطا کی گئی ہو۔

لغوی مفہوم

اولو الالباب لب سے ہے جس کا معنی خالص کرنا کے ہیں، فراہیدی لکھتے ہیں:

ولب الرجل ما جعل في قلبه من العقل وجمع اللب: ألباب[3]

(لب کا معنی پھلوں کا رس یعنی خالص چیز کے ہیں) لب الرجل ایسے شخص پر بولا جاتا ہے جس کے دل میں عقل کی صلاحیت ہو یعنی سوچنے اور سمجھنے کی قوت ہو اس کی جمع الالباب آتی ہے۔

---

۱ ۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا **أُولِي الْأَلْبَابِ** لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ(البقرہ:۱۷۹/۲)۲۔ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى وَاتَّقُونِ يَا **أُولِي الْأَلْبَابِ** (البقرہ:۱۹۷/۲)۳۔ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا **أُولُو الْأَلْبَابِ** (البقرہ:۲۶۹/۲)۴۔ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا **أُولُو الْأَلْبَابِ** (آل عمران:۷/۳)۵۔إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ **لِّأُولِي الْأَلْبَابِ**(آل عمران:۱۹۰/۲)،۶۔ قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا **أُولِي الْأَلْبَابِ** لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (المائدہ:۱۰۰/۵)۷۔ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ **لِأُولِي الْأَلْبَابِ** (یوسف:۱۱۱/۱۲)۸۔ أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ **أُولُو الْأَلْبَابِ** (الرعد۱۹/۱۳)۹۔ هَذَا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ **أُولُو الْأَلْبَابِ** (ابراھیم:۵۲/۱۴)۱۰۔ كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ **أُولُو الْأَلْبَابِ** (ص۳۸/۲۹)۱۱۔وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرَى **لِأُولِي الْأَلْبَابِ** (ص:۴۳/۳۸)۱۲۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ **أُولُو الْأَلْبَابِ** (الزمر:۹/۳۹)۱۳۔ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَئِكَ هُمْ **أُولُو الْأَلْبَابِ** (الزمر:۱۸/۳۹)۱۴۔ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرَى **لِأُولِي الْأَلْبَابِ** (الزمر:۲۱/۳۹)۱۵۔ هُدًى وَذِكْرَى **لِأُولِي الْأَلْبَابِ** (غافر:۵۴/۴۰)۱۶۔ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا **أُولِي الْأَلْبَابِ** (الطلاق:۱۰/۶۵)

۲ ۔ آل عمران: ۱۹۰/۳

۳ ۔ الفراہیدی، العین، ۳۱۸/۸

اسماعیل الجوھری لکھتے ہیں

"اللب خالص كل شيء"[1]

لب (پیش کے ساتھ) کا معنی کسی چیز کو خالص کرنے کے ہیں (جو کسی قسم کی آمیزش وغیرہ سے پاک ہو)

اصطلاحی مفہوم

اللُب کا معنی عقل کا کامل اور خالص ہونا۔ خالص سے مراد یہ ہے کہ جس میں کسی قسم کا شک وشبہ، وہم، ظن اور جذبات کی آمیزنہ ہو، عقل کو لب کہنے کہ وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی جتنی بھی قوتیں ہوتی ہیں ان سب میں خالص تر ہوتی ہے اور ان سب کا خلاصہ شمار کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے کسی چیز کے خالص حصے کو عربی میں لُب اور لباب کہا جاتا ہے جیسے ہم اردو میں کسی بات کے خلاصہ کے لیے لُب لباب کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"اللب هو ما زكى من العقل، فكلّ لبّ عقل وليس كلّ عقل لبّا،ولهذا علّق الله تعالى الأحكام التي لا يدركها إلّا العقول الزّكيّة بأولي الْأَلْبَابِ"[2]

(بعض اہل لغت کے نزدیک) لُب خالص اور صاف ستھری عقل کے لیے استعمال کی جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے نزدیک ہر لُب کو عقل کہا جائے گا مگر ہر عقل کو لُب نہیں کہہ سکتے (اس لیے کہ وہ آمیزش سے پاک نہیں ہوتی)، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اولوالالباب کی اصطلاح صرف انہی عقلوں کے لیے بیان فرمائی ہے جو پاک اور صاف ستھری ہوں اور جو احکام کا مکمل ادراک کر سکتی ہوں۔

اسی وجہ سے سورۃ البقرہ میں حکمت انہی لوگوں کو عطا کرنے کا اعلان کیا گیا جو اولوالالباب کی صفت سے متصف ہیں[3]۔ امام ابن جریر الطبریؒ نے اولوالالباب کا معنی عقل سے کیا ہے، آپ کے نزدیک يَا أُولِي الْأَلْبَابِ کا معنی یا أولی العقول[4] ہے۔ اسی طرح امام رازیؒ نے بھی الالباب لُب کی جمع لکھی ہے جس کا معنی خالص کرنے کے ذکر کیے گئے ہیں[5]۔ أبو إسحاق ثعلبیؒ نے الالباب کا معنی (ما صفا من دواعي الهوى)[6] اپنے ھوای نفسانی خواہشات یعنی اپنی پسند اور ناپسند اور اپنے نفع ونقصان والے دل سے پاک ہو، خالص اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہے، ایسے لوگ قرآن کی نگاہ میں اولو

۱۔ الجوھری، الصحاح، ۲۲۷/۲

۲۔ الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ۷۳۳/۱

۳۔ ارشاد ربانی ہے: يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (جسے چاہتا ہے دانائی عطا فرما دیتا ہے، اور جسے (حکمت و) دانائی عطا کی گئی اسے بہت بڑی بھلائی نصیب ہو گئی، اور صرف وہی لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو صاحبِ عقل و دانش ہیں) (البقرہ: ۲۶۹/۲)

۴۔ الطبری، جامع البیان، ۲۸۸/۳

۵۔ رازی، مفاتیح الغیب، ۳۳۱/۵

۶۔ الثعلبی، الکشف والبیان، ۲۷۲/۲

الالباب ہیں، ایسے لوگ کھرے اور سچے اور سُچے ہیں۔آپ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں جس نے غیر اللہ سے دل کو خالص کر لیا وہی اولو الباب ہیں۔[1]

قرآن کریم کی آیات میں اور زمین وآسمان کی تخلیق میں سچے دل اور پختہ نظر سے غور وفکر کرنے والوں کو اولو الالباب کا لقب دیا گیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾[2]

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کی گردش میں عقل سلیم والوں کے لیے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں

امام رازی لکھتے ہیں:

إنكم لما كنتم من أولي الألباب كنتم متمكنين من معرفة هذه الأشياء والعمل بها فكان وجوبها عليكم أثبت وإعراضكم عنها أقبح[3]

اولی الالباب کا ایک معنی یہ ہے کہ اگر تم میں اولی الالباب کی صفت ہے تو تمہیں ضرور ان اشیاء کی معرفت نصیب ہو گی اور ان پر عمل کرنے کی بھی صلاحیت اور توفیق ہو گی

ایک اور مقام پر آپ تحریر کرتے ہیں:

فالمراد به العقلاء الذين يعرفون العواقب ويعلمون جهات الخوف.[4]

اولو الالباب سے ایسے لوگ مراد ہیں جو اپنے انجام کو پہچاننے والے اور ہر اس جہت سے باخبر ہوتے ہیں جہاں سے ان کو خوف کا اندیشہ ہوتا ہے۔

تمام مقامات پر قرآن کریم میں اولو الالباب کی صفت آیات کے آخری حصے میں بیان کی گئ ہے۔ یہ صفت جتنے مقامات پر بھی وارد ہوئی ہے، ان آیات کے پہلے حصے میں اللہ تعالی نے ہر ایک جگہ پر کچھ اور صفات بیان فرمائیں ہیں اور پھر اس کے بعد اولوالالباب کی صفت بیان فرمائی ہے۔ مثلا کچھ مقامات پر اولو الالباب کو تقوی کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے یعنی اہل تقوی ہی اولو الباب کی صفت والے ہیں۔ اور کچھ مقامات پر غور وحوض، وعظ ونصیحت کو قبول کرنے والوں کو اولو الالباب کہا گیا ہے۔ کچھ مقامات پر آسمان وزمین میں تفکر کرنے والوں کو اولو الالباب کا خطاب دیا گیا ہے اور ایک مقام پر اتباع حق کرنے والوں کو اولو الالباب کی صفت سے نوازا گیا ہے۔ یعنی ہر ایک مقام پر اولو الالباب کی صفت کا الگ مفہوم اور معنی ہے۔ جو کہ اس صفت سے پہلے آیات میں موجود شرائط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔

۱۔ ایضاً، ۲۷۳/۲

۲۔ آل عمران: ۱۹۰/۳

۳۔ رازی، مفاتیح الغیب، ۳۲۲/۵

۴۔ ایضاً، ۳۳۰/۵

اہل تقوی سے مراد اولو الالباب ہیں

اللہ تعالیٰ نے اولو الالباب کی صفت قرآن کریم میں سولہ مقامات پر ذکر فرمائی لیکن اولی الالباب کے ساتھ حرف خطاب (یا) جو کہ صیغہ تکریم اور باعث شرف انسانی ہے اس کو صرف انہی آیات کے ساتھ ذکر فرمایا جن میں اولی الالباب کا تعلق اہل تقوی کے ساتھ تھا۔ جیسا کہ درج ذیل آیات سے واضح ہو جاتا ہے:

﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾[1]﴿وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ﴾[2]

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾[3] ﴿أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ﴾[4]

اس مقام پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جاہلوں سے (حرف خطاب) سے خطاب نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا ان آیات میں حرف خطاب اس بات کو واضح کرتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں تقویٰ ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں وہ نہایت قابل شرف اور قابل تکریم لوگ ہیں، تقویٰ کے بھی اگرچہ مراتب ہیں مگر یہاں اولی الالباب ایسے متقی لوگوں کو کہا گیا ہے جو صغائر اور کبائر دونوں سے حالت تقویٰ میں ہوتے ہیں[5]۔ جار اللہ زمخشری لکھتے ہیں:

أن قضية اللب تقوى الله، ومن لم يتقه من الألباء فكأنه لا لب له[6]

تقوی ہی اولو الباب (کھرے اور سچے لوگوں) کی پہچان ہے جو شخص متقی نہیں وہ اولو الباب بھی نہیں

اہل علم اور اہل تدبر اولو الالباب ہیں

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾[7]

اور نصیحت حاصل نہیں کرتے مگر وہی لوگ جو عقل و بصیرت رکھنے والے ہیں۔

جب انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور حکمت ظاہر ہوتی ہے تو اس کو تدبر و تفکر کی قوت اور صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے، پھر وہ اپنے دل میں موجود انوار و تجلیات کے حاصل ہونے کو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ اور اس کا خاص کرم سمجھتا ہے۔ ان انوار و تجلیات کے حصول میں کسی قسم کے اسباب کو کوئی دخل نہیں اور نہ ہی کسی انسان کے

۱۔ البقرہ: ۱۷۹/۲

۲۔ البقرہ: ۱۹۷/۲

۳۔ المائدہ: ۱۰۰/۵

۴۔ الطلاق: ۱۰/۶۵

۵۔ دیکھیے: رازی، مفاتیح الغیب، ۵۶۵/۳

۶۔ الزمخشری، جار اللہ، الکشاف، ۲۴۴/۱

۷۔ البقرہ: ۲۶۹/۲

بس میں ہے کہ وہ کسی کی عقلی صلاحیتوں کو زیادہ یا کم کر دے۔ اسباب کے ہیر پھیر اور اس کی منتقلی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو اُولی الالباب ہیں۔[1]

سورۃ ابراھیم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾[2]

یہ (قرآن) لوگوں کے لیے کاملاً پیغام کا پہنچا دینا ہے، تاکہ انھیں اس کے ذریعہ ڈرایا جائے اور یہ کہ وہ خوب جان لیں کہ بس وہی (اللہ) معبود یکتا ہے اور یہ کہ دانش مند لوگ نصیحت حاصل کریں۔

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا کہ انبیاء علیھم السلام کی بعثت کا مقصد اولی الالباب کو نصیحت کرنا تھا۔ انسان کی وجہ فضیلت اور وجہ تکریم عقل کا ہونا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اولی الالباب کا ایک تعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھی رکھا ہے اور ایک تعلق ان کی امت کے اہل عقل کے ساتھ رکھا ہے، اس طرح اولی الالباب کی نسبت انبیاء کرام کی طرف ہونے کی وجہ سے اس صفت کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی ہے۔ امام رازیؒ لکھتے ہیں:

فلولا الشرف العظيم والمرتبة العالية لأولي الألباب لما كان الأمر كذلك[3]

اگر اولی الالباب کی صفت اعلیٰ اور مستحسن نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس مقام پر اس کا ذکر نہ فرماتے۔

اس طرح صفت اولوالالباب کی فضیلت سے یہ بات واضح ہوئی کہ اولوالالباب بھی خاص لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ اور حکمت کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اولو الالباب کی صفت بھی حکمت کی صفات میں سے ایک ہے۔ اور یہ بھی قرآن کریم کی اصطلاح الحکمة کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

اولی الالباب کی تعلق اہل علم کے ساتھ بھی ہے، قرآن کریم کے مطابق

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾[4]

اہل علم اولو الالبا ب ہیں اس آیت کریمہ میں علم کی فضیلت کے ساتھ اولوالالباب کی صفت استعمال فرمائی گئی ہے، امام رازی نے اولی الالباب کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

هذا التفاوت العظيم الحاصل بين العلماء والجهال)[5]

اولو الالباب کی صفت علماء اور جہلا کے درمیان عظیم تفاوت پیدا کرتی ہے

اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کے ذرائع اور اس کے اسباب مہیا فرمائے تو انھوں نے ان وسائل اور ذرائع کا حکمت اور عقل کے ذریعے درست استعمال کر کے اس سے علم حاصل کیا جب کہ یہی وسائل اور ذرائع کفار کے پاس

۱۔ صدیق حسن، محمد، فتح البیان فی مقاصد القرآن، ۵۲۲/۱۸

۲۔ ابراھیم: ۵۲/۱۴

۳۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۱۱۵/۹

۴۔ الزمر: ۹/۳۹

۵۔ دیکھیے: رازی، مفاتیح الغیب، ۴۲۹/۲۶

بھی تھے لیکن انہوں نے ان سے فائدہ حاصل نہ کیا تو وہ اولو الالباب کی صفت سے خالی رہے۔ اسی طرح اولی الالباب کا ایک معنی علم میں کامل پختگی رکھنے والے اور صحیح دماغ اور نہایت باریک بینی سے دیکھنے اور غور و فکر کرنے والے مراد ہیں[۱]۔

مفسرین کی ان آراء سے واضح ہوتا کہ عقلی دلائل کو درجہ بدرجہ ترتیب دینا اور پھر گہری نظر و استدلال کرنے والے اولی الالباب ہیں۔ قرآنی کریم کی اصطلاح کے الحکمة کے بھی یہی مقاصد اور مفاہیم ہیں

خلاصہ

دورِ حاضر کے اعتبار سے اگر یہ دیکھا جائے تو بے جان ہو گا کہ عقل مندی اور اہل بصیرت کے صحیح پہچان بھی یہی ہے کہ فرائض پر مستحبات کو ترجیح نہ دی جائے۔ عصر حاضر میں اسلامی معاشروں میں ایسا ہو رہا ہے جن کی وجہ سے اسلامی اقدار زوال پذیر ہو رہی ہیں، احکام شریعت کے ہر درجہ کا اپنا مقام ضرور ہے مگر ضروری ہے کہ اسے اپنے مقام اور مرتبہ تک ہی رکھا جائے اور اس سے کم اور زیادہ نہ کیا جائے۔ اہل بصیرت اور اہل نگاہ کی اسی طرز عمل کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اسلامی معاشرے میں اس چیز پر سختی کرتے ہیں کہ فرائض اور واجبات کو اپنے درجے میں جب کہ مستحبات اور مباح کو اپنے اپنے درجے میں رکھا جائے۔ ہر ایک کو اپنے مقام پر رکھ کر اس پر عمل بجالانے والے کو اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی حکمت نصیب ہوتی ہے۔ اسی حکمت کی طرف تو قرآن کریم نے بار بار اشارہ فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے کہ وہ یہ خوبی اور کمال جس کو چاہے عطا فرمادے۔ جس کو اولو الالباب کی صفت عطا فرمائی گئی اس کو حکمت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت عطا کی گئی۔ یہی قرآن کریم کی صفت اولو الالباب کا تقاضا ہے۔ اور یہی اصطلاح قرآنی الحکمة کا بھی تقاضا اور معنی و مفہوم ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ اصطلاح قرآنی اولو الالباب بھی قرآن کریم کی جامع اصطلاح الحکمة کی صفات میں سے ایک صفت، اس کے اجزاء میں سے ایک جُز اور اس کے ارکان میں سے ایک رُکن ہے۔

۱۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۱/۴۳۳

۱۲۔ أولی الابصار

قرآن کریم کی اصطلاح اولی الابصار بھی قرآن کریم کی آیات کے آخر میں بطور صفت استعمال ہوئی ہے۔

لغوی معنی

فیروز آبادی لکھتے ہیں:

''البَصَرُ، محرَّكةً: حِسُّ العَيْنِ، أبْصارٌ،ومن القَلْبِ: نَظَرُهُ وخاطِرُ، والبصيرُ: المُبْصِرُ، ج: بُصَراءُ، والعالِمُ، وبالهاءِ: عَقيدَةُ القَلْبِ، والفِطْنَةُ، وما بينَ شُقَّتَيِ البيتِ، والحُجَّةُ''[۱]

بَصَر آنکھ کو کہا جاتا ہے اور ابصار اس کی جمع ہے، پھر نظر اور دل سے کسی طرف دیکھنے یا متوجہ ہونے پر بصارت کا اطلاق کیا جاتا ہے، اور بصیرت اور البصیرہ کا معنی نہایت اعلیٰ قابلیت اور مضبوط ذہینت کا مالک ہے (جو دلیل اور برھان سے گفتگو کرنے والا ہو وہ اہل بصیرت میں سے ہے)۔

ابن فارس لکھتے ہیں:

''الْبَاءُ وَالصَّادُ وَالرَّاءُ أَصْلَانِ: أَحَدُهُمَا الْعِلْمُ بِالشَّيْءِ; يُقَالُ: هُوَ بَصِيرٌ بِهِ''

کسی چیز کا علم حاصل ہو جانا۔ جیسے کہا جائے کہ فلاں شخص کو اس چیز کی بصیرت حاصل ہو گئی یعنی علم (کامل) حاصل ہو گیا۔ اسی سے بصیرت ماخوذ ہے جس کا معنی (وَالْبَصِيرَةُ: الْبُرْهَانُ. وَأَصْلُ ذَلِكَ كُلِّهِ وُضُوحُ الشَّيْءِ)[۲] ہے، یعنی جس کا پاس علم کی قطعی دلیل اور برھان ہو اور کسی چیز کا علم اور اس کی حقیقت مکمل طور پر واضح ہو جائے تو اس کو بصیرت اور اس شخص کو اہل بصیرت کہا جاتا ہے۔

اصطلاحی مفہوم

علامہ راغب اصفہانی کے نزدیک

ولا يكاد يقال للجارحة بصيرة، ويقال من الأوّل: أبصرت، ومن الثاني: أبصرته وبصرت به، وقلّما يقال بصرت في الحاسة إذا لم تضامّه رؤية القلب[۳]

بصیرت کا اطلاق صرف آنکھ سے دیکھنے کے معنی میں نہیں ہوتا۔ ظاہری آنکھ کے لیے بصر اور ابصرت اور بصارت الفاظ مستعمل ہیں۔ لیکن جب صرف ظاہری آنکھ دیکھے اور اس کے ساتھ قلب کی نگاہ اور

۱۔ الفیروز آبادی، القاموس المحیط، ۳۵۱/۱

۲۔ ابن الفارس، مقاییس اللغۃ، ۲۵۴/۱

۳۔ الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ۱۲۸/۱

قلبی توجہ شامل نہ ہو تو اس کے لیے بَصُرت کا استعمال بہت قلیل ہے[1]، جب کہ قرآن کریم کی اصطلاح البصیرۃ جو ابصار کی جمع ہے اس کا معنی عبرت اور معرفت کے ہیں۔[2]

أولی الابصار ہی اہل معرفت ہیں

علامہ سمرقندیؒ نے اولی الابصار کی تعریف میں لکھتے ہیں:

لأولي الأبصار يعني لذوي العقول والفهم في الدين)[3]

یعنی ایسے لوگ جو اہل عقل اور دین کا فہم رکھنے والے ہیں۔

اس کے علاوہ امام رازی کے مطابق اولی الابصار ہی اہل معرفت ہیں:

لأولي الأبصار أي لأولي العقول، كما يقال: لفلان بصر بهذا الأمر، أي علم ومعرفة[4]

ایک اور مقام پر آپ نے اولی الابصار کا مفہوم میں حضرت ابن عباس کا قول نقل فرمایا ہے (قال ابن عباس: يريد يا أهل اللب والعقل والبصائر)[5]

امام قرطبیؒ سورۃ النور کی آیت کریمہ

﴿يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ﴾[6]

کے تحت لکھتے ہیں:

(عن درك الحق والاعتبارهى اولى الابصار)[7]

(حق اور عبرت اور نصائح کا ادراک کرنے والے ہی اولی الابصار (اہل بصیرت) ہیں۔

اولی الابصار ہی عبرت حاصل کرنے والے ہیں

قرآن کریم کی روشنی میں انسان کا دشمن ابلیس، قوت شہوات، اور نفس امارہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو حواس خمسہ ظاہرہ بھی ایک خاص مقصد اور منفعت کے لیے عطا فرمائے ہیں۔ ہر ایک حس کا اپنا فائدہ اور اپنا مقصد

۱۔ اسی وجہ سے ارشاد ربانی ہے: لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ (تم ان (بتوں) کی پرستش کیوں کرتے ہو جو نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں) (مریم: ۴۲/۱۹)

۲۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (میں پوری تحقیق اور معرفت کے بعد تم کو اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف دعوت دیتا ہوں) یوسف: ۱۰۸/۱۲

۳۔ السمرقندی، بحر العلوم، ۵۱۸/۲

۴۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۱۵۹/۷

۵۔ ایضاً، ۵۰۴/۲۹

۶۔ اور اللہ رات اور دن کو (ایک دوسرے کے اوپر) پلٹتا رہتا ہے، اور بیشک اس میں عقل و بصیرت والوں کے لیے (بڑی) رہنمائی ہے) النور ۴۴/۲۴

۷۔ القرطبی، الجامع الاحکام القرآن، ۷۷/۱۲

ہے، حس انسانی کو اگر اسی کام کے لیے استعمال کیا جائے جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی تو حواس خمسہ ظاہرہ سے بھی کماحقہ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اولی الابصار یعنی بصیرت والے ایسے لوگ ہیں جو اپنی ظاہری آنکھوں سے کسی واقعے کو دیکھتے ہیں تو اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ یہی قوت بصر کا ایک خاص مقصد اور قرآنی تقاضا ہے۔ اس کے علاوہ باقی حواس کے بھی اسی طرح قرآنی تقاضے ہیں، حواس خمسہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی نورانیت ہے جس کا صحیح اور مثبت استعمال سے ایسی چیزوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے جو انسان کے اندر گناہوں کو ابھارنے والی ہوتی ہیں، قرآن کریم (أُولِي الْأَبْصَارِ) کا وصف انہی لوگوں کے لیے ذکر فرمایا ہے جن کو خیر کثیر، تدبر، تفکر اور حکمت عطا فرمائی گئی ہے۔

ابن عطیہ اور ابو حیان اندلسی نے اپنی تفسیر میں میں اولی الابصار سے اہل بصیرت مراد لیے ہیں اور پھر اہل بصیرت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> "البصيرة هي ما يتفق عن تحصيل العقل للأشياء المنظور فيها بالاعتبار فكأنه قال: قد جاءكم في القرآن والآيات طرائق إبصار الحق والمعينة عليه والبصيرة للقلب مستعارة من إبصار العين، ...... البصيرة الحجة البينة الظاهرة كما قال تعالى: أدعوا إلى الله على بصيرة "[1]
>
> بصیرت سے مراد عقل کو اشیاء سے عبرت کے حصول کے لیے مضبوط اور مستحکم کرنا، جیسا کہ قرآن کریم میں موجود ہمارے لیے حق کی معرفت اور اس کی تبلیغ کی طریقے واضح ہوئے ہیں، بصیرت قلب کو بصیرت عین سے استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ بصیرت کا معنی کامل اور واضح حجت کے ہیں جس کو رد کرنا ناممکن ہو۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ بصیرت یہ نہیں کہ ظاہری آنکھ ہو بلکہ یہ اس کے پاس ایسی قوت اور ملکہ ہو جس سے وہ اشیاء کی معرفت اور حقائق تک رسائی حاصل کر سکے اور اللہ کی نشانیوں سے فائدہ حاصل کر سکے۔ اسی وجہ سے قرآنی آیات اور اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اس کی بصیرت کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی تخلیقات میں غور وفکر کرنے کی حکم دیا گیا ہے اور یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ جو ان آیات سے علم اور عبرت حاصل نہ کرے وہ گویا اس نے اپنے لیے گمراہی مول لی ہے۔ جو ان آیات سے اندھا رہا وہ جائل ہے، بصیرت کا تعلق اور اس کی منفعت خود انسانی ذات کے ساتھ اور اس کی ہدایت کے ساتھ ہے، اسی لیے اس آیت میں ابصر یعنی بصیرت اور اس کے مقابل عمی کا لفظ ہے یعنی بصیرت کے مقابل اندھا پن ہے جو جہالت کو ظاہر کرتا ہے،[2] اس مضمون کی مزید وضاحت اس آیت کریمہ میں ہوتی ہے:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾[3]

۱۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۸۸/۵، مزید دیکھیے البحر المحیط، ۴۰۷/۴

۲۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۹۷/۷

۳۔ الحج: ۴۶/۲۲

حقیقت یہ ہے کہ (ایسوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

امام ابن کثیر کے مطابق اولی الابصار کا مفہوم لکھتے ہیں:

''أَيْ: إِنَّ فِي ذَلِكَ لَمُعْتَبَرًا لِمَنْ لَهُ بَصِيرَةٌ وَفَهْمٌ''[1]

اہل بصیرت اور صحیح وسالم عقل والے مراد ہے۔

قرآن کریم نے جن لوگوں کو عمی (اندھا) اور نابینا کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنی آنکھیں ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی آیات اور اور اس کی تخلیق کو صرف سرسری طور پر دیکھتے ہیں لیکن صاحب بصیرت اور نابلد شخص میں یہی فرق ہے کہ ایک اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتا لیکن دوسرے کے لیے ایک معمولی سی نشانی، ایک ادنی سی تنبیہ اور ایک سرسری سا اشارہ حقائق کا ایک دفتر کھول دیتا ہے۔ ایک دروازہ اس کے لیے کھل جائے تو دوسرے دروازے کھولنے کے لیے کلید ہاتھ آجاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن (أُولِي الْأَبْصَارِ) کہتا ہے کیونکہ ان کی آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت کا نور بھی ہوتا ہے جو جزو میں کل اور قطرہ میں دجلہ کے مشاہدہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آنکھوں کے اندر بصیرت کا نور دل کی راہ سے آتا ہے اور جن کے دل ہی اندھے ہیں تو بصیرت کا ہونا محال ہے۔[2]

ابوالکلام آزاد اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بصیرت کا تعلق قلبی کیفیات کے ساتھ ہے جب اللہ تعالیٰ کسی سے بصیرت کی نعمت لیتا ہے تو اس کی آنکھوں کی بینائی زائل نہیں ہوتی بلکہ اس کے دل سے نورانیت زائل ہو جاتی ہے۔ گویا بصیرت ہی اصلی بصارت ہے۔''[3]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں بینائی سے محروم نہیں ہیں کہ اقوام ہالکہ کے فرسودہ آثار قدیمہ سفر کے دوران ان کو دکھائی نہ دیں مگر ان کی نظر عبرت اندوز نہیں ہے۔ آیات توحید کو دیکھتے ہیں اور توحید کا عقیدہ نہیں رکھتے دلائل حق کو سنتے ہیں مگر دماغ میں ان کو جگہ نہیں دیتے۔ قاضی ثناء اللہ کے نزدیک وجہ یہ ہے کہ آنکھیں بینا ہونے کے باوجود ان کے دل نابینا ہیں وہ فاقد البصر نہیں' فاقد البصیرت ہیں اور دل بھی وہ جو سینوں میں ہیں (یعنی دلوں سے مراد قوت مدرکہ نہیں بلکہ وہ دل مراد ہیں جو مرکز ایمان ہوتے ہیں جو نور توحید کو دیکھتے ہیں)۔ آیت میں تنبیہ کی گئی ہے کہ حقیقی نابینائی آنکھ کا اندھا پن نہیں بلکہ بصیرت کا مفقود ہونا ہے۔[4]

امام سیوطی قتادہ کا قول ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱۸/۲

۲۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، ۲۱۱/۲

۳۔ آزاد، ابوالکلام، ترجمان القرآن، ۲۱۶/۲

۴۔ پانی پتی، ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ۲۵۵۲/۱

" ما هذه الأبصار التي في الرؤوس فانها جعلها الله منفعة وبلغة وأما البصر النافع فهو في القلب"[1]

فانہا لا تعمی الابصار سے مراد ہے یہ سروں کی آنکھیں کیا ہیں کہ اللہ تعالی نے ان کو منافع کا باعث بنایا لیکن نفع دینے والی آنکھیں وہ ہیں جو دل میں ہیں۔

ابن عاشور اولی الابصار کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"أي: فإن الأبصار والأسماع طرقٌ لحصول العلم بالمبصرات والمسموعات، والمدرك لذلك هو الدماغ"

یعنی آنکھیں اور کان ایسے علم کے حصول کے ذرائع ہیں جو علم بصارت اور سماعت سے متعلق ہے لیکن ادراک کا تعلق دماغ کے ساتھ ہے، اگر دماغ کے اندر عقل ہی نہ ہو تو انسان دیکھتے ہوئے نابینا اور سنتے ہوئے بہرا ہے۔

خلاصہ

اس سے ثابت ہوا کہ اولی الابصار کا تعلق قلبی کیفیات اور بصیرت کے ساتھ ہے، قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو اہل بصیرت کہا ہے، اسی طرح اس قرآنی اصطلاح کے ذکر کرنے سے یہ بھی واضح ہوا کہ (أُولِي الْأَبْصَارِ) بھی حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔اور اس کے اوصاف میں سے ایک وصف ہے۔

۱۔ السیوطی، الدر المنثور، ۱۰/۵۰۴

۱۳۔ الحلم

لغوی معنی

لفظ حلم کا معنی تحمل، برداشت، صبر، استقلال اور عقل کے ہیں، امام فراہیدی لکھتے ہیں:

الحِلْمُ هو الأَناة والعقل"[۱]

حلم بردباری، تحمل اور عقل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ابن فارس لکھتے ہیں:

الحلم خلاف الطيش وترك الإعجال بالعقوبة يقال حلمت عنه:أحلم،فأنا حليم"[۲]

حلم طیش (جلال، غصہ اور غضب) کی ضد ہے اور سزا اور بدلہ لینے میں جلدی کرنے سے اجتناب کرنا حلم ہے، کہاجاتا ہے ہے میں نے اس سے حلم کیا یعنی اس سے در گزر کیا، اس کی خطاؤں اور غلطیوں کو معاف کیا اور سنجیدہ پن کا مظاہرہ کیا۔

اصطلاحی مفہوم

انسان کے اندر ایک ایسی حالت کا موجود ہونا کہ جو اسباب انسان کو برائی، غصہ، طیش، قساوت پر ابھاریں تو اس حالت میں اپنی نفس اور جسم پر کنٹرول کرنا اور ثابت قدم رہنا حلم کہلاتا ہے۔ قرآن کریم میں وارد لفظ "احلام"، "حلم"، کی جمع ہے۔ علامہ راغب اصفہانی اس کے معنی لکھتے ہیں:

جب انسان کا نفس غضب کے وقت جوش میں آئے اس وقت غصہ کو ضبط کرنے اور نفس کو کنٹرول میں رکھنے کو حلم کہتے ہیں اور اس کی جمع "احلام" ہے۔[۳]

قرآن مجید میں ہے:

﴿أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُم بِهَٰذَا ﴾[۴]

یا ان کی عقلیں یہ حکم دے رہی ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ﴾[5]

امام قرطبی لکھتے ہیں:

۱۔ الفراہیدی، کتاب العین، ۲۴۶/۳

۲۔ ابن الفارس، معجم مقاییس اللغۃ، ۲۴۸/۱

۳۔ الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ۲۵۳/۱

۴۔ الطور: ۳۲/۵۲

۵۔ یوسف: ۴۴/۱۲

"الأحلام" جمع حلم ، والحلم بالضم ما يراه النائم ، تقول منه حلم بالفتح واحتلم ، وتقول : حلمت ، بكذا وحلمته"[1]

الاحلام "حلم" کی جمع ہے اور حلم اسے کہتے ہیں جس کو سونے والا دیکھتا ہے اسی سے حلم اور احتلم ہے اسی طرح حلمت بکذاوحلمته بھی ہے واس کی اصل انات ہے جبکہ اسی سے حلم ہے جو طیش کی ضد ہے نیند کے اندر دکھائی جانے والی بات کو حلم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ نیند اطمینان اور سکون کی حالت ہوتی ہے۔

آپ حلم کے معنی کی مزید وضاحت لکھتے ہوئے کہتے ابو ذؤیب کا قول نقل کرتے ہیں:

ان تذعمینی کنت اجهل فیکم

فانی شریت الحلم بعدک بالجهل [2]

(اگر تو مجھے گمان کرتی ہے کہ میں تم سے ناواقف ہوں تو میں نے تیرے بعد جہالت کے بدلے حلم کو اختیار کیا۔)

حدیث مبارکہ میں ہے۔

(إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ، وَإِنَّمَا الْحِلْمُ بِالتَّحَلُّمِ، مَنْ يَتَحَرَّ الْخَيْرَ يُعْطَهُ، وَمَنْ يَتَوَقَّ الشَّرَّ يُوقَهُ)[3]

(حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ہے فرمایا: علم سیکھنے سے آتا ہے اور حلم برداشت کرنے سے آتا ہے جو خیر کو تلاش کرتا ہے وہ اسے عطا کی جاتی ہے اور جو شر سے بچتا ہے اسے اس سے بچایا جاتا ہے۔)

امام رازی لکھتے ہیں:

"نقول جمع حلم وهو العقل وهما من باب واحد من حيث المعنى، لأن العقل يضبط المرء فيكون كالبعير المعقول لا يتحرك من مكانه، والحلم من الحلم وهو أيضا سبب وقار المرء وثباته"[4]

احلام "حلم" کی جمع ہے اور اس کا معنی عقل ہے ارض بھی انسان کو ضبط اور کنٹرول میں رکھتی ہے، لہٰذا عاقل اس بندھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے جو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا اور حلم بھی عقل کے آثار سے ہے اور حلم انسان کے وقار اور اس کے ثبات کے آثار سے ہے، نیز عقل کا معنی منع کرنا ہے، اسی وجہ سے دیات کو عقول کہا جاتا ہے کیونکہ دیت انسان کو ایسی جارحیت کے ارتکاب سے روکتی ہے اور منع کرتی ہے جس کے ارتکاب کے بعد انسان کو بعد میں تاوان ادا کرنا پڑے اور اس میں ایک لطیف معنی ہے اور وہ یہ ہے کہ حلم اصل لغت میں اس خواب کو کہتے ہیں جو سونے والا دیکھتا ہے پھر اس کو انزل ہو جاتا ہے اور اس پر غسل لازم آتا ہے اور یہ بلوغ کا سبب ہے اور اسی وقت انسان مکلّف ہوتا ہے اور گویا کہ اللہ تعالیٰ اپنی لطیف حکمت سے اس کی شہوت کو عقل کے ساتھ مقرون کر دیتا ہے اور جب اس کی شہوت کا ظہور ہوتا

۱۔ القرطبیّ، الجامع لاحکام القرآن، ۳۳/۴

۲۔ ایضاً، ۳۳/۴

۳۔ الطبرانی، المعجم الکبیر، ۱۷۶۳/۴، ۳۴۲، اس حدیث کو البانی نے اپنے سلسلہ الصحیحہ میں حسن قرار دیا ہے، (۶۷۰/۱)

۴۔ الرازی، تفسیر کبیر، ۲۹۹/۵

ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عقل کو کامل کر دیتا ہے سو عقل کی طرف حلم سے اشارہ کیا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ عقل کامل انسان کو برے کاموں سے ڈرانے والی ہے اور عقل ہی کی وجہ سے انسان مکلّف ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ابراھیم علی السلام کو اس اکملیت کی بنیاد پر

﴿لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ﴾[1]

سے یاد کیا جاتا ہے۔

قاضی ثناء اللہ لکھتے ہیں (الحلم بالكسر الاناءة والعقل فهو حليم)[2] کہ نرمی، بردباری، سوچ سمجھ کر اور تدبر و تفکر سے کام کرنا حلم کہلاتا ہے۔

ابن عاشور لکھتے ہیں (صفة في النفس وهي رجاحة العقل وثباتة ورصانة وتباعد عن العدوان)[3] کہ حلم انسان کی باطنی صفت کا نام ہے جو عقل کو جہالت سے بچاتی ہے اور عقل کو مضبوط کرتی ہے اور سرکشی سے بچاتی ہے۔

حلم حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح

قاضی ثناء اللہ لکھتے ہیں

الْحِكْمَةَ فى القاموس وهى العدل والعلم والحلم والنبوة والقران والإنجيل[4]

الحکمۃ کا اطلاق عدل، علم، حلم، نبوت، قرآن کریم اور انجیل پر بھی ہوتا ہے

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حلم بھی حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے۔

عبد الحق حقانی لکھتے ہیں:

سفاہت کے مقابلہ میں اناءت اور حلم آتا ہے کہ جس کے معنی سوچ اور سمجھ کے ہیں۔[5]

ایک اور مقام پر آپ حلم کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ صبر نفسانی یہ ہے کہ نفس کو اس کی خواہشوں سے روکے۔ اگر خواہش شکم و آلہ تناسل کو روکے گا تو اس کو عفت کہیں گے اور اگر فضول چیزوں کی خواہش سے روکے گا تو اس کو زہد و قناعت کہیں گے۔ اگر غصہ کی حالت میں اپنے دشمن سے درگزر کرے گا اور نفس کو انتقام لینے سے روکے گا تو اس کو حلم کہیں گے۔[6]

۱۔ التوبہ: ۱۱۴/۹

۲۔ پانی پتی، تفسیر مظہری، ۱۶۹۶/۱

۳۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۴۶/۱۱

۴۔ پانی پتی، تفسیر مظہری، ۳۰۲۴/۱

۵۔ الحقانی، تفسیر حقانی، ۱۹۴/۱

۶۔ الحقانی، تفسیر حقانی، ۲۴۶/۱

صوفی عبدالحمید سواتی سورۃالنور کی آیت مبارکہ[1] کی تفسیر میں حلم کو بردباری یعنی حکمت کے ہم معنی اور جہل کے مقابلے میں مستعمل لکھا ہے۔[2]، جیسا کہ قرآن مجید میں قوم شعیب کی جہالت کے مقابلے میں شعیب علیہ السلام کا حلم و بردباری آیا ہے۔[3]

امین اصلاحی لکھتے ہیں کہ جہل کا لفظ علم کے مقابل میں بھی آتا ہے اور حلم (دانش) کے مقابل میں بھی[4]، اسی طرح آپ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ جہالت عام طور پر علم کے بجائے حلم کے ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔[5] مفتی محمد شفیع بھی لکھتے ہیں کہ حلم جہالت کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حلم حکمت کے قریب المعنی قرآنی اصطلاح ہے، آپ مزید لکھتے ہیں:

> لفظ حکمت قرآن کریم میں متعدد معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ علم، عقل، حلم و بردباری، نبوت، اصابت رائے۔[6]

اسی وجہ سے حلم ابراھیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴾[7]

امین احسن اصلاحی ایک مقام پر سکینہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سکینت، سے مراد یہاں صبر، حلم، رزانت اور حکمت وتدبر ہے۔ اجتماعی زندگی میں ایسے مراحل بہت پیش آتے ہیں جب کسی جماعت کے حلم وتدبر کا نہایت سخت امتحان ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اگر جماعت حریف کے رویہ سے مشتعلہ وکر کوئی عاجلانہ قدم اٹھادے تو اس سے اصل مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ ایسے امتحانات سے کوئی جماعت اور اس کے لیڈر حسن وخوبی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور یہ توفیق ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر حال میں اپنے رب سے وابستہ رہتے ہیں۔[8]

سورۃالصافات میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

۱ ۔ ﴿وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (اور جب تم میں سے بچے حدِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو وہ (تمہارے پاس آنے کے لئے) اجازت لیا کریں جیسا کہ ان سے پہلے (دیگر بالغ افراد) اجازت لیتے رہتے ہیں، اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام خُوب واضح فرماتا ہے، اور اللہ خوب علم والا اور حکمت والا ہےo)(النور: ۵۹/۲۴

۲ ۔ سواتی، معالم العرفان، ۹۷/۳

۳ ۔ ﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ﴾(وہ بولے! اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہی حکم دیتی ہے کہ ہم ان (معبودوں) کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں یا یہ کہ ہم جو کچھ اپنے اموال کے بارے میں چاہیں (نہ) کریں؟ بیشک تم ہی (ایک) بڑے تحمل والے ہدایت یافتہ (رہ گئے) ہو)ھود: ۸۷/۱۱

۴ ۔ اصلاحی: تدبر قرآن، ۱۴۵/۱

۵ ۔ ایضاً، ۷۶/۲

۶ ۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۱۲۱/۳

۷ ۔ ھود: ۷۵/۱۱

۸ ۔ اصلاحی: تدبر قرآن، ۲۲۱/۶

﴿فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيۡمٍ﴾[1]

جن چیزوں کی اصلاح اہل طریقت کے نزدیک زیادہ تر ملحوظ ہے وہ تین قوت ہیں۔ایک شہوت ٗ دوسری غضب ٗ تیسری ہواء۔ قوت شہوت کو نفس بہیمی یا بہمیت کہتے ہیں اور اس کی کمی زیادتی جسم کی کمی زیادتی سے ہوتی ہے اور غضب کو نفس سبعی اور سبعیت بھی کہتے ہیں یعنی درندہ پن اور ہوا کو نفس شیطانی اور شیطانیت بھی کہتے ہیں۔ لیکن سب میں زیادہ تیز ہوا ہے کہ جو جسم کے پژمردہ ہونے سے بھی کم نہیں ہوتی۔اس کے بعد غضب ہے پھر شہوت۔آپ یہ بھی جان چکے ہیں کہ جب یہ تینوں صلاحیت پر آتی ہیں تو عفت اور حلم وغیرہ صفات حمیدہ پیدا ہوتی ہیں کہ جن کو عدالت کہتے ہیں کہ جس کے سبب حضرت انسان ملائکہ سے فوقیت لے گئے اور خلیفہ بنائے گئے۔ مگر اسی طرح جب یہ قویٰ خراب ہوتے ہیں تو انسان کو درندہ ٗ گدھا ٗ شیطان بنا دیتے ہیں۔[2]

خلاصہ

قرآنی اصطلاحات میں سے الإصلاح (اپنی ذات کی درستگی،اخلاق کی پاکیزگی،اپنے طرز عمل کیااصلاح)،التدبر (امور دینی و دنیاوی کے انجام دہی کے وقت ان کے مقاصد، ان کی حقیقت اور ان کے اچھے یا برے انجام اور نتائج سے باخبر ہونا)،التذکر (عقل اور دل پر گندگی اور برائیوں کے حجابات کو دور کر کے اپنی ذات میں اور کائنات میں پھیلی تمام اشیاء کا بنظر غور مطالعہ میں تسلسل اور تکرار)،التفکر (اشیاء کی حقیقتوں کی طرف اپنے دل ودماغ کو بار بار متوجہ کرنا)،السدید (ایسا قول یا فعل جو نفاق وغیرہ سے پاک ہو اور حق کی جانب لے جانے والا ہو)،العقل (برے اور فاسد امور سے بچنا اور درست اور حقیقت کے متلاشی ہونا)،الفرقان (ایسی صفت اور صلاحیت جو حق اور باطل کے درمیان یا اچھائی اور برائی کے درمیان فرق کر دے)،القسط (اقوال اور امور کو درست اور حق کی جانب رکھنا)المتوسم (ایسی صلاحیت جس کی وجہ سے اقوال ، افعال ،قصص سے یا مختلف امور کی حقیقت کو پہچاننا اوران سے عبرت حاصل کرنا)،النُّھی (غوو فکر کی صلاحیت اور اشیاء کو باریک بینی سے سمجھنے کی قوت میں کامل ہونا)، اولو الالباب(اپنے دل اور عقل کو خواہشات نفسانی سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خالص کرنا اور اللہ کی آیات سے استفادہ کے لیے کوشش کرنا)،اولی الابصار (قلبی بصیرت کی ایسی قوت وصلاحیت جس سے معرفت الٰہی کے حصول کے لیے کائنات کے اشیاء کی معرفت حاصل ہو)،الحلم (ایس صلاحیت جو صبر و طمانیت پیدا کرے اور جس سے عجز وانکساری اور نرمی حاصل ہو جو جہالت ختم کر کے علم کامل کی طرف رہنمائی کرتی ہے)

مقالہ میں ان صفات کو ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کے اندر حکمت پیدا ہوتی ہے۔اور ان سب صفات کا تعلق حکمت کی صفات میں سے کسی نہ کسی ایک صفت کے ساتھ ہے۔ ان سب صفات کو کسی انسان میں یکجا ہونا یا ان میں سے بعض کا ہونا یا کسی ایک کے بھی ہونے سے اس کے اندر

۱ ۔ الصافات: ۱۰۱/۳۷

۲ ۔ الحقانی: تفسیر حقانی، ۷/۱

حکمت کی صفت پائی جاتی ہے۔اس لیے کہ قرآن کریم کی روشنی میں یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور وہ اپنے خاص بندوں کو عطا کرتا ہے۔لہٰذا اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی اصطلاح اور صفت الحکمۃ کی حیثیت ایک کلی ہے اور یہ باقی تمام مذکورہ صفات اور صلاحیتیں اس کے تحت آتی ہیں اور یہ تمام اصطلاحات اور صفات اس کے اقسام میں سے ایک قسم اور اس کے ارکان کا ایک رکن ہے۔قرآن کریم کی یہ تمام اصطلاحات الحکمۃ کے قریب المعنی قرآنی اصطلاحات ہیں اور ان پر بھی حکمت کا ادنی اطلاق ضرور ہوتا ہے۔

باب دوم

قرآن کریم میں حکمت کی جہات اور حکمت کے تفسیری اطلاقات میں مفسرین کی آراء کا تجزیہ

فصل اول: اللہ تعالیٰ کی صفت الحکیم کے تفسیری اطلاقات

فصل دوم: قرآن کریم کی صفت حکمت کے تفسیری اطلاقات

فصل سوم: نبی کریم ﷺ کی صفت حکمت کے تفسیری اطلاقات

فصل چہارم: انبیاء علیہم السلام کی صفت حکمت کے تفسیری اطلاقات

فصل پنجم: صالحین کی صفت حکمت کے تفسیری اطلاقات

فصل اول

اللہ تعالیٰ کی صفت الحکیم کے تفسیری اطلاقات

اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام قرآن کریم کی آیات کے آخر میں زیادہ استعمال ہوئے ہیں، یہاں یہ ذکر کرنا مقصود نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت حکیم یا حاکم کس کس مقام پر مذکور ہوئی ہے بلکہ اس کے سیاق وسباق کو بھی متعین کرنا مقصود ہے، اس کے ساتھ یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ الحکیم کی صفت اللہ تعالیٰ کے باقی مختلف صفات واسماء کے ساتھ بدل بدل کر آنے میں مفسرین کے نزدیک کیا حکمت ہے؟، نیز یہ ذکر کرنا بھی مقصد ہے کہ جس آیت کریمہ کے آخر میں الحکیم کی صفت ذکر کی گئی ہے اِس مقام پر یہ صفت کن معانی ومفاہیم پر مشتمل ہے، اس لیے کہ مفسرین کریم اور اہل بلاغت کے نزدیک قرآن کریم کی سورتوں کے اختتام میں اعجاز اور بلاغت ہے مگر اس سے کہیں بڑھ کر ہر آیت کے آخر میں بلاغت کا اسلوب زیادہ نمایاں ہے۔علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

’’هِيَ أَيْضًا مِثْلُ الْفَوَاتِحِ فِي الْحُسْنِ لِأَنَّهَا آخَرُ مَا يَقْرَعُ الْأَسْمَاعَ فَلِهَذَا جَاءَتْ مُتَضَمِّنَةً لِلْمَعَانِي الْبَدِيعَةِ مَعَ إِيذَانِ السَّامِعِ بِانْتِهَاءِ الْكَلَامِ حَتَّى يبقى معه للنفوس تشوق إِلَى مَا يُذْكَرُ بَعْدُ لِأَنَّهَا بَيْنَ أَدْعِيَةٍ وَوَصَايَا وَفَرَائِضَ وَتَحْمِيدٍ وَتَهْلِيلٍ وَمَوَاعِظَ وَوَعْدٍ وَوَعِيدٍ إِلَى غَيْرِ ذَلِكَ‘‘[1]

سورتوں کے (اور آیات کے) فواتح کی طرح سورتوں اور آیات کا اختتام بھی اپنے حسن وخوبی میں یکتا اور بے مثال ہے، اسی وجہ سے سامع کے لیے یہ علم جو انتہائے کلام کا سیکھنے کی طرف متوجہ کرتا ہے، جب اختتام عمدہ اور بلاغت سے بھرپور ہو تو عقل وقلب اس اختتام سے ساری بات کو سمجھ لیتا ہے اور اس کے دل میں مزید اس بات میں ابہام، یا مزید بات سننے کا شوق اور انتظار باقی نہیں رہتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ سورتوں کے اختتام دعا، نصیحت، فرائض، تحمید، تحلیل، مواعظ، وعد اور وعید اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام اور قرآن کریم کے مختلف اوصاف پر ہوتا ہے۔

حِکَم کا اصل معنی کسی چیز کی اصلاح کے لیے اسے روک دینے کے ہیں اسی بنا پر لگام کو حکمة الدابة کہا جاتا ہے، الحکمة کا معنی علم وعقل کے ذریعے حق بات دریافت کر لینے کے ہیں لہٰذا حکمت الٰہی کے معنی اشیاء کی معرفت اور پھر نہایت احکام کے ساتھ ان کو موجود کرنا ہیں اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو سرانجام دینے کا نام ہے، جب صفت الحکیم کا اطلاق ذات باری پر ہو تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکیم ہونے پر ہوتے ہیں، ان معنی کے اعتبار سے حکم کا لفظ حکمت کے لیے عام ہے لہٰذا ہر حکمت کو حکم کہا جا سکتا ہے تاہم ہر حِکَم حکمت نہیں ہو سکتا۔[2]

۱۔ السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ۳۵۹/۲

۲۔ الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ۵۵/۴

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات عموماً آیات کے آخر میں وارد ہوئی ہیں[1]، اچھے متکلم کی خوبی اور کمال ہوتا ہے کہ اس کا کوئی بھی کلام ہو اس کے آخری حصہ یا اس کا اختتام پہلے حصہ کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے اور کلام کی ابتداء کا تعلق کلام کے اختتام کے ساتھ ضرور ہوتا ہے، کوئی بھی بات کرنے والا کلام کو احسن انداز سے شروع کرتا ہے اور پھر نہایت ہی اعلی اور تاکید کے ساتھ عمدہ طریقے سے اختتام کرتا ہے تاکہ سامع کو ذہن میں وہ مضمون بہتر طریقے سے راسخ ہو جائے جس مضمون کا ذکر کلام کی ابتداء میں کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ تو خود حکیم ہے اسی وجہ سے آیات کی ابتداء اور انتہاء بھی نہایت احسن طریقے سے کی گئی ہے، اس بلاغت اور اعجاز کو علامہ سیوطی نے براعۃ استہلال[2] کا نام دیا ہے۔[3]، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی صفت الحکیم باقی صفات کے ساتھ مذکور ہوئی ہے۔

الحکیم کا تعلق العزیز کے ساتھ

ارشاد ربانی ہے:

﴿فَإِن زَلَلْتُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾[4]

پس اگر تم اس کے بعد بھی لغزش کرو جب کہ تمہارے پاس واضح نشانیاں آچکیں تو جان لو کہ اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے۔

اس آیت اور اس سے ماقبل آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کی حیلوں، چالوں اور اس کے فریب سے بچنے کے لیے تنبیہ فرمائی ہے، اگرچہ اس قسم کی تفصیل پورے قرآن کریم میں پھیلی ہوئی ہے مگر اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے الحکیم کے ساتھ العزیز کی صفت بیان فرمائی ہے، العزیز کا معنی یہ کہ تمہاری زندگانی بغیر مقصد کے نہیں ہے جان لو کہ جو العزیز یعنی سب سے زیادہ قوت والا ہے ایک دن تم اس کی گرفت میں آؤ گے اور الحکیم کا معنی یہ ہے کہ اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ اس نے تم کو تکرار کے ساتھ ایسی تنبیہات کی ہیں۔ ابو بکر جصاص لکھتے ہیں (وَأَمَّا الْحَكِيمُ فَإِنَّهُ يُطْلَقُ فِي صِفَةِ اللَّهِ تعالى على معنيين) کہ الحکیم جو کہ صفت باری تعالیٰ ہے اس کا اطلاق دو معنی میں ہوتا ہے، العالم کے معنی، اس وقت معنی یہ ہو گا کہ اس کا علم ہمیشہ سے ہے۔ صفت الحکیم کا دوسرا معنی یہ کہ وہ پختہ اور محکم

---

۱ ۔ الحکیم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ مبالغہ کے وزن (فعیل) پر قرآن کریم میں ۹۷ بار وارد ہوا ہے۔ ۸۱ بار یہ صفت (حکیم اور الحکیم) وارد ہوئی ہے۔ سولہ مقامات پر (حکیما) وارد ہوا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں صفت الحکیم اللہ تعالیٰ کے ذاتی اسماء اور صفات کے ساتھ بھی وارد ہوئی ہے۔ (الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ) ۲۹ بار ذکر کی گئی ہے۔ جب کہ (الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ) کی صفت ۴ بار وارد ہوئی ہے۔ (الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ) کی صفت ۳ بار ذکر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کے ساتھ صفت الحکیم (عَزِيزٌ حَكِيمٌ) ۱۸ بار، اور (عَلِيمٌ حَكِيمٌ) ۱۴ بار، (وَاسِعًا حَكِيمًا) ایک مقام پر اور (تَوَّابٌ حَكِيمٌ) بھی ایک مقام پر ذکر کی گئی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: عبدالباقی، فواد، المعجم المفہارس، ص ۲۲۵)

۲ ۔ براعت استہلال علم بلاغت کی اصطلاح ہے کہ ابتدائے کلام میں ایسے الفاظ ذکر کیے جائیں جن سے ماقبل مقصود یا مابعد مقصود کی طرف واضح اشارہ ہو جائے۔

۳ ۔ السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ۲/۲۹۳

۴ ۔ البقرہ: ۲/۲۰۹

کام کرنے والا ہے، جب یہ معنی مراد ہو تو یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ ہمیشہ سے حکیم ہے جس طرح یہ کہنا جائز نہیں کہ وہ ہمیشہ سے فاعل یعنی کام کرنے والا ہے۔ یہاں الحکیم کا معنی یہ ہے کہ وہ ذات نہ تو ظلم کرتی ہے، نہ ہی قبیح امور اس کے ذات سے وقوع ہوتے ہیں نیز وہ ایسا حکیم ہے کہ وہ ایسے کاموں کا ارادہ بھی نہیں فرماتا۔ اس لیے کہ ایسے امور کو بجالانے والا اہل عقل کے نزدیک بھی حکیم نہیں ہوتا۔[1]

سورۃ النساء میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾[2]

بیشک جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے کفر کیا ہم عنقریب انہیں (دوزخ کی) آگ میں جھونک دیں گے، جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم انہیں دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ (مسلسل) عذاب (کا مزہ) چکھتے رہیں، بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

کافروں کو عذاب کی کیفیت کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا اپنی قدرت کاملہ بیان کرنا اور پھر ﴿حکیما﴾ کی صفت کو نکرہ بطور عموم کے ذکر کرنا قرآن کریم کا ایک نہایت ہی اعجازی پہلو ہے، امام رازی کے نزدیک ﴿عزیزا﴾ اور ﴿حکیما﴾ کی صفت کا ذکر غایت حسن کا تقاضا کرتا ہے۔ ﴿حکیما﴾ کا معنی اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان کو عذاب دینا بھی حکمت سے خالی نہیں۔ جب کہ صفت ﴿حکیما﴾ کچھ ابہام کو دور کرنے کے لیے لائی گئی ہے۔ انسانی ذہن میں یہ خیال گزرتا ہے کہ جب ان کے جسم جل جائیں گے تو پھر ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف کیسے منتقل ہو جائیں گے، دوسرا ابہام یہ بھی ہے آگ میں ہمیشہ ہمیشہ جسم کیسے گلتے سڑتے رہیں گے، تو آیت کے آخر میں دو صفات لا کر ان اور ان جیسے اور ابہام کو دور کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اس پر مکمل قادر ہے کہ وہ جسموں کو آگ میں جلاتا رہے، اور پھر ﴿عزیزا﴾ کے ساتھ ﴿رحیما﴾ کی صفت کے بجائے ﴿حکیما﴾ کی صفت یہاں زیادہ مناسب تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اگرچہ رحیم بھی ہے لیکن عذاب دینے میں حکمت یہ ہے کہ کائنات کا نظام اس کے بغیر نہیں چل سکتا کہ نافرمانوں کو ان کی غلطیوں کی سزا نہ ملے۔ پھر ﴿حکیما﴾ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اس کا سزا دینا اس کی صفت قہاریت اور جباریت ہی کو ثابت کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کی نافرمانی واقعتاً تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے جس کے بدلے ان کو عذاب دیا جا رہا ہے۔[3]

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۶۴ میں ہے:

۱۔ الجصاص، احکام القرآن، ۳۹۷/۱

۲۔ النسآء: ۵۶/۲

۳۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۱۰۷/۱۰

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾[1]

اس آیت کریمہ کے آخر میں عزیزا اور حکیما کی صفت لائی گئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے فطرت اور عقل عطا فرمائی ہے۔ خیر اور شر کی تمیز انسان کی اندر رکھی گئی ہے۔ رسولوں کی بعثت اور ان کی تبلیغ کے بغیر بھی وہ اگر انسان کو نافرمانیوں کی سزا دیتا تو یہ بھی اس کی عین حکمت تھی اور العزیز کی صفت بھی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن حکیما کی صفت سے یہ ظاہر ہوتا ہے وہ حجت کے تمام ہونے کے بغیر کسی کو سزا نہیں دیتا، یہ اس کی حکمت ہے کہ اس نے تم پر رحم کیا اور رسولوں کو مبعوث کر کے تم پر اتمام حجت قائم کی تا کہ کسی شخص کو کوئی بھی عذر باقی نہ رہے۔[2]

سورۃ الفتح میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾[3]

قرآن کریم کا اسلوب بیان اور اعجاز نہایت اعلی اور عمدہ ہے کہ اس سے دو آیات پہلے اسی طرح کی آیت ہے جب کہ اس آخر میں فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ ۗ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[4]

جب کہ اس مقام پر عزیزا اور حکیما کی صفت لائی گئی، علامہ کرمانی اپنی کتاب قرآن کریم کے اسرار ور موز میں لکھتے ہیں: (لأن الأول متصل بإنزال السكينة وازدياد إيمان المؤمنين) کہ اس سورت میں تین مقام پر حکیما کی صفت ذکر کی گئی ہے، پہلے مقام پر حکیما کی صفت ذکر کرنے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں پر سکینت نازل کرنے اور ان کے ایمان کو بڑھانے کا ذکر کیا تو حکیما سے اپنی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا، اس لیے کہ یہ علم اور حکمت کا مقام ہے اور پھر چونکہ اس سورت کا نام ہی الفتح ہے تو اللہ تعالیٰ نے جب اپنے نبی کے ذریعے مسلمانوں کے گناہوں کا معاف کرنے ، اپنی نعمت اور نصرت کا اتمام کرنے اور اپنے غلبہ اور طاقت کے ذریعے مسلمانوں کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا تو ساتھ ہی اپنی صفت حکیما نازل فرمائی، (وأما الثاني والثالث الذي بعده فمتصلان بالعذاب والغضب) اس کے علاوہ اس سورت مبارکہ میں باقی دو مقام پر حکیما کی صفت نازل

---

۱ ۔ النسآء: ۱۶۵/۴

۲ ۔ البقاعی، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، ۵۱۳/۵

۳ ۔ الفتح: ۷/۴۸

۴ ۔ الفتح: ۴/۴۸

کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان مقامات پر اللہ تعالیٰ اپنے عذاب، غضب اور تہدید کے ساتھ ساتھ اموال غنیمت کا ذکر فرما رہا تھا تو اس مقام پر حکیما کی صفت کو لانا ہی مناسب تھا اس لیے کہ عذاب الٰہی کے ساتھ اموال غنیمت کا حصول اس کی حکمتوں کو واضح کرتا ہے۔[1]

علامہ شربینی کے نزدیک دونوں مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے لشکروں کا تذکرہ فرما رہا ہے اور آیت کے اختتام پر ایک جگہ حکمت سے ساتھ علم کو ذکر کیا گیا جب کہ دوسری جگہ اپنی قوت، غلبہ اور طاقت کو حکمت کے ساتھ ذکر کیا گیا۔آپ لکھتے ہیں حکیما کی صفت کا سیاق اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ کافر اور منافق یہ سمجھ رہے ہیں کہ مسلمان ہم تک نہیں پہنچ سکتے تو وہ ہمیں ختم کیسے کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کا اظہار کر رہا ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں تم کو تہس نہس کرے بلکہ کتنی قومیں ایسی ہیں جو زلزلوں، طوفانوں اور آندھیوں سے ہلاک ہوئے ، لہٰذا کوئی اس گمان میں نہ رہے بلکہ مسلمانوں کے علاوہ زمین وآسمان کے لشکر اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں، اس کے کچھ لشکر رحمت والے اور کچھ عذاب دینے والے ہیں تو اس سے مسلمانوں کی ضعف کو بھی تقویت دینا مقصود تھا اور کافروں کو یہ بتانا کہ ان کے ذریعے وہ تم کو ہلاک نہیں کر رہا بلکہ مہلت دے رہا ہے اور اس کی یہ حکمت ہے۔[2]

اسی سورت مبارکہ کی کچھ آیات کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾[3]

اور بہت غنیمتیں جن کو وہ لیں گے اور ہے اللہ زبردست حکمت والا

نبی کریم ﷺ جب حدیبیہ سے واپس ہوئے تو ابھی تین ماہ کا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ آپ ﷺ نے اہل خیبر پر حملہ کر دیا اور کچھ جدوجہد کے بعد اس کو فتح کر لیا، پھر مسلمانوں کو بہت زیادہ مال غنیمت ملا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حکیما کی صفت بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے نصرت اور فتوحات کے جو وعدے مسلمانوں سے کیے ہیں وہ صرف وعدوں تک محدود نہیں بلکہ اس کی حکمت سے مسلمان جلد اس کی عملی تعبیر بھی دیکھیں گے، اس کے ہر فعل میں حکمت ہوتی ہے ، اللہ تعالیٰ اپنے ارادے کی تکمیل تب کرتا ہے جب حکمت کا تقاضا ہوتا ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں نے دیکھا کہ تین ماہ کا عرصہ نہیں گزرا ہوگا کہ آپ نے خیبر پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا اور اس میں مسلمانوں کو ڈھیروں مال غنیمت ہاتھ لگا۔[4]

الحکیم کی صفت اور توکل

---

۱ ۔ الکرمانی، محمود بن حمزہ، أسرار التكرار في القرآن المسمى البرهان في توجيه متشابه القرآن لما فيه من الحجة والبيان(القاهرہ: دار الاعتصام، ۱۳۹۶ھ)، ص ۱۹۶

۲ ۔ الشربینی، محمد بن احمد الخطیب، السراج المنير في الاعانة على معرفة بعض معاني كلام ربنا الحكيم الخبير(بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۳۹۵ھ)، ص ۴/۱۶۸

۳ ۔ الفتح: ۱۹/۴۸

۴ ۔ الآلوسی، روح المعانی، ۲۰۷/۵

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ [1]

اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے (ہی) بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بیشک تو ہی بڑا غالب حکمت والا ہے۔

آیت کی تفسیر میں علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

"الْحَكِيمُ الذي لا يثيب ولا يعاقب إلا عن حكمة وصواب" [2]

اس مقام پر صفت الحکیم کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اجر و ثواب دینے میں بھی حکمت ہے اور سزا دینے میں حکمت پوشیدہ ہے۔

اس آیت کے آخر میں العزیز الحکیم ذکر کرنا الغفور الرحیم کی صفت سے اولی ہے۔ کیونکہ غفور رحیم ایسی صفت ہے جو ہر محتاج کے لیے مغفرت کو واجب کرتی ہے اور عزیز رحیم ایسی صفت ہے جو ہر ایک کے لیے مغفرت کو واجب نہیں کرتی' کیونکہ عزیز ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ غالب ہے جو چاہے کرے' کوئی اس کو روکنے والا نہیں ہے اور جب وہ عزیز ہو اور ہر اعتبار سے غالب ہو' پھر اس کا بخش دینا اس کا بہت بڑا کرم ہے اور بعض علماء نے یہ کہا: کہ اگر وہ غفور رحیم کہتے تو یہ متبادر ہوتا کہ وہ شفاعت کر رہے ہیں' اور جب انہوں نے العزیز الحکیم کہا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ معاملہ بالکلیہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ [3]

امام قرطبیؒ کے مطابق:

(فَكَانَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ أَلْيَقَ بِهَذَا الْمَكَانِ لِعُمُومِهِ) [4]

اپنے عموم کی وجہ سے یہاں الحکیم اور العزیز ہی بہتر ہے، اس لیے کہ یہ دونوں شرطوں (عذاب کا دیا جانا اور معاف کر دینا) کو جامع ہے جب کہ الغفور الرحیم یہاں ہوتا تو درست نہ ہوتا کیوں کہ یہ اس عموم کا احتمال نہیں رکھتا جس عموم کا احتمال العزیز الحکیم رکھتے ہیں، اور اس پوری آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا بیان، اس کا عدل اور اس کی ثناء مذکور ہے اس اعتبار سے آیت کے آخر میں العزیز الحکیم ہی ذکر کرنا زیادہ مناسب اور عمدہ ہے۔

۱۔ المائدہ: ۱۱۸/۵

۲۔ الزمخشری، الکشاف، ۶۹۶/۱

۳۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۸۸/۴

۴۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۳۷۸/۶

اس آیت کریمہ میں ﴿الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ قرآن کریم کے مشکلات فواصل[1] میں سے ہے اس لیے کہ ﴿ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ ﴾ تقاضا کرتا ہے کہ فاصلہ (فصل یا اختتام آیت) ﴿الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ ہونا چاہیے تھا لیکن ابن شنبوذ[2] نے حکمت کے بیان میں یہ ذکر کیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہو اس کا عذاب دینا فعل الٰہی ہے جو قادر مطلق ہے جس پر کسی کا بھی حکم نہیں چل سکتا اور وہ حاکم علی الاطلاق ہے ، اسی وصفت قادر مطلق کو ظاہر کرنے کے لیے العزیز کی صفت لائی گئی اور الحکیم کی صفت اس لیے لائی گئی کیوں کہ حکیم وہ ہے جو ہر چیز کو اپنے محل ومقام پر رکھتا ہے لیکن کم عقل اور کم فہم لوگوں کے دل ودماغ میں یہ بات نہیں آتی اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ افعال باری خارج از حکمت ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے لہٰذا اس مقام پر الحکیم کی صفت سے عمدہ پیش بندی کی گئی۔ اسی وصف کے لانے سے گویا معنی یہ ہوا کہ اے اللہ اگر تو ان بندوں کو باوجود کہ یہ تیرے عذاب کے مستحق ہیں معاف فرمادے تو اس معاملے میں کوئی بھی تجھ پر ذرا برابر بھی اعتراض نہیں کر سکتا، جو تو کرے وہی حکمت ہے۔[3]

پھر اسی بلاغت کی مثال

﴿أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾[4]

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر ضرور رحمت کرے گا، بیشک اللہ بڑا اختیار والا ہے، بڑا حکمت والا ہے۔

اور

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ﴾[5]

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو تم ایسے حالات میں زیادہ پریشان ہوتے) اور بیشک اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا بڑی حکمت والا ہے۔

سورۃ غافر میں

---

۱ ۔ یہ اصطلاح علامہ سیوطی نے اپنی کتاب الاتقان میں ذکر فرمائی ہے، آیات کا اختتام اکثر اوقات عقل انسانی کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ اس آیت کی ابتداء اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کلام کو مضبوط، اور سامع کے دل میں راسخ کرنے کے لیے اس کا اختتام ایسا ہی ہونا چاہیے تھا لیکن قرآن کریم میں کچھ مقامات پر آیات کا اختتام عقل انسانی میں دیر سے سمجھ میں آتا ہے، عقل یہ تقاضا کر رہی ہوتی ہے کہ اختتام ایسا ہوگا یا یوں ہونا چاہیے جب کہ آیات کا اختتام ایسے الفاظ سے ہوتا ہے جو اہل بلاغت کے نزدیک تدبر و تفکر کے بعد سمجھ میں آتا ہے اس کو مشکلات فواصل کہا جاتا ہے یعنی آیات کے اختتام کو جلدی سمجھ لینا مشکل ہے۔ (الاتقان: ج ۳، ص ۳۶۰)

۲ ۔ پورا نام: محمد بن احمد بن ایوب ہے، آپ کی تاریخ ولادت کے بارے میں کتب خاموش ہیں جب کہ تاریخ وفات ۳۲۸ ھجری کو عراق (بغداد) ہے، آپ کا تعلق بغداد سے تھا، قرات شاذہ کے بہت بڑے عالم تھے، قرات شاذہ اگر صحیح سند سے ثابت ہے تو جائز ہے اگرچہ وہ رسم مصحف کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ پھر آپ نے اس قول سے رجوع بھی فرمالیا۔ آپ کی کتب میں اختلاف القراء اور شواذ القرآت مشہور ہیں، امام سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں آپ کی کتب اور اقوال سے استفادہ کیا ہے۔ (زرکلی، الاعلام، ۳۹۰/۳)

۳ ۔ سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ۲۲۱/۳

۴ ۔ التوبہ: ۷۱/۹

۵ ۔ النور: ۱۰/۲۴

﴿رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدتَّهُمْ وَمَن صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[1]

اور سورۃ الممتحنہ میں

﴿وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[2]

اور اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ معاف کردے، بیشک تو ہی زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

درج بالا آیات کا اختتام ابتداء سے بظاہر الگ تقاضا کر رہا ہے، جس طرح ﴿تَوَّابٌ حَكِيمٌ﴾ میں ہے، اس لیے کہ عقل انسانی یہ سمجھتی ہے کہ ﴿تَوَّابٌ رحيمٌ﴾ ہونا چاہیے کیونکہ آیت میں فضل اور رحمت اللہ تعالیٰ کے تواب اور رحیم ہونے کا تقاضا کر رہی ہے لیکن تواب کے بعد حکیم کی صفت ذکر کرنے میں فائدہ عظیمہ یہ ہے کہ حکیم کی صفت کے ساتھ رحمت کی تعبیر کی گئی جس میں مقصد یہ تھا کہ لعان کے مشروع ہونے کا اشارہ ہر ایک کو معلوم ہو جائے اور اس کی حکمت کا بھی علم حاصل ہو جائے جو کہ اتنی عظیم ذات ہے جو انسانوں کے برے کاموں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔[3]

الحکیم کا تذکرہ الواسع کے ساتھ

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا﴾[4]

اور اگر دونوں (میاں بیوی) جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشائش سے (ایک دوسرے سے) بے نیاز کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا بڑی حکمت والا ہے۔

شوہر کے تمام تر احسانات اور بیوی کی قربانیوں اور ایثار کے باوجود اگر دونوں میں موافقت نہ ہو اور جدا ہونے کا ارادہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے کہ کون کتنا ایک دوسرے کے لیے مخلص اور گھر اور خاندان آباد کرنا چاہتا ہے اور یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ اب وہ جدا ہو جائیں اور اللہ اپنی حکمت سے دونوں کے لیے کوئی بہتر راہ اور سبب پیدا فرمائے گا۔ صفت حکیما کے ساتھ واسعا کو بھی نکرہ رکھا گیا جس کا معنی یہ ہے کہ اس کے وسعتوں کا شمار اور حساب نہیں ہے، شوہر اور بیوں دونوں یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم، اس کی رحمت، اس کا فضل بہت وسیع ہے، اس کا جود و کرم، اس کا فضل اور اس کی حکمت کا کوئی شمار نہیں ہے، امام رازی کلبی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں

۱۔ غافر: ۸/۴۰

۲۔ الممتحنہ: ۵/۶۰

۳۔ دیکھیے: الاتقان فی علوم القرآن، ۳۳۲/۳

۴۔ النسآء: ۱۳۰/۲

کہ حکیما کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ظاہر ہے کہ نیکی کا برتاؤ کرتے ہوئے مفارقت نہ پیدا کریں اور اگر ایسی نوبت آ بھی جائے تو احسان کو مد نظر رکھیں۔[1]

اس مقام پر صفت (حکیما) کی توجیہ یہ ہے کہ شوہر اور بیوی ہر دو سے نیکی کا برتاؤ اور ایثار تو مطلوب ہے لیکن خود داری اور غیرت بھی مطلوب ہے، نہ تو شوہر کے لیے غصہ اور ڈر دکھانا مطلوب ہے اور نہ بیوی کے لیے۔ دونوں کے لیے ایک خاص حد تک رہنا ضروری ہے، حکیما میں اگرچہ عموم ہے لیکن سیاق کلام اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں عورتوں کے لیے خاص طور پر حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ وہ آخری حد تک سعی کرتی رہیں کہ موافقت برقرار رہے اور موافقت کے لیے ہر ممکن ایثار بھی کریں اگر پھر بھی نباہ نہ ہو سکے تو اللہ رزق دینے میں بہت وسیع ہے اور وہ اپنی حکمتوں کے مطابق اسباب بھی پیدا کرے گا اور وسیع رزق بھی دے گا۔[2]

الحکیم کی مناسب العلیم کے ساتھ

ارشاد الٰہی ہے:

﴿قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾[3]

فرشتوں نے عرض کیا کہ: اے اللہ! ساری پاکیزگیاں تیرے ہی لیے ہیں ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہماری فطرت میں رکھا، (حقیقت میں تو) علم تیرا ہی علم ہے اور حکمت تیری ہی حکمت ہے۔

اس آیت کریمہ میں الحکیم کی صفت کا مقصد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا خلوص کے ساتھ اقرار کرنا ہے۔ امام بیضاویؒ لکھتے ہیں:

المحکم لمبدعاته الذي لا يفعل إلا ما فيه حكمة بالغة[4]

کہ اس جگہ الحکیم کی صفت ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ علم اور امن کی طلب کے لیے اور جہل اور فساد سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ملائکہ جیسا طریقہ اختیار کیا جائے کیونکہ علم کی طلب کے لیے استفسار کیا جاتا ہے اور اعتراض نہیں کیا جاتا اور فساد سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت کی طرف نظر کی جاتی ہے اور اہل حکمت کا یہی وطیرہ ہے۔ نیز اس مقام پر علم اور حکمت کو یکجا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ علم اور حکمت دو ایسے نور ہیں جن سے دل منور ہوتے ہیں اور ان اوصاف کو حاصل کرنے والے کو نئی زندگی ملتی ہے۔ جس طرح جسم کی پرورش کے لیے غذا ضروری ہے اسی طرح دل کی پرورش کے لیے علم اور حکمت ضروری ہیں اور انہی سے دل زندہ رہتے

۱۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۲۳۸/۱

۲۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۲۲۱/۲

۳۔ البقرہ ۳۲/۲

۴۔ البیضاوی، ۶۴/۱، تدبر قرآن، ۹۷/۱

ہیں۔ ملائکہ نے نہایت دانش مندی اور حکمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کے لیے دونوں صفات کا ذکر کیا، علم کے ساتھ اس کی رفعتوں اور عظمتوں کو بلند کیا اور الحکیم کی صفت کے ساتھ اپنے آپ کو نہایت عاجز ظاہر کر کے تمام ترغیوب کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔[1]

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے والدین اور اولاد کے حصص کو مقرر کرنے کے بعد فرمایا:

﴿آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[2]

تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تمہیں معلوم نہیں کہ فائدہ پہنچانے میں ان میں سے کون تمہارے قریب تر ہے، یہ (تقسیم) اللہ کی طرف سے فریضہ (یعنی مقرر) ہے، بیشک اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

اس مقام پر مفسرین لکھتے ہیں کہ یہاں حکیما کی صفت سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کے اندر حرص اس کو حقیقت تک پہنچنے سے روک دیتی ہے، انسان کی سوچ کے اندر حرص حقوق کی ادائیگی کو مکمل طور پر ادا نہیں ہونے دیتی۔ وراثت میں منفعت کا حصول ہر وقت انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے ورثا کے حقوق مکمل طور پر ادا نہیں ہوتے اور عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہوتے رہ جاتے ہیں۔ حکیما کی صفت اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کو ظاہر کرتی ہے کہ وراثت کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے اور اس میں بہت زیادہ حکمت پوشیدہ ہے۔ اگر کسی انسان یا گھر کے سربراہ کو یہ ذمہ داری سونپ دی جاتی تو غیر جانبداری کا حصول ممکن نہیں تھا۔ بہت عادل انسان بھی اپنوں کے حقوق کی ادائیگی کے وقت یا اپنے قریبی رشتہ داروں کو حصہ دیتے وقت جانب دار ہو ہی جاتا ہے۔ پھر انسان کو یہ ذمہ داری دی جاتی تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنے فائدے اور ضرورت کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کرتا اور ضرورت اور فائدہ کو ترجیح دیتا اس طرح حق دار اپنے حق سے محروم رہتا۔ اسی لیے فرمایا کہ انسان کے پاس یہ سمجھنے کا ذریعہ نہیں ہے کہ اس کے لیے بچوں اور والدین میں سے کون زیادہ نفع بخش ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قریب اور بُعد کی بنیاد پر ورثاء کے حصص مقرر فرمائے ہیں۔[3]

دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے شریعت اسلامیہ کے کچھ احکامات کی ہیت اور حکم حکمت کے پیش نظر اور حالات اور وقت کے مطابق تبدیلی ہو جائے لیکن کچھ فیصلے اٹل اور حتمی ہوتے ہیں جس میں کسی انسان کو کسی قسم کی تبدیلی یا کمی یا زیادتی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ حکیما کی صفت اس بات کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے وراثت کے احکامات کو غیر متبدل بنایا ہے۔ تیسری اور اہم بات حکیما سے جو واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی حکمت ان حصص پر حاوی ہے۔ کوئی شخص اپنے علم یا اپنی عقل ودانش کو زیادہ بہتر سمجھ کر وارثت کو کسی

---

۱ ۔ البقاعی، ابراہیم بن عمر بن حسن، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور (قاہرہ: دار الکتاب الاسلامی، ۱۴۰۳ھ)، ۲۴۸/۱

۲ ۔ النسآء ۱۱/۴

۳ ۔ الکاندھلوی، محمد ادریس، معارف القرآن (کراچی: مکتبہ لدھیانوی، ۲۰۰۲ء)، ۲۹۹/۲، اس کے علاوہ دیکھیے: صدیقی، ڈاکٹر محمد اسلم روح القرآن (لاہور: ادارہ ہدی للناس)، ۷۸/۳

اور طریقے سے قائم نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی صفت علیما اور حکیما پر مکمل ایمان، اطمینان اور یقین رکھنا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جائے۔[1]

وراثت کے ان احکامات کے ساتھ ہی اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاں بداخلاقی کرنے والوں کے لیے قانون بنایا وہاں توبہ کا طریقہ، شرائط اور اس کے آداب اور توبہ کی حکمتوں کو بھی واضح کیا اور ساتھ ہی توبہ کی اہمیت اور توبہ کرنے والے کے لیے اس میں افادیت کو بھی حکیما کی صفت سے ظاہر فرمایا:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[2]

در حقیقت توبہ کا حق اللہ کے حضور محض انہی لوگوں کے لیے ہے جو کر بیٹھتے ہیں گناہ نادانی سے پھر توبہ کر لیتے ہیں جلد ہی۔ سو یہ وہ لوگ ہیں کہ توبہ قبول کر لیتا ہے اللہ ان کی۔ اور ہے اللہ (ہر بات سے) باخبر، بڑی حکمت والا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حکیما کو علیما کے بعد ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ایک شخص نے ہوس اور جہالت میں گناہ کیا اور اسی طرح ایک شخص نے غصہ کی حالت میں دوسرے پر تہمت لگائی۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و دانائی سے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ جو توبہ کرنا چاہے۔ آداب کو مد نظر رکھتے ہوئے، ایک خاص وقت تک توبہ کر لے تو اللہ معاف فرمانے والا ہے۔[3]

علامہ اشرف علی تھانوی صفت حکیما کا مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں:

"انسان کو قریب الموت دو حالتوں سے گزرنا پڑتا ہے، حالت بأس یعنی موت کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے اور حالت یأس یعنی ناامیدی کی کیفیت، یہاں صفت حکیما کا فائدہ یہ ہوا کہ آیت کریمہ میں ﴿مِن قَرِيبٍ﴾ پہلی حالت بأس کی طرف اشارہ کرتا ہے اس وقت تک توبہ مقبول ہوتی ہے، لیکن جب حالت یأس یعنی نااُمیدی ہو جائے اور موت منہ تک آجائے تو اب توبہ بھی قبول نہیں۔"[4]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جنگ حنین میں کفار سے کئی لونڈیاں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے قبضہ میں آئیں جن کے شوہر موجود تھے (وہ صحابہ میں تقسیم کر دی گئیں) جب کوئی مسلمان ان کے قریب جانا چاہتا (اپنی لونڈی سے صحبت کرنا چاہتا) تو وہ کہتی کہ اس کا شوہر موجود ہے، تو اس مقام پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں یہ بتایا گیا کہ شادی شدہ عورتوں سے نکاح حرام ہے، البتہ کفار سے جو عورتیں تمہارے قبضہ میں آئیں اور حکومت اسلامی انہیں لونڈیاں بنانے کا فیصلہ کرے پھر انہیں فوجیوں میں بانٹ دیا جائے یا فروخت

۱۔ المظہری، تفسیر مظہری، ۹۱/۴

۲۔ النسآء: ۱۷/۴

۳۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۸/۱۰

۴۔ التھانوی، بیان القرآن، ص۲۰۹

کر دیا جائے تو ان کا اپنے کفار شوہروں سے نکاح ٹوٹ گیا اب تم ان سے صحبت کر سکتے ہو۔اس کے ساتھ تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ شریعت اسلامیہ کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے پاک طریقے سے عورتوں کو اپنے نکاح میں لاؤ اور مقصد محض شہوت ہی نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ نکاح میں حکمتیں کارفرما ہیں۔آیت کے آخر میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ [1]

اور تم پر اس مال کے بارے میں کوئی گناہ نہیں جس پر تم مہر مقرر کرنے کے بعد باہم رضامند ہو جاؤ، بیشک اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

اس آیت میں حکیما کی صفت ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے بتایا گیا کہ نکاح کا مقصد عورت کو اپنے مضبوط حصار میں لینا ہے اور اس کی مکمل حفاظت کرنا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ مہر جتنا مقرر کیا گیا ہو اس کی مکمل ادائیگی ضروری ہے اس مقام پر ذات باری تعالیٰ کی صفت حکمت کا فائدہ یہ بھی ہے کہ کہ مہر سے خاندان جوڑے رہیں گے اور پھر یہ نکاح ایک ایسا عہد ہے جس کو پورا کرنے کی صورت میں ایک صالح اور مضبوط گھر اور خاندان کی تعمیر ہوتی ہے۔عورت کی عزت وعصمت کی حفاظت سے معاشرے اور قوم میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو عزت وناموس کی حفاظت کرنا جانتے ہو اور اس طرح اسلام کا سیاسی نظام وجود میں آتا ہے۔امام قرطبیؒ کا مؤقف اسی کی تائید کرتا ہے۔[2]

حکیما کی صفت میں اللہ تعالیٰ کی یہ بھی حکمت ہے کہ نکاح پر نکاح کرنے سے اولاد کے حقیقی وارث کی پہچان میں نہایت دشواری ہو گی اور یہ دشواری مزید فساد اور بدامنی کو پیدا کر سکتی ہے، پھر نکاح کے لیے عورت کی رضامندی بھی ضروری ہے اور اس میں بے شمار حکمتیں ہیں، اسی طرح عورت کی مکمل حفاظت بھی ضروری ہے جس سے پاک اور صاف معاشرہ پروان چڑھتا ہے، نکاح میں جتنی پاکیزگی اور اللہ کی رضا مقصود ہو گی اتنا ہی خاندان اور گھر کا نظام منظّم رہے گا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے معاشرے کا سکون قائم رہے گا۔ان تمام مشکلوں کو اللہ تعالیٰ ہی حل کرنے والا اور ان امور کے اندر پوشیدہ حقائق کو جاننے والا ہے۔[3]

مسلمان کو سہواً قتل کرنے کی سزا میں اللہ تعالیٰ حکمت

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَن يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ وَإِن كَانَ مِن

۱۔ النسآء: ۲۴/۴

۲۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۵۵/۴

۳۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۲۱/۳

قَوۡمٍ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُم مِّيثَٰقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهۡلِهِۦ وَتَحۡرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍۖ فَمَن لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ تَوۡبَةً مِّنَ ٱللَّهِۗ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[1]

اس آیت کریمہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے اور انسان سے غلطی کا سرزد ہونا جانا بہر حال ممکن ہے، دنیا میں انسانوں کی طرف سے صحیح اور غلط اتفاقات ہوتے رہتے ہیں، ایک مسلمان غیر ارادی طور پر کسی دوسرے مسلمان کو جان سے مار دے تو اللہ تعالیٰ نے دونوں فریق کو عدل وانصاف کا حکم دیا اور اس مقام پر بھی حکیما کی صفت ذکر فرما کر یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اگرچہ اس غلطی میں بھول کا عمل دخل ہے لیکن پھر بھی مسلمان کو خون رائیگان نہ جائے، اس سے مسلمان کی جان کی عزت وعظمت اور شرافت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر دوسری طرف قتل کرنے والے کی غلطی پر بھی اپنی ہدایت اور توبہ اور بخشش کے دروازے کھولے گئے تاکہ کوئی بھی اللہ کی رحمت اور اس کی حکمت سے مایوس نہ ہو۔ علامہ بقاعیؒ لکھتے ہیں:

"في نصبه الزواجر بالكفارات وغيرها، فالزموا أوامره وباعدوا زواجره لتفوزوا بالعلم والحكمة"[2]

کفارہ اور اس کے ساتھ دیگر چیزوں کا لازم رکھا گیا۔ پس اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی ضروری ہے اور اس کی زجر وتوبیخ سے بچنا لازم ہے تاکہ علم اور حکمت کی وجہ سے کامیابی حاصل ہوتی رہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ قاتل کو اس کے بھولنے کی وجہ سے اور مقتول پر ظلم ہونے کی وجہ سے اس کے ورثاء کے لیے اپنے علم وحکمت کے دروازے کھولنا چاہتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے زجر وتوبیخ کی گئی اور ساتھ کفارہ کو بھی لازم کیا گیا۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿فَمَن لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ تَوۡبَةً مِّنَ ٱللَّهِۗ وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[3]

سو جو شخص (غلام یا باندی) کو نہ پائے تو وہ مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے یہ اللہ کی طرف سے (اس کی) توبہ ہے اور اللہ بہت علم والا بڑی حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر حکیما کی صفت عصر حاضر کے عین مطابق ہے کہ اب تو لونڈی اور غلام کا رواج ہی نہیں رہا تو یہ صورت کیسے ممکن ہوتی تو اس کے متبادل کے طور پر حکم کیا گیا کہ دو مہینے کے مسلسل روزے رکھیں جائیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عین حکمت ہے[4]۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دشمن کے مقابلے میں سستی کرنے سے منع فرمایا اور حکم دیا ہے کہ دشمن کے تعاقب میں دیر نہ کرو، مؤمن ہی کی صفت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل امید کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ النسآء، ۴/۹۳

۲۔ البقاعی، نظم الدرر، ۵/۳۶۴

۳۔ النسآء: ۴/۹۲

۴۔ دیکھیے: تبیان القرآن، ۲/۲۰۲

﴿وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۖ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[1]

اور مت سستی کرو دشمن کا تعاقب کرنے میں اگر تم درد پاتے ہو، پس بیشک وہ بھی درد پاتے ہیں جیسا کہ تم درد پاتے ہو، اور تم امید رکھتے ہو، اللہ سے اس چیز کی، جس کی وہ امید نہیں رکھتے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

حکیما کی صفت ظاہر کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کرے گا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ تم کافروں کے مقابلے میں سست نہ رہنا اور اللہ تعالیٰ پر مکمل امید رکھنا، اس کی حکمت یہ ہے کہ تم ڈٹ کر مقابلہ کرو گے تو دین اسلام غالب رہے گا اور تمہار اللہ تعالیٰ پر امید رکھنا تمہارے ایمان کو بڑھائے گا اور دنیا اور آخرت میں تم کامیاب ہو گے۔[2] ایک اور مقام پر ارشاد الٰہی ہوتا ہے:

﴿وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[3]

اور جو شخص کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا وبال اسی شخص پر ہو گا اور اللہ بہت جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام اندلسیؒ لکھتے ہیں:

"بصفة الحكمة لأنه واضع الأشياء مواضعها فيجازى على لك الإثم بما تقتضيه حكمته. فالصفتان أشارتا إلى علمه بذلك الإثم"[4]

یہاں صفت حکمت اس لیے ذکر کی گئی تا کہ اشیاء کو اس کو محل اور مقام پر رکھا جائے۔ پس اس اعتبار اللہ تعالیٰ کی صفت حکمت اسی بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ گناہ کا نقصان گناہ کرنے والے پر ہی ہو۔ اس طرح یہاں دونوں صفات علم اور حکمت لائی گئی۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا معنی کہ وہ جانتا ہے کہ اس گناہ کا ذمہ دار یہ خود ہے یا کوئی اور۔ اور پھر اس کی صفت حکمت کا معنی یہ ہوا کہ جو گناہ کرنے والا ہے اسی پر گناہ کا بھی بوجھ ڈالا جائے۔ یہ صفت حکمت کا تقاضا بھی ہے۔ سورۃ النسآء کی آیت ۱۷۰ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[5]

۱۔ النسآء: ۱۰۴/۴

۲۔ السواتی، معالم العرفان، ۹۱/۴

۳۔ النسآء ۱۱۱/۴

۴۔ الاندلسی، البحر المحیط، ۶۰/۴

۵۔ النسآء: ۱۷۰/۴

اے لوگو! بیشک تمہارے پاس یہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تشریف لایا ہے، سو تم (ان پر) اپنی بہتری کے لیے ایمان لے آؤ اور اگر تم کفر (یعنی ان کی رسالت سے انکار) کرو گے تو (جان لو وہ تم سے بے نیاز ہے کیونکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے یقیناً (وہ سب) اللہ ہی کا ہے اور اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اہل کتاب سے بھی خطاب ہے کہ اپنے بنیادی عقائد کو درست کریں اور آخری نبی پر اور جو کچھ آپ ﷺ لے کر آئے ہیں اس پر بھی ایمان لائیں۔ حکیما کی صفت سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی بھی آخری نبی اور ان کی شریعت پر ایمان نہ لایا تو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کو ظاہر فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نہ تو اس کی گرفت میں جلدی کرے گا اور نہ ہی اس کو رجوع الی اللہ کی توفیق سے باز رکھے گا۔ صفت حکمت کا معنی یہ ہے کہ ممکن ہے کفر کرنے والا اپنے کفر سے باز آجائے اور اس کو ایمان کی دولت مل جائے۔ لہٰذا زمین وآسمان کا علم اور حکمت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے[1]۔ حکیما کی صفت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اس طرح ظاہر ہو گی کہ وہ ہر ایک کو اسی طرح جزا دے گا جس طرح اس کا عمل اور فعل ہے۔ پھر کوئی یہ بھی خام خیالی میں نہ رہے کہ اگر کوئی ایمان نہ لائے تو اس کائنات کا نظام بگڑ جائے گا، حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمان کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور پھر وہ اپنی حکمت کو بھی ظاہر کرنے والا ہے۔[2]

سورۃ الاحزاب میں ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[3]

اے نبی! آپ اللہ کے تقوی پر (حسب سابق استقامت سے) قائم رہیں اور کافروں اور منافقوں کا (یہ) کہنا (کہ ہمارے ساتھ مذہبی سمجھوتہ کرلیں ہرگز) نہ مانیں، بیشک اللہ خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

سورۃ الاحزاب اس وقت نازل ہوئی جب حضرت زید رضی اللہ عنہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے چکے تھے، یہ نکاح چونکہ نبی کریم ﷺ کی مرضی سے ہوا تھا جب کہ حضرت زینب اور ان کا خاندان اس سے راضی بھی نہ تھا، پھر طلاق سے ان کے اور ان کے خاندان کو بہت دکھ ہوا، بس اس بہت زیادہ پریشانی کے عالم میں حالات کے پیش نظر ان کے دکھ کے مداوا کے لیے چونکہ نبی کریم ﷺ کی مرضی کے وجہ سے نکاح ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اس کا مداوا خود نکاح فرما کر کیا، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح سے اُن کی دل جوئی بھی ہو گی، خاندان میں بھی عزت ہو گی اور دینی ضرورت کا منشا بھی پورا ہو گا، ایسا ممکن تھا کہ نبی کریم ﷺ کے دل میں ایک خطر

۱۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۳/۳۳

۲۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۵/۲۷۷

۳۔ الاحزاب: ۳۳/۱

گزرے کہ اس عمل سے ہو سکتا ہے مسلمان دین اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات میں پڑ جائیں، اسی وجہ سے نبی کے خطاب سے آپ ﷺ کو باور کروانا تھا کہ آپ ﷺ اپنے فرائض منصبی کو نہ چھوڑیں اور کافروں اور منافقوں کی طرف دھیان نہ دیں، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت ظاہر فرما کر رہے گا۔[1]

ابن عربی حکیما کی صفت کے تحت لکھتے ہیں:

"في ابتلائك بالتلوينات فإنها تنفع في الدعوة"[2]

آپ کو اس پریشانی اور دکھ کے عالم میں گزارنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ کافروں اور منافقوں چالوں کو جان سکیں اور پہچان سکیں، پھر دعوت دین میں یہ آپ ﷺ کے لیے نفع بخش امر ہے۔

یعنی آپ ﷺ لوگوں کو آسانی سے تبلیغ کر سکیں گے اور ان کو راہ ہدایت کی طرف بلا سکیں گے۔اور آپ کے حکمت کی وجہ سے بہت زیادہ لوگ دین اسلام کی طرف آئیں گے۔ سورۃ الفتح میں ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ ۗ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[3]

وہی ہے جس نے مؤمنوں کے دلوں میں سکون نازل فرمایا تاکہ ان کا ایمان ان کے پہلے ایمان سے اور زیادہ ہو، اور آسمانوں اور زمینوں کے لشکر اللہ ہی کی ملک میں ہیں، اور اللہ بہت علم والا ہے بے حد حکمت والا ہے۔

کچھ مسلمانوں نے تو یہ کہہ دیا کہ حدیبیہ میں صلح کیوں کی گئی جب کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حکمت کی طرف نظر نہیں کی ،اللہ تعالیٰ نے حکیما کی صفت ذکر کی جس کا فائدہ یہ ہوا ایک تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سکینت نازل فرمائے اور مؤمنوں کا ایمان بڑھائے دوسرا یہ کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے یا کافروں کے ڈر کی وجہ سے یہ معاہدہ کیا گیا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کام میں ایک خاص مصلحت پوشیدہ ہے۔[4]

اس ضمن میں علامہ مودودی لکھتے ہیں:

"صفت حکمت کا اس لیے ذکر کیا گیا تاکہ مومنوں کو یہ بتایا جاسکے اللہ تعالیٰ ہی کے پاس تمام لشکر ہیں جس کو چاہے صفحہ ہستی سے مٹا دے مگر اس نے اپنی حکمت سے مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا کہ وہ

---

۱ ۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۱۹۹/۷، تدبر قرآن، ۱۳۴/۸

۲ ۔ شیخ اکبر، محی الدین محمد ابن العربی (م ۶۳۸ھ)، تفسیر ابن عربی، ۹۹/۹

۳ ۔ الفتح: ۴/۴۸

۴ ۔ السلمی، ابوعبدالرحمن محمد بن حسین، حقائق التفسیر (بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ)، ص ۲۰۸

کافروں کے مقابلے میں جدوجہد کریں اور دین کی سربلند کے لیے کام کریں اسی وجہ سے ان کا ایمان زیادہ ہوگا اور ان کے لیے کامیابی ہوگی۔"[1]

سورۃ الدھر میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾[2]

اس سورت کے مضامین اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور حق کی معرفت اور اپنی رضا کے حصول کے لیے قرآن کریم کو بطور نصیحت اور نبی کریم ﷺ کو بطور ہادی بنا کر مبعوث فرمایا پھر اس ہدایت کو قبول کرنے اور اس سے منفعت حاصل کرنے کے لیے انسان کو عقل عطا کی اور اس کی فطرت میں تقوی اور فجور کا الہام کیا، نفس لوامہ سے بھی انسان کی رہنمائی فرمائی۔ نصیحت کا حصول صرف انسان کی اپنی مرضی پر ہی موقوف نہیں بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم، اس کی طرف سے توفیق اور اس کی مشیت بھی ضروری ہے۔

حکیم کی صفت علیم کے ساتھ ذکر کی گئی جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ جب وہ ہدایت دیتا ہے تو اس میں اس کی خاص حکمت ہوتی ہے کہ اس میں قابلیت اور ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ اور جب بھی گمراہ کرتا ہے تو وہ اپنے علم کے مطابق جان لیتا ہے کہ اس میں خیر کو قبول کرنے کی قوت نہیں۔ یعنی اس نے خواہشات نفسانی اور ابلیس کے خواہشات کے مطابق سابقہ زندگی گزار دی اور جو اس کو فطرتاً فجور اور تقوی کو پرکھنے کی صلاحیت الہام کی گئی، اس کی طرف اس نے ذرا بھر بھی توجہ نہیں کی۔[3] اس مقام پر صفت حکیما کا بھی یہی مفہوم ہے۔

حکیما کی صفت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے ہر شخص کی اہلیت کے مطابق اس کو راہ حق کی توفیق بخشتا اور ہدایت کا ماحول فراہم کرتا ہے، پھر اس کی حکمت اس بات کا تقاضا بھی کرتی ہے کہ کس شخص میں خیر کی قابلیت پہلے سے ہوتی ہے اس کی حکمت کے مطابق اس کی مشیت ہوتی ہے۔[4] سورۃ یوسف میں ارشاد ربانی ہے:

﴿قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾[5]

۱۔ المودودی، تفہیم القرآن، ۹۷/۷

۲۔ الدھر: ۳۰/۷۶

۳۔ الحقی، روح البیان، ۲۸۰/۱۰

۴۔ پانی پتی، تفسیر مظہری، ۱۶۳/۱۰

۵۔ یوسف: ۸۳/۱۲

باپ نے یہ داستان سن کر کہا" دراصل تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا۔ اچھا میں اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید کہ اللہ ان سب کو مجھ سے لاملائے، وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے جب عزیز مصر سے ملاقات کر کے واپس اپنے والد کے پاس آئے تو آپ نے اپنے بیٹے بنیامین کے بارے میں پوچھا جس کو وہ چوری کے جرم میں وہاں ہی چھوڑ آئے تھے، آپ علیہ السلام نے پوچھا کہ بنیامین کہاں ہیں تو انہوں نے کہا کہ ان کو چوری کے جرم میں وہاں ہی چھوڑ آئے ہیں جس پر آپ علیہ السلام نے وہی فرمایا جس کا درج بالا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس مقام پر امام بغویؒ لکھتے ہیں:

"الْفَرْقُ بَيْنَ الْحَكِيمِ وَالْعَالِمِ: أَنَّ الْعَالِمَ هُوَ الَّذِي يَعْلَمُ الْأَشْيَاءَ وَالْحَكِيمَ الَّذِي يَعْمَلُ بِمَا يُوجِبُهُ العلم"[1]

عالم اور حکیم میں فرق یہ ہے کہ عالم وہ ہے جو اشیاء کو جانتا ہو اور حکیم وہ ہے جو اپنے علم کے مطابق و موافق عمل کرتا ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو خاص صفتوں کا ذکر کرنا بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔ علامہ بقاعیؒ کے نزدیک آپ علیہ السلام کا دونوں صفات کو یکے بعد دیگرے ترتیب کے ساتھ ذکر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ جب علم حاصل کرنے کے اسباب مفقود ہو جائیں تو اپنے علم اور حکمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا چاہیے اس لیے کہ اس کا علم تمام علوم اور اس کی حکمت انسان کی تمام حکمتوں سے برتر ہے، اسی سبب سے انسان کے علم اور حکمت اور معرفت میں اضافہ ہوتا ہے۔[2]

ابن عطیہ کے نزدیک الحکیم کی صفت کے ساتھ العلیم کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر ظاہر و باطن کا علم رکھنے والا ہے اور اسی پر حسن ظن ہر حال میں رہنا چاہیے اور اس کی حکمت پر راضی رہنا چاہیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ملانا اسی کے اختیار میں ہے اور اس کو گم رکھنا بھی اسی کی حکمت میں داخل ہے۔[3]

اسی کی مزید وضاحت علامہ مراغی اس طرح لکھتے ہیں:

"أي إنه العليم بوحدتي وفقدهم والحزن عليهم"[4]

یعنی اس کو میری تنہائی کا کامل علم ہے اور اس بات کو بھی بخوبی جانتا ہے کہ ان کے گم ہونے سے میں کتنا غمگیں اور پریشان ہوں۔

۱۔ البغوی، معالم التنزیل، ۴/۷۴۴

۲۔ البقاعی، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، ۱۰/۱۹۵

۳۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۳/۱۷۲، نسفی، تفسیر نسفی، ۲/۱۲۹

۴۔ المراغی، تفسیر المراغی، ج ا، ص ۲۲۶

یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کا العلیم اور الحکیم کی صفت ذکر کرنا ایک خاص مقصد اور ایک خاص فائدے کے لیے ہیں۔ العلیم کی صفت سے آپ کا مدعا یہ تھا کہ میرے اکیلے پن اور میرے غم کی شدت کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جو العلیم کی صفت والا ہے اور الحکیم کی صفت سے یہ مقصد تھا کہ مصیبت اور بلاء کی میں شدت اور مصیت میں کمی کے بجائے زیادتی کی حکمت سے وہ خود ہی واقف ہے کیوں کہ وہ خود حکیم ہے اور اس کی یہ سنت ہے کہ جب مصیبت میں شدت آجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ خود ہی اس کو رفع کر دیتا ہے اور مصیبت جتنی بھی بڑھی ہوتی ہے اس کے بعد اس سے چھٹکارا بھی اس کی حکمت سے جلدی واقع ہوتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت کا پرچار کرنے کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کے لیے العلیم اور الحکیم کی عظیم صفات کا تذکرہ فرمایا اور پھر جب آپ علیہ السلام سے حضرت یوسف علیہ السلام کی ملاقات ہوئی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی من و عن انہی صفات کو اسی ترتیب سے ذکر فرمایا:

﴿وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ۖ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۚ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾[1]

اور یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والدین کو اوپر تخت پر بٹھا لیا اور وہ (سب) یوسف (علیہ السلام) کے لیے سجدہ میں گر پڑے، اور یوسف (علیہ السلام) نے کہا: اے ابا جان! یہ میرے (اس) خواب کی تعبیر ہے جو (بہت) پہلے آیا تھا (اکثر مفسرین کے نزدیک اسے چالیس سال کا عرصہ گزر گیا تھا) اور بیشک میرے رب نے اسے سچ کر دکھایا ہے، اور بیشک اس نے مجھ پر (بڑا) احسان فرمایا جب مجھے جیل سے نکالا اور آپ سب کو صحرا سے (یہاں) لے آیا اس کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد پیدا کر دیا تھا، اور بیشک میرا رب جس چیز کو چاہے (اپنی) تدبیر سے آسان فرما دے، بیشک وہی خوب جاننے والا بڑی حکمت والا ہے

اللہ تعالیٰ کی جن صفات اور جن اسماء کا ذکر پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا انہی صفات اور اسی ترتیب کے ساتھ بیٹے نے ذکر کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ صرف اکیلے یعقوب علیہ السلام نے اس کے علم و حکمت کے تذکرے کرنے والے نہیں بلکہ باقی نبی بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تمام علوم اور تمام حکمتوں کا علم اسی کے پاس ہے۔[2]

حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مصر کا بادشاہ بنایا۔ مگر جب آپ علیہ السلام نے عجز و انکساری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے العلیم کی صفت بیان فرمائی یعنی مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم اور دیگر علوم و معارف عطا کرنے والی ایک ہی ذات ہے اور پھر مجھے کنویں میں ڈالنے اور قید خانے میں قید کرنے کی حکمتیں صرف اسی ذات جانتی ہے جو الحکیم کی صفت سے مزین ہے، العلیم اور الحکیم کی صفت کا ذکر کرنا آپ کی طرف سے نعمت کا اعتراف اور عاجزی اور شکر کی اعلیٰ مثال قائم کرتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی

۱۔ یوسف ۱۲/۱۰۰

۲۔ البقاعی، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، ۱۰/۲۱۹

دو صفات العلیم اور الحکیم کے نتیجہ اور ثمر کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت اور بادشاہت عطا ہوئی اور پھر انہی دونوں صفات کا ظہور آپ علیہ السلام کی زبان مبارک سے بھی ہوا۔[1]

الحکیم کی صفت العلیم کے ساتھ قرآن کریم میں سورۃ التحریم میں بھی بیان ہوئی ہے۔

﴿قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾[2]

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ذریعے امت مسلمہ کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے حلال کی اس کو حرام اور جو اس نے حرام کی ہو اس کو حلال کرنا کسی فرد کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے[3]۔ اگرچہ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر یہ ارشاد ہوا کہ یہ نبی تمہارے لیے چیزوں کو حلال کرتے اور حرام کرتے ہیں۔ مگر اس مقام پر یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ انتہائی احتیاط کا مقام ہے کہ ایسا نہ ہو کہ نبی کریم ﷺ کے علاوہ ہر فرد حلال اور حرام کی تعیین شروع کر دے۔ یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا صفت الحکیم اس مقام پر اس مفہوم میں بھی ہے جن احکام کو وہ اپنے بندوں کے لیے صادر فرماتا ہے ان میں ہر طرح سے حکمت ہی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اور وہ انتہائی کامل ہوتے ہیں جن میں کسی کو نہ تبدیل کرنے اور نہ منسوخ کرنے کا حق حاصل ہے۔ پھر ان احکامات میں ایسی صلاحیت اور خوبی ہوتی ہے کہ وہ ہر دور کے ساتھ ساتھ ہر ایک کے لیے کامل اور مکمل ہوتے ہیں۔[4] علامہ قطب شہیدؒ صفت باری تعالیٰ الحکیم کا ایک اور فائدہ اس طرح لکھتے ہیں:

"یأمرکم بما یناسب طاقتکم وما یصلح لکم"[5]

اللہ تعالیٰ بندوں کے منافع کے اعتبار سے احکامات نازل فرماتا ہے۔

اور یہ الحکیم یعنی اللہ تعالیٰ ہی کام ہے کہ ان احکامات کو قابل عمل بناتا ہے۔ ان پر عمل کرنا آسان بناتا ہے اور لوگوں کے لیے دنیوی واخری اعتبار سے قابل نفع بھی بناتا ہے۔ الحکیم کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کسی ایک فرد، ایک جماعت یا کسی ایک قوم کے لیے نہیں بلکہ ان احکام کا تعلق اجتماعی ہوتا ہے۔[6]

ان تمام مقامات میں اللہ تعالیٰ کی صفت حکمت صفت علم کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم جس طرح کائنات کا احاطہ کرنے والا ہے اور کوئی انسان اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا اسی طرح اس کی صفت حکمت بھی اسی اعجاز کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کی حکمت ہر ایک فعل میں پوشیدہ ہے۔ اور کبھی تو وہ عقل انسانی میں آسکتی ہے اور کبھی اس کی حکمت کو انسانی عقل اور قلب بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔

۱۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۵۸/۱۳

۲۔ التحریم ۲/۶۶

۳۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۲۹۸/۸

۴۔ البقاعی، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، ۱۸۴/۲۰

۵۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۴۵۹/۹

۶۔ السعدی، تفسیر السعدی، ۸۷۲/۳

الحکیم صفات ثلاثہ کے ساتھ

﴿يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾[1]

اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمینوں میں ہے، وہ (ساری کائنات کا) بادشاہ، بے حد پاک، بہت غالب، بے انتہا حکمت والا ہے۔

قرآن کریم میں صفت الحکیم اور حکیم (الف لام کے بغیر) جوڑے کے شکل میں وارد ہوئی ہیں یعنی العزیز الحکیم، العلیم الحکیم اور الحلیم الحکیم یا حکیم علیم وغیرہ جب کہ قرآن کریم میں صرف ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت الحکیم کے ساتھ اپنی تین اور صفات بھی اکٹھی ذکر فرمائی ہیں، سورۃ الجمعہ میں الحکیم کی صفت اللہ تعالیٰ کے تین صفاتی نام الملک، القدوس اور العزیز کے ساتھ استعمال ہوئی ہے، اس کے ساتھ اگلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی منصب نبوت کی چار ذمہ داریوں کا ذکر فرمایا ہے، ان چار صفات الٰہی اور اگلی آیت میں نبی کریم ﷺ کی چار ذمہ داریوں کا آپس میں گہرا ربط اور تعلق ہے، اور ان میں ایک خاص حکمت بھی ہے، قرآن کریم کا انداز بیان اور اسلوب اعجاز یہاں پر ایک خاص قسم کے ربط اور تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

مولانا مودودی کے مطابق الملک کی صفت کا مطلب یہ کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک اور بادشاہ ہے تو اس کا تعلق ﴿ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ ﴾ کے ساتھ اس مناسبت پر ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے فرامین اس طرح پڑھ کر بتائیں کہ یہ واقعی کائنات کے سچے اور حقیقی مالک کے احکام، خط اور اس کی آیات ہیں، القدوس کا ﴿ يُزَكِّيهِمْ ﴾ کے ساتھ تعلق اور ربط ہے کہ آپ ﷺ کا کام نفوس کا تزکیہ کرنا ہے کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ جو القدوس یعنی پاک ہے اس کی طرف سے ظاہری اور باطنی نجاستوں سے پاک و منزہ ہیں۔ ﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ ﴾ کا العزیز کے ساتھ ربط اس مناسبت پر ہے کہ یہ کتاب العزیز جو قادر مطلق، مختار واحد ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے اختیارات اور جس کی قدرت میں کوئی حد اور (limitations) نہ ہو۔ العزیز کی صفت یہ چاہتی ہے کہ مخلوق اس کا حکم بغیر چون وچرا کے تسلیم کرے اس بنا پر آپ ﷺ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں، اسی طرح اس آیت کریمہ کی آخری صفت الحکیم کا تعلق لامحالہ نبی کریم ﷺ کے صفت ﴿ الْحِكْمَةَ ﴾ کے ساتھ ہی بنتا ہے، اور الحکیم کا الحکمۃ کے ساتھ ایسا خاص تعلق اور ربط ہے جو سابقہ مناسبت سے برتر اور اعلیٰ ہے، اس لیے کہ الحکیم جس کا ہر کام حکمتوں سے مزین ہے اس نے آپ ﷺ کو حکمتوں سے نوازا تو آپ ﷺ کی حکمت کی صفت آپ ﷺ کی منزل اور اس کا نقطہ عروج ہے۔ علامہ مودودی لکھتے ہیں:

> ”سورۃ الجمعہ کی ابتدائی آیات آگے کے مضمون سے یہ تمہید بڑی گہری مناسبت رکھتی ہے۔
> قرآن مجید میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ صفات چار مقامات پر بیان کی گئی ہیں۔
> اور ہر جگہ ان کے بیان کی غرض مختلف ہے۔“[2]

۱۔ الجمعہ: ۱/۶۲

۲۔ المودودی، تفہیم القرآن، ۵۶/۴۔ مزید دیکھیں: ڈاکٹر اسرار احمد، منتخب قرآنی نصاب، ص ۶۷

خلاصہ

قرآن کریم کی اصطلاح (الحکیم) مختلف صیغوں سے وارد ہوئی ہے۔ ان تمام صفات کا ما قبل اور مابعد کلام کے ساتھ گہرا ربط اور تعلق ہے اور اس کے مختلف اعجازی اور بلاغی پہلو بھی ہیں۔آیات کے آخر میں صفت (الحکیم) اس کی قدرت اور عظمت، اس کی پاکیزگی اور کمال صفات کا مظہر ہے۔ پھر اس کے ساتھ کلام کے آخر میں ایک خاص انداز سے حکمت کا ذکر اس کی قوت اور غلبہ اور قہر پر بھی دلالت کرتا ہے۔ ہر ایک مقام پر صفت (الحکیم) کا الگ مفہوم اور معنی ہے جس قاری جتنا تدبر اور تفکر کرے گا اس کو سیاق و سباق سے اس صفت کے تکرار کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔

کلام اللہ میں فکر وتدبر کرنے والے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت (الحکیم) اس مقام پر سیاق اور سباق کے گہرے ربط اور تعلق کو ظاہر کرتی ہے جس سے قاری کو اس کلام کو خوب سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مظاہر مزید عیاں ہوتے ہیں۔

فصل دوم

قرآن کریم کی صفت حکمت کے تفسیری اطلاقات

قرآن کریم کی صفت حکمت اس کی وضاحت کرتی ہے کہ یہ کتاب قطعی اور یقینی ہے اور اس میں شک و تردد والی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کوئی خلاف واقعہ بات ہے۔ اس کی ہر بات مبنی بر حکمت ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے جو وحی الہی کے ذریعے نازل ہوا اور یہ کلام انسانی ذرائع علم سے بلند تر ہے۔ حکیم سے مراد مستحکم بھی ہو سکتا ہے یعنی قسم ہے مستحکم اور مضبوط قرآن پاک کی۔ اس کی ہر بات پختہ ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس فصل میں قرآن کریم کی صفت حکمت کے بارے میں مفسرین کی آراء کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یس . وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ﴾

یاسین۔ قسم ہے حکمت والے قرآن کی

الحکیم قرآن کریم کی بھی بطور صفت استعمال ہوئی ہے جس کا ایک معنی محکم، مضبوط اور پختہ کے ذکر کیے گئے ہیں۔ اس معنی کی تائید قرآن کریم کی ایک اور آیت کریمہ ﴿فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾[1] سے بھی ہوتی ہے یعنی بہت مضبوط اور واقعہ کے عین مطابق ہے، یہ عقل سلیم اور فطرت کے عین مطابق ہے جس میں غلطی کو کوئی امکان نہیں۔ اس کے تمام احکامات قیامت تک کے لیے کام آنے والے ہیں۔ علامہ قرطبیؒ نے اپنے استاذ محترم ابو اسحاق اسفرائینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں صفات باری تعالیٰ میں الحکیم کی صفت کا معنی (يَخْتَصُّ بِأَنْ يَعْلَمَ دَقَائِقَ الْأَوْصَافِ)[2] لکھا ہے یعنی الحکیم اس ذات کو کہا جاتا ہے جو اوصاف کے حقائق کو جاننے والی ہو اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مناسب ہے اسی طرح قرآن کریم کی حکیم کی صفت کا ایک معنی یہ ہے کہ یہ کتاب حکمت سے لبریز ہے، اور حکمت کی گہرائی پر مشتمل ہے، اس میں دقیق معانی پائے جاتے ہیں[3]

سورۃ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ﴾[4]

(اے پیغمبر اسلام! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ اللہ کی آیتیں اور حکمت والے تذکرے ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔

۱۔ البینہ: ۳/۹۸

۲۔ القرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۲۱۴/۱۸

۳۔ سواتی، معالم العرفان، ۳۱/۱۰

۴۔ آل عمران: ۵۸/۳

اس سے ماقبل آیات میں اہل کتاب اور یہود سے بالخصوص اور باقی لوگوں سے بالعموم خطاب کیا گیا ہے جو ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے ان کو اجر بھی پورا ملے گا اور ان پر ذرا برابر ظلم بھی نہیں کیا جائے گا لیکن جو خود اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں اللہ ان کو پسند نہیں فرماتا۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر قرآن کریم کا وصف بیان ہوا ہے کہ یہ آیات جو آپ ﷺ پر تلاوت کی جا رہی ہیں یہ حکمت کے تذکروں سے پُر ہیں، حاتم الرازی قرآن کریم کی صفت الحکیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

الْقَاطِعُ الْفَاصِلُ الْحَقُّ الَّذِي لَمْ يَخْلِطْهُ الْبَاطِلُ مِنَ الْخَبَرِ عَنْ عِيسَى وَعَنْ مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنْ أَمْرِهِ، فَلا تَقْبَلَنَّ خَبَرًا غَيْرَهُ[1]

الحکیم کی صفت سے مراد ایسی کتاب ہے جو باطل کو ختم کرنے والی اور حق کو ظاہر اور اس کی تفصیل کرنے والی ہے، اور اہل کتاب سن لیں کہ اس میں نہ وہ جھوٹ ہے جو تم عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہو اور نہ وہ باتیں ہیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو، یہ کتاب کسی غیر کی طرف سے نہیں بلکہ یہ من جانب اللہ ہے۔

ابو منصور ماتریدی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"من نظر فيه وتفكر يصير حكيمًا"[2]

قرآن کریم کی صفت الحکیم کا معنی بطور اسم فاعل ہے یعنی جو اس میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرے گا وہ حکیم یعنی حکمت والا ہو جائے۔

یعنی قرآن کریم کی صفت حکمت سے قاری کو بھی فائدہ ملتا ہے کہ اس پڑھنے والے اور آیات میں فکر و تدبر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت عطا کی جائے گی۔

سورۃ یونس کی ابتدائی آیت میں بھی قرآن کریم کی صفت ذکر کی گئی ہے:

﴿الر ۚ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾[3]

الر (اے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) یہ (جو ہم تم پر نازل کرتے ہیں) حکمت والی کتاب (یعنی قرآن) کی آیتیں ہیں۔

اس آیت میں قرآن کریم کی صفت الحکیم کی تفسیر میں حسب ذیل اقوال ہیں:

۱۔ اس آیت میں حکیم بہ معنی حاکم ہے، یعنی یہ کتاب اس بات کا حکم دیتی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے دعوی نبوت میں صادق ہیں، کیونکہ آپ کی نبوت کی دلیل قرآن مجید ہے جس کی مثال لانے سے پوری دنیا عاجز ہے۔

۲۔ حکیم بہ معنی محکم ہے یعنی یہ کتاب منسوخ نہیں ہے اور اس میں کذب، تناقض اور تضاد نہیں ہے اور حادثات زمانہ سے یہ کتاب مٹ نہیں سکتی اور یہ بھی آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے کیونکہ

۱۔ ابن ابی حاتم الرازی، تفسیر القرآن العظیم مسندا عن الرسول صلى الله عليه وسلم و الصحابة و التابعين، ۲۱/۳

۲۔ الماتریدی، تاویلات اھل السنۃ، ج ۲، ص ۳۸۸

۳۔ یونس: ۱/۱۰

آپ کا دعوی ہے کہ آپ قیامت تک کے نبی ہیں۔ اس لیے آپ کی کتاب بھی بلا کسی تغیر کے قیامت تک باقی رہے گی، اس کے برخلاف دوسرے انبیاء علیہم السلام کیونکہ ایک مخصوص زمانہ کے لیے نبی تھے اس لیے ان کی کتابیں بھی انکے بعد تغیرات سے محفوظ نہیں رہیں حتی کہ اب وہ زبان بھی موجود نہیں جس زبان میں یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں۔

۳۔ امام طبری لکھتے ہیں کہ حکیم کا معنی ہے یہ کتاب حکمت پر مشتمل ہے، حکمت کا معنی ہے علم اور عقل سے حق تک پہنچنا[۱]

چونکہ اس سورت مبارکہ میں الحکیم کی صفت قرآنی سورت کی ابتداء میں وارد ہوئی ہے لہٰذا یہاں ایک قرآن کریم کا بلاغی اور اعجازی پہلو بھی ذکر کرنا مناسب ہوگا اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک اعجاز براعۃ استھلال بھی ہے یعنی کلام کا آغاز ہی اس کے مضامین کے وصف اور متکلم فیہ کے مناسب حال پر مشتمل ہو اور اس میں سیاق کلام کا اشارہ بھی موجود ہو۔ جس کو امام سیوطی نے (وَمِنَ الِابْتِدَاءِ الْحَسَنِ نَوْعٌ أَخَصُّ مِنْهُ يُسَمَّى بَرَاعَةَ الِاسْتِهْلَالِ وَهُوَ أَنْ يَشْتَمِلَ أَوَّلُ الْكَلَامِ عَلَى مَا يُنَاسِبُ الْحَالَ الْمُتَكَلَّمَ---) قرآن کریم کو ابتداء کلام میں وصف کے ساتھ ذکر کرنے کے بیان میں لکھا ہے، آپ لکھتے ہیں کہ کلام کی ابتداء کا عمدہ طریقہ اہل بلاغت کے نزدیک براعۃ استہلال ہے کہ کلام کی ابتداء ہی اس چیز سے کی گئی جو متکلم فیہ کے مناسب حال پر مشتمل ہے اور اس کے بعد آنے والی ساری کلام کے اسلوب اور اس کے مضامین کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔[۲]

شاہ ولی اللہ کے نزدیک بھی کسی چیز کی ابتداء کا احسن اور عمدہ طریقے سے آغاز اس کے اعجازی پہلو اور اس کے اندر بلاغت اور وسیع مفاہیم کا پتہ دیتی ہے، اسی وجہ سے قرآن کریم میں آیات کی ابتداء اپنے حسن اور خوبی میں بے مثال ہیں، آپ لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے جب ہم سورتوں اور آیات کے فواتح کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ اس کے بعد والے کلام اور مضمون میں کتنا اعجاز اور عمدگی ہوگی۔[۳]، قرآن کریم کی صفت الحکیم ایک اور سورت کی بھی ابتداء میں بیان ہوئی ہے۔

سورۃ ھود میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾[۴]

چونکہ یہ آیت سورت ھود کی پہلی آیت ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی صفت (اُحْكِمَتْ) یعنی حکمت والی بیان فرمائی ہے۔

اس سورت کی ابتداء ہی قرآن کریم کے ایسے وصف سے کی گئی کہ صرف ﴿اُحْكِمَتْ﴾ کے اشارے ہی پوری سورت مضامین واضح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اہل بیان کہتے ہیں کہ حسن الابتداء بلاغت کی جان ہے، حسن الابتداء کا مطلب یہ ہے کہ کلام کے آغاز میں عبارت کی خوبی اور اس کی پاکیزگی کا بہت خیال رکھا جائے کیونکہ جس

۱۔ الطبری، جامع البیان، ۱۲۸۴/۴، یہی معنی لکھا ہے: ثعلبی، الکشف والبیان، ۱۳۳/۴، بغوی، معالم التنزیل، ۲۸۷/۴

۲۔ السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ۱۲۹/۲

۳۔ شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۱۱۶

۴۔ ھود: ۱/۱۱

وقت کوئی کلام کانوں میں پڑنا شروع ہوتا ہے تو اگر اس عبارت کا چہرہ یعنی اس کی ابتداء درست ہوئی تو ضرور سننے والے اس کو بہت توجہ سے سنے گا اور پنے عقل اور دل میں اس کو محفوظ کرنے کی سعی کرے گا ورنہ عبارت کا چہرہ اور اس کی ابتداء ہی خراب ہونے کی صورت میں باقی کلام خواہ کتنا ہی عمدہ ہو سامع ابتداء ہی سے اس کے سیاق کو جان لے گا، اسی وجہ سے ضروری ہے کہ کلام کا آغاز بہترین، شیریں، سلیس اور خوش نما، معنی کے اعتبار سے صحیح تر اور واضح، تقدیم وتاخیر سے خالی ہونا چاہیے، اسی طرح التباس اور عدم مناسب سے بھی آزاد کلام کرنی چاہیے، اسی وجہ سے قرآن کریم کی ابتداء میں قرآن کریم کے نام اور اوصاف ذکر کیے گئے ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ کے پاک نام اور اس کے اسماء حسنی سے اور کہیں حروف تہجی سے آغاز کیا گیا ہے۔[1]

علامہ ابو جعفر کے نزدیک اس سے ماقبل سورتوں (اعراف،انفال،توبہ اور یونس) میں جو مضامین بیان ہوئے انہی مضامین کی قدرے تفصیل اور تتمہ اس سورت میں بیان ہوا ہے،اللہ تعالیٰ نے ان سابقہ سورتوں کے مضامین اور اس سورت کے مضمون کو بطور مجموعہ کے (أُحْكِمَتْ) کے معنی میں ظاہر فرمادیا۔اس لیے کہ سورت یونس میں ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ﴾[2] کا بیان اور اس کا اختتام ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ﴾[3] سے ہوا ہے۔آپ لکھتے ہیں کہ سابقہ سبع طوال میں اللہ تعالیٰ نے کفار، منافقین کی تمام تر اقسام ذکر فرمائی اور پھر اہل حق اور اپنے برگزیدہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کا ذکر فرمایا، مسلمانوں کا کائنات اور اللہ تعالیٰ کی قدرت میں غور وفکر کرنے کی تنبیہات ذکر فرمائی،آپ لکھتے ہیں:

> ''فلما تقدم هذا كله في السبع الطوال وما تلاها، أعقب ذلك بقوله:"كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ''
>
> حکمت کا تعلق اس سورت کے ساتھ اور خصوصا سابق سبع طوال میں مذکورہ حکمت والے مضامین کے ساتھ ہے۔[4]

اس طرح یہ تفصیل بیان کرنے کا مقصد واضح ہو گیا کہ قرآن کریم کی صفت (الحکیم) اور (أُحْكِمَتْ) اپنے اندر اتنے وسیع معانی اور مفاہیم لیے ہوئے ہیں کہ ان صفات کا تعلق صرف اسی سورت کے ساتھ اور صرف اسی سورت کے مضامین ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ سابقہ سات لمبی سورتوں اور ان مضامین کے ساتھ بھی ہے، یہ قرآن کریم کا انتہائی اعلیٰ وبرتر اعجاز ہے کہ ایک صفت کے ساتھ سیاق وسباق کے ساتھ ساتھ سابقہ تمام مضامین کو شامل کر دیا گیا۔مزید یہ کہ (أُحْكِمَتْ) قرآن کریم کی اسی طرح صفت بیان کی گئی ہے جس طرح مختلف مقامات پر الحکیم کی صفت بیان ہوئی ہے،علامہ زمخشری قرآنی صفت (أُحْكِمَتْ) کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''نظمت نظما رصينا محكما لا يقع فيه نقض ولاخلل، كالبناء المحكم المرصف''

---

۱ ۔ دیکھیے: الاتقان فی علوم القرآن، ۳۶۱/۳، مزید دیکھیں: الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص۱۲۶

۲ ۔ یونس: ۵۷/۱۰

۳ ۔ یونس: ۱۰۸/۱۰

۴ ۔ الغرناطی، ابو جعفر، احمد بن ابراہیم بن الزبیر الثقفی الغرناطی، البرھان فی تناسب سور القرآن، (کویت: وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیۃ، ۱۴۲۲ھ)، ص۲۲۶

اس صفت سے مراد یہ ہے کہ یہ قرآن ایسا منظّم ہے کہ ہر آیت دوسرے آیت کے ساتھ پروئی ہوئی ہے، حکمت سے مراد یہ ہے کہ یہ ایسا کلام جس میں کسی قسم کا کوئی خلل اور نقص واقع نہ ہو۔ اس کی آیات اس طرح لطیف اور مضبوط ہیں جس طرح دیوار مضبوط، منظّم اور مستحکم ہوتی ہے۔

یعنی (أُحْکِمَتْ) کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ یہ باطل سے روکنے میں(أُحْکِمَتْ) ہے یعنی بہت زیادہ مضبوط اور قوی ہے۔[1]

قرآن کریم وہ عظیم الشان اور جلیل القدر کتاب ہے جس کی آیتیں لفظی و معنوی ہر حیثیت سے نہایت جچی تلی ہیں۔ نہ ان میں تناقض ہے نہ کوئی مضمون حکمت یا واقعہ کے خلاف ہے نہ باعتبار معجزانہ فصاحت و بلاغت کے ایک حرف پر نکتہ چینی ہوسکتی ہے جس مضمون کو جس عبارت میں ادا کیا ہے محال ہے کہ اس سے بہتر تعبیر ہو سکے۔ الفاظ کی قبا معانی کی قامت پر ذرا بھی نہ ڈھیلی ہے نہ تنگ۔ جن اصول و فروع، اخلاق و اعمال اور قیمتی پند و نصیحت پر یہ آیات مشتمل ہیں اور جو دلائل و براہین اثبات دعاوی کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ وہ سب علم و حکمت کے کانٹے میں تلی ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں علامہ عثمانی لکھتے ہیں:

آپ لکھتے ہیں:

''قرآنی حقائق و دلائل ایسے مضبوط و محکم ہیں کہ زمانہ کتنی ہی پلٹیاں کھائے ان کے بدلنے یا غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ عالم کے مزاج کی پوری تشخیص کر کے اور قیامت تک پیش آنے والے تغیرات و حوادث کو من کل الوجوہ جانچ تول کر ایسی معتدل اور ابدی غذائے روح، مائدہ قرآنی کے ذریعے سے پیش کی گئی ہے جو تناول کرنے والوں کے لیے ہر وقت اور ہر حالت میں مناسب وملائم ہو۔۔۔ اگر حکیم مطلق اور خبیر برحق کے کلام میں سب حکمتیں اور خوبیاں جمع نہ ہوں گی تو اور کس کلام میں توقع کی جاسکتی ہے، قرآن کریم کی صفت (أُحْکِمَتْ) اسی اعجاز کا تقاضا کرتی ہے۔''[2]

سورۃ یونس میں بھی قرآن کریم کی صفت الحکیم ذکر کی گئی ہے:

﴿الر ۚ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾[3]

الف، لام، را (حقیقی معنی اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی بہتر جانتے ہیں)، یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

اس مقام پر بھی صفت الحکیم سے مراد قرآن کریم ہے۔ علامہ قرطبیؒ مالکیؒ صفت الحکیم کی وجوہ اعجاز ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وَالْحَكِيمُ: الْمُحْكَمُ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ وَالْحُدُودِ وَالْأَحْكَامِ''

جس کے ساتھ حلال و حرام، حدود اور احکام کے بارے میں فیصلہ کیا جائے۔

۱۔ الزمخشری، الکشاف، ۳۷۷/۲

۲۔ عثمانی، تفسیر عثمانی، ۹۲/۲

۳۔ یونس: ۱/۱۰

یہاں صفت الحکیم کاایک معنی الحاکم کے ہیں یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حلال وحرام کے بارے میں اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والی کتاب ہے، الحکیم فعیل بمعنی فاعل یعنی حاکم کے معنی میں ہے ۔اس لیے کہ ایک اور مقام پر الحکیم کی صفت کو فاعل کے معنی میں ذکر کیا گیا

﴿وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾[1]

اور ان کے ساتھ حق پر مبنی کتاب اتاری تاکہ وہ لوگوں میں ان امور کا فیصلہ کر دے جن میں وہ اختلاف کرنے لگے تھے۔

آپ کے نزدیک الحکیم بمعنی محکوم فیہ بھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس میں عدل واحسان کرنے اور قریبی رشتہ داروں کو ان کا حق دینے کے بارے میں فیصلہ فرمایا ہے، اسی طرح اس میں برے کاموں کے بارے میں فیصلہ کیا گیا اور اطاعت گزاروں کے لیے جنت اور نافرمانوں کے لیے جہنم کا فیصلہ کیا گیا، مقاتل کے نزدیک الحکیم کا ایک معنی (محکم من الباطل) بھی ہے یعنی جو باطل سے محفوظ ہے، اس کتاب میں نہ کذب ہے اور نہ اختلاف ہے۔[2]

سورۃ لقمان میں بھی قرآن کریم کی صفت الحکیم وارد ہوئی ہے:

﴿تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾[3]

یہ اس کتاب کی آیتیں ہیں جو حکمتوں کا خزانہ ہے۔

یعنی اس قرآن اور اس سورت کی آیات حکمت والے مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور قرآن کی آیات محکم ہیں یعنی تغیر و تبدل سے محفوظ ہیں اور ان میں فساد اور جھوٹ محال ہے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ سورت کے احکام منسوخ نہیں ہونگے۔[4]

قرآن کریم کے سچا ہونے اور اس کا حق ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو الحکیم کی صفت سے مزین فرمایا ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ جس نبی مکرم ﷺ پر نازل ہوئی ان کی حقانیت اور ان کے سچا ہونے کی واضح دلیل ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿يس وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ﴾[5]

یا، سین (حقیقی معنی اللہ اور رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں)۔ قسم ہے اس قرآن کی جس کے دلائل نہایت محکم ہیں

یعنی یہ کلام حکمتوں سے بھرا ہوا ہے اور ساری کائنات اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے، اس مقام پر القرآن کی قَسم کا ذکر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ قرآنی قسمیں محض تکریم و تعظیم کے لیے ہی نہیں بلکہ مقسم علیہ کی شہادت اور اس کی حقانیت کو ظاہر کرنے کے لیے ذکر کی جاتی ہیں جیسا کہ امام سیوطی نے ذکر فرمایا ہے۔[6]

---

۱ ۔ البقرہ: ۲/۲۱۳

۲ ۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج ۸، ص ۳۰۵

۳ ۔ لقمان: ۳۱/۲

۴ ۔ سعیدی، تبیان القرآن، ج ۷، ص ۱۴۵

۵ ۔ یس: ۳۶/۲

۶ ۔ السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۲۱۳

قرآن کریم کے ذاتی نام کے ساتھ الحکیم کی صفت اللہ تعالیٰ نے قلب عارف کے لیے خصوصی طور پر ذکر فرمائی ہے، ایسا دل جو معرفت کے حصول میں جد وجہد کرتا ہے اور اپنے قلب کو راہ ہدایت کی طرف پھیرنے کے لیے تگ ودو کرتا رہتا ہے اس کے لیے یہ کتاب حکیم ہے یعنی حکمت کا فائدہ اسی کو ہوتا ہے جو معرفت کے حصول کے لیے ابتداء خود کوشش کرتا ہے۔اس مقام پر الحکیم کا معنی یہ ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جو علم، عمل اور وعظ ونصیحت کے دلائل سے نہایت ہی مدلل اور جامع ہے،اس میں آیات واضح اور غیر مبہم ہیں۔الحکیم کی صفت کا سیاق کلام سے ایک خاص تعلق ہے اور وہ یہ کہ سابق سورت سورۃ فاطر جس کو سورۃ الملائکہ بھی کہا جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور عظمت بیان فرمائی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ کل کائنات کی قدرت اور علم اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اس سورت مبارکہ میں الحکیم کی صفت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ حکمت والے قرآن کی قسم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اور اس کے رسول ہیں اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت سراسر ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے عین مطابق ہے۔[1]

قرآن کریم کی صفت الحکیم کی قرآنی صفت بطور مجاز عقلی استعمال ہوئی ہے۔اس لیے کہ الحکیم کی صفت ذوی العقول کے لیے ہوتی ہے اس طور پر قرآن کی صفت الحکیم کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ یہ صاحب حکمت کی کتاب ہے۔[2] قطب شہید نے اس مقام پر الحکیم کی خوبصورت توجیہ بیان کی ہے،آپ لکھتے ہیں:

> ”فإن لهذا القرآن لروحاً! وإن له لصفات الحي الذي يعاطفك وتعاطفه حين تصفي له قلبك وتصغي له روحك“[3]
>
> الحکیم سے ایک خاص حقیقت کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک خاص روح اور حیات ہے،جب پڑھنے والے کا دل صاف اور محبت سے لبریز ہو تو تب وہ اس سے ہم کلام ہو تو تب یہ کتاب بھی نہایت ہی محبت اور الفت کے ساتھ اپنے قاری کے ساتھ ہم کلام ہوتی ہے۔

یعنی (الحکیم) کی صفت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ کتاب قاری پر اپنے حقائق اور انوار وتجلیات کھولتی ہے۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کا قاری محض پڑھنے والا نہ ہو بلکہ اس کی غرض سے اللہ تعالیٰ کا مقصود سمجھنا ہو، پھر جو قاری دل وجان سے اس کتاب کا ہو جائے تو اس قاری کو اللہ کی اس کتاب میں ایسا خد وخال نظر آئے گا جیسا اس کو اپنے دوست کے چہرے میں نظر آتا ہے۔

علامہ ادریس کاندھلوی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ آیت قَسم ہے اور اس کے بعد والی آیت جواب قَسم ہے۔الحکیم کی صفت کا تقاضا ہے کہ کفار جو قسم کھا کر کہتے کہ یہ رسول نہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں کتاب کے ساتھ الحکیم کی صفت لگا کر قسم ذکر فرمائی۔دوسرا نکتہ یہ ہے کہ القرآن الحکیم دراصل مابعد آیت جو جواب قسم ہے اس کی دلیل ہے

---

۱ ۔ البقاعی، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، ج۱۶، ص۹۰۔ صدیق حسن خان، فتح البیان فی مقاصد القرآن، ج۱۱، ص۲۷۰۔مزید دیکھیے: الازہری، ضیاء القرآن، ج۶، ص ۵۴

۲ ۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ج۲۲، ص ۳۴۵

۳ ۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ج۶، ص۱۵۸

، آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی سب سے بڑی دلیل قرآن حکیم ہے، آپ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی یہ خاص خصوصیات میں سے ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی رسالت کو قسم کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔[1]

قرآن کریم کی صفت الحکیم اس معنی میں ہے کہ قرآن ہر اس قاری کے ساتھ ہم کلام ہو جاتا ہے جو محبت اور الفت سے اس کو پڑھتا ہے، قرآن حکمت کی کتاب اس طرح ہے کہ یہ کتاب مومن کے دل کی باریک اور حساس تاروں کو اور احساسات کو چھیڑتی ہے۔ اور اس میں نہایت لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ یہاں حکمت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ یہ نہیں کہ اس کی بارش ہر ایک زمین پر ایک جیسی برس جائے بلکہ یہ اسی قدر ہم کلام ہوتا ہے جتنی قاری کی وسعت قلبی اور اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ قاری اور قرآن کا یہ مکالمہ نہایت دلچسپ اور حکمت سے لبریز ہوتا ہے۔ اس مکالمے سے قاری کے لیے حق اور معرفت کی منزل کا تعین ہوتا ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات کو پانے کی ایک خاص سمت بھی متعین ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی صفت الحکیم کا ایک معنی یہ بھی ہے یہ کتاب بڑی حکمت کے ساتھ نہایت ہی معقول انداز اور درست سمت میں تربیت کرتا ہے۔ قرآن اپنے قاری کی تربیت اس انداز میں کرتی ہے کہ جس میں تمام انسانی صلاحیتوں کو تعمیری انداز میں کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور انسانی صلاحیتوں کو صحت مند ترقی کے لیے ایک سمت دی جاتی ہے۔ یہ انسانوں کو زندگی گزارنے کا نہایت ہی حکیمانہ نظام دیتا ہے جس کے کھلے اور وسیع حدود کے اندر انسان زندگی کی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے۔

قرآن کی جو صفت یہاں لائی جاتی ہے۔ وہ صفت حکمت ہے۔ حکمت ایک ذی عقل کی صفت ہوتی ہے جو زندہ اور عقلمند ہو۔ قرآن کریم کی یہ صفت بتا کر یہ تاثر دینا مطلوب ہے کہ یہ زندہ اور قصد و ارادے کی مالک کتاب ہے۔ اسی وجہ سے یہ حکیم ہے۔ اگرچہ قرآن کریم کے لیے یہ صفت بطور مجاز استعمال کی گئی ہے لیکن یہ ایک عظیم حقیقت کی مظہر ہے۔

خلاصہ

قرآن کریم کی صفت حکمت کی صفت بندے کو کمال اور حکمت عطا کرتی ہے۔ جتنے مقامات پر بھی قرآن کی صفت الحکیم ذکر کی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب میں قاری کے لیے حکمت، عقل کامل، فکر صحیح اور تدبر اور تفکر کا صحیح راستہ موجود ہے۔ یہ صفت اپنے قاری کی عقل، فہم، تدبر اور تفکر کو صحیح راستے پر ہموار کرتی ہے اور فکر و تدبر میں اضافہ کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا اخلاق قرآن کریم کا ہونا اس بات کا بھی بین ثبوت ہے کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو حکمت کے درجات میں سے کچھ درجے قرآن کریم میں غور و فکر کی وجہ سے عطا کیے گئے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کی صفت الحکیم قاری کے عقل و فہم اور اس کی حکمت کو زیادہ کرتی ہے۔

۱۔ کاندھلوی، معارف القرآن، ج ۶، ص ۲۱۰

فصل سوم

نبی کریم ﷺ کی صفت حکمت کے تفسیری اطلاقات

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علوم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نبی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے لیے امت کو اللہ تعالیٰ کی معرفت سکھانے اور نبوت کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے کن کن اوصاف کا ہونا ضروری ہے، معاشرے میں معاشی، معاشرتی اور سیاسی میدان میں استحکام کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے دین کا پرچار کرنے کے لیے زمین میں ایک شخص کے پاس کون سے وسائل ہونا ضروری ہیں جن کی مدد سے وہ اللہ تعالیٰ کے دین کا کام احسن طریقے سے کر سکتا ہے۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کے لیے جن چار چیزوں کی دُعا فرمائی، ان میں چوتھی چیز جو ضروری ہے وہ یہ کہ حکمت کی تعلیم دے۔ آپ ﷺ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے سب سے پہلے آپ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ سے حکمت کی دعا مانگی۔ یقیناً اس دُعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ تمام اوصاف سے مزین کر کے مبعوث فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾[1]

اے پروردگار ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھ ان پر تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو کتاب اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو بیشک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

ابن جریر اس آیت کی تفسیر میں آپ ﷺ کے وصف حکمت کا معنی لکھتے ہیں:

"المعرفة بالدين، والفقه في الدين، والاتباع له"[2]

آپ ﷺ کے وصف حکمت سے مراد دین کی معرفت، دین کی کامل سمجھ، فقہ اور اس پر اتباع (کی تعلیم) مراد ہے

یعنی نبی کریم ﷺ کتاب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کتاب کے احکامات کی تفصیل، اس کے مقاصد و حکمتیں، اس کے اسرار و رموز اور دینی اور دنیوی معاملات میں حکمت عملی کی جامع تفصیل کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔

دوسرے مقام پر سورۃ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے:

﴿كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾[1]

---

۱ ۔ البقرہ: ۱۲۹/۲

۲ ۔ الطبری، جامع البیان، ۸۷/۳

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے
تم کو اور سکھلاتا ہے تم کو کتاب اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ پر آپ ﷺ کو عطا کیے جانے والے ان اوصاف کو پہلی بار احسان جتلا کر ذکر فرمایا۔ اس آیت مبارکہ سے پہلے عملی تربیت جس میں اسوہ حسنہ کے عظیم مراتب شامل ہیں، ان کا حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت میں تعلیم کا حکم دیا جا رہا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا دوسری بار وصفت حکمت ذکر کیا گیا۔ اس تکرار کا مقصد امت کے دلوں کے اندر اس بات کو راسخ کرنا تھا کہ قرآن کریم کے احکامات کے اسرار و رموز کو اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ سے ہی سمجھا اور سیکھا جا سکتا ہے اور ان کو عملی زندگی میں ڈھالنے کا سلیقہ بھی آپ ﷺ ہی سکھائیں گے۔

قرآن کریم میں اس سے پہلے بھی اور اب بھی وصفت حکمت تو ذکر کیا گیا لیکن اس کی تفصیل کسی جگہ پر واضح نہیں کی کہ آپ ﷺ حکمت کی کسی اور کون سے تعلیم دیں گے، اس لیے کہ کتاب (الکتاب) کے اندر توحید، فضائل اور احکامات کے اُصول تو شامل ہیں لیکن عائلی زندگی گزرانے کا سلیقہ، سیرت کے ایسے پہلو جن میں تہذیب نفس، تدبیر منزل اور سیاست مدن کے عملی احکامات ہیں۔ ان کی تفصیل شامل نہیں ہے تو نبی کریم ﷺ کی تعلیم کتاب کے بعد تعلیم حکمت کا مقصد حکمت عملی کے ان تینوں احکامات کو عملی شکل میں امت کے سامنے رکھنا تھا تاکہ احکامات کے اِصول تو قرآن سے سمجھ لیے جائیں جب کہ ان کی عملی تطبیق آپ ﷺ کے وصف حکمت سے سیکھی جائے۔

علامہ رشید رضا اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ولهذا أطلق عليها لفظ الحكمة فإنها كانت كالحكمة - بالتحريك -لتأديب الفرس، ولولا هذه التربية بالعمل لما كان الإرشاد القولي كافيا في انتقال الأمة العربية من طور الشتات والفرقة والعداء والجهل والأمية إلى الائتلاف والاتحاد والتآخي والعلم وسياسة الأمم، فالسنة هي التي علمتهم كيف يهتدون بالقرآن، ومرنتهم على العدل والاعتدال في جميع الأحوال."[2]

اس آیت میں وصف حکمت کا معنی تادیب سکھانے کے معنی میں ہے جس طرح گھوڑے کو باقاعدہ طور پر سکھایا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کی باقاعدہ عملی تربیت فرمائی۔ اگر آپ ﷺ کے وصف حکمت کا عملی پہلو نہ ہوتا تو صرف آپ ﷺ کے اقوال مبارکہ جو کہ عربی زبان میں تھے امت تک منتقل ہو جاتے اور مختلف طبقات، فرقے، جاہل اور ناسمجھ لوگ علمی، اور سیاسی زندگی میں صرف آپ ﷺ کے اقوال

۱۔ البقرہ: ۱۵۱/۲

۲۔ رشید رضا، تفسیر المنار، ۱۲۶/۳

کی پیروی نہ کر سکتے، پس حکمت کا عملی پہلو یعنی آپ ﷺ کی سنت مبارکہ نے ان کو قرآن سے ہدایت لینے کے طریقے بتائے اور زندگی کے تمام اِمور میں عدل اور اعتدال کی تعلیم دی گئی۔

آپ ﷺ کے وصف حکمت کا ذکر تیسرے مقام پر سورۃ آل عمران میں ذکر کیا گیا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾[1]

درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

یعنی اس سے پہلے آپ ﷺ کا ظاہری وجود نہ تھا صرف دُعا ابراھیم تھی، اب وجود کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خود آپ ﷺ کو دیئے جانے والے اوصاف کا ذکر فرمایا، جن میں (الحکمۃ) کی صفت بھی ہے، ساتھ ہی اس آیت کریمہ کے آخر میں ضلل یعنی گمراہی کی اصطلاح بھی ذکر فرمائی گئی اور وہ بھی ضلل مبین یعنی کھلی اور واضح گمراہی جس میں کسی قسم کو کسی کو شک و شبہ نہ ہو اور جو ہر ایک پر عیاں ہو، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ضلل سے پہلے جتنے اوصاف بھی آپ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائے ہیں یہ سارے اوصاف نہ صرف گمراہی کی ضد ہیں بلکہ اس کا مکمل خاتمہ کرنے والے ہیں، خصوصاً ان اوصاف میں سے آخری وصف حکمت کا ذکر فرمانے کے متصل بعد ضلل کا ذکر فرمایا جس سے نظم قرآن کا یہ اسلوب سمجھ میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کا وصف حکمت صریح جاہلیت اور ضلل مبین کی ضد ہے، جہاں پر بھی آپ ﷺ کا یہ وصف حکمت ہو گا وہاں گمراہی نہیں رہے گی، گویا آپ ﷺ حکمت کے ذریعے ظلمت، گمراہی، قساوت، سفاہت اور صریح گمراہی کو نور ایمان، حلم، علم اور حسن اخلاق سے بدلنے کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔

اگر اس سورت کے نزول کا پس منظر، زمانہ نزول اور اس کے نزول کے وقت حالات وواقعات کا جائزہ لیں اور پھر خاص کر ان آیات کو دیکھیں جن میں یہ اوصاف ذکر فرمائے گئے ہیں کہ یہ آیات اور اسی مضمون کی سابقہ آیات کا نزول کا وقت اور زمانہ کیا تھا اور اس آیت کریمہ کا سابقہ آیات کے ساتھ یہاں پر خاص تعلق اور ربط کیا ہے، اگر ہم ان چاروں مقامات کا الگ الگ ذکر کریں تو ہر ایک مقام پر ایک خاص وقت، خاص زمانہ اور خاص مقام پر ہی کیوں ان اوصاف کا تکرار کیا گیا، اس سے قبل ایک مختصر بات اور ایک ابہام کو دور کرنا ضروری ہے کہ ہر ایک مقام پر وصف ذکر کرنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ حکمت پہلے ایک خاص وقت میں عطا کی گئی اس وقت اس وصف کی کمیت و کیفیت اور تھی اور کچھ وقت کے بعد دوبارہ یہ قوت وصلاحیت عطا کی گئی اسی طرح تیسری اور چوتھی بار بھی وقت اور زمانہ کے

۱۔ آل عمران: ۳/۱۶۴

اعتبار سے بار بار پھر عطا کی گئی، اس کا جواب یہ ہے کہ تکرار کا مقصد ہر گز یہ نہیں ہے کہ پہلے تھوڑی حکمت و دانائی عطا کی گئی اور پھر زیادہ، یا یہ مطلب بھی نہیں کہ بار بار زمانہ اور وقت کی رعایت کے مطابق بار بار یہ وصف عطا کیا گیا، اگرچہ حکمت کا نزول بھی قرآن کریم کے نزول سے قبل آپ ﷺ کو پہلے ہی عطا کر دیا گیا، اس لیے کہ یہ بات بھی ثابت ہے کہ حکمت کا تعلق کتاب اور قرآن کے ساتھ نہیں ہے، یہ الگ صفت اور وصف خاص ہے جو آپ ﷺ کو عطا فرمایا گیا اور پھر یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اس وصف کے تعلق نزول قرآن کے ساتھ بھی نہیں ہے اس لیے کہ ایک تو اس کی تائید ایک حدیث مبارکہ میں بھی ہے کہ جب آپ ﷺ بچپن میں تھے اور شق صدر کا واقعہ ہوا اسی وقت ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ کے سینے میں حکمت ڈال دی تھی، پھر جب آپ ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے حجر اسود کو نصب کرنے کا جھگڑا ہوا تو آپ ﷺ نے مختلف قبائل کے درمیان جنگ وجدال کی نوبت بھی نہ آنے دی اور کمال حکمت عملی سے آپ ﷺ نے ایک چادر کے چاروں اطراف مختلف قبائل کو پکڑائے اور خود حجر اسود کو نصب فرما دیا، یہ آپ ﷺ کی بعثت سے قبل حکمت اور حکمت عملی کی واضح دلیل ہے، لہٰذا حکمت کا تعلق قرآن کریم کے نزول کے ساتھ نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کو بچپن ہی میں یہ وصف عظیم عطا کر دیا گیا تھا۔

دین کی دعوت کے مرحلے میں آپ ﷺ کا برتاؤ، طریقہ کار اور لوگوں کو دین کی طرف بلانے میں آپ ﷺ کی (Techniques) سمجھنے میں مدد ملتی ہے جس کو مفسرین کرام نے بھی اپنے اسلوب کے مطابق واضح کیا ہے۔

حکمت کے نزول سے مراد نبی کریم ﷺ کی ایسی قوت اور صلاحیت ہے جس کے مطابق آپ ﷺ معاشرہ میں فیصلے فرماتے ہیں، اسی طرح حکمت کے اندر اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب کی شائستگی بھی شامل ہے جس میں آپ ﷺ کا کوئی بھی ثانی نہیں ہے۔ اگر الکتاب سے مراد علم اور قانون ہے تو الحکمۃ تہذیب کا ایک خزانہ، قانون کی عمل داری کا طریقہ اور عمل کروانے کی صلاحیت اور قوت جیسی خوبی پر بولا گیا ہے۔ معاملات اور احکامات میں نبی کریم ﷺ کی گہری بصیرت آپ ﷺ کا عمدہ اخلاق اور عند اللہ حق اور صواب کے مطابق فیصلہ کرنے کی قوت جو آپ ﷺ کو عطا فرمائی گئی اس کا نام حکمت ہے۔[1]

علامہ بقلیؒ نے اپنی تفسیر عرائس البیان میں لکھتے ہیں کہ حکمت سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب، اس کی معرفت کے سارے راستے آپ ﷺ کو بتا دیئے گئے نیز الکتاب سے مراد تو آیات ہیں اور حکمت سے مراد اللہ تعالیٰ کی تجلیات ہیں۔[2]

صاحب کشاف علامہ زمخشری کے نزدیک حکمت کو نازل کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خفیہ امور اور لوگوں کے قلوب میں پوشیدہ رازوں کی اطلاع آپ ﷺ کو عطا کر دی گئی۔[3]

امام رازی لکھتے ہیں :

---

۱ ۔ دیکھیے : ثعلبی، الکشف والبیان، ۴/۴، ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۲۳۲/۴، القرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۹۹/۳،

۲ ۔ البقلی، عرائس البیان فی حقائق القرآن، ۳۲/۳، ابن عربی، تفسیر القرآن، ۱۲۳/۳

۳ ۔ الزمخشری، الکشاف، ۹۴/۴

"أنه يعلمهم حكمة تلك الشرائع وما فيها من وجوه المصالح والمنافع"[1]

نبی کریم ﷺ کے باقی مناصب کے ساتھ ایک منصب حکمت کی تعلیم دینا بھی تھا اور ساتھ ہی شریعت کے مصالح اور منافع کے بھی تعلیم مراد ہے۔

یعنی حکمت سے مراد شریعت اسلامیہ کے نازل کردہ جتنے بھی احکامات ہیں ان کے مقاصد اور فوائد، مصالح اور مفاسد، ان کی غرض وغایت، ان کی علتیں اور ان کے اندر حقائق کے بارے میں لوگوں کو بتانا ہے۔ یہ سب آپ ﷺ کو بطور حکمت عطا فرمادیئے گئے۔

تبلیغ میں رحمدلی اور شفقت

دین اسلام کا اور اس کی طرف دعوت دینے کا اصول اور تقاضا ہے کہ مبلغ رحم دل اور شفیق ہو، نبی کریم ﷺ مسلمانوں کے لیے رحم دل اور شفیق اور غیر مسلم جن کو دعوت دین پہنچاتے ان کے لیے مسلمانوں سے بھی زیادہ شفقت، محبت اور نرم خوئی کا رویہ رکھتے جو اسلام کی دعوت کے لیے حکمت کا بھی تقاضا ہے، آپ ﷺ اپنے اس وصف میں اتنے اعلیٰ تھے کہ قرآن کریم نے آپ ﷺ کا وصف اسم مبالغہ کے طور پر استعمال فرمایا:

﴿ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴾[2]

آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا بھی بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے حریص ہے تمہاری بھلائی پر ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے۔

تبلیغ اور دعوت کا یہ فریضہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ جنات تک بھی آپ ﷺ کو آپ ﷺ نے دین کی دعوت دی کیوں کہ آپ کا وصف تمام جہانوں کے لیے رحمت وارفت والا ہے نہ کہ صرف انسانوں کے لیے، کیونکہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ﴾[3]

اور تجھ کو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر کر جہان کے لوگوں پر

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب قوم سیاسی اور حکمت عملی کے اعتبار سے ایک نہایت پست قوم تھی، اہل عرب اسلام سے پہلے اپنی پوری تاریخ میں کبھی وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ ان پر غرور اور انار کی کا تسلط رہا، پوری قوم باہم جنگجو اور باہم نبرد آزما قبائل کا مجموعہ تھی جس کی ساری قوت وصلاحیت خانہ جنگیوں اور آپس کی لوٹ مار میں برباد ہوتی تھی۔ اتحاد، تنظیم، شعور، وغیرہ چیزیں جس پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بنیادی قائم ہوتی ہیں

۱۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۵۹/۴

۲۔ التوبہ: ۱۲۸/۱۱

۳۔ الانبیاء: ۱۰۷/۲۱

ان کے اندر یکسر مفقود تھیں، ایک خاص بدویانہ حالت پر صدیوں تک زندگی گزارتے گزارتے ان کا مزاج نراج[1] پسندی کے لیے اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ان کے اندر وحدت و مرکزیت پیدا کرنا ایک امر محال بن چکا تھا، خود قرآن کریم نے ان کو﴿قَوْمًا لُّدًّا﴾سے تعبیر فرمایا:

﴿فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا﴾[2]

پس بیشک ہم نے آسان کیا ہے اس قرآن کو آپ کی زبان میں تاکہ آپ بشارت سنائیں متقیوں کو، اور ڈرائیں آپ اس قرآن کے ساتھ ان لوگوں کو جو سخت جھگڑالو ہیں۔

جب کہ ان کی وحدت تنظیم کے بارے میں فرمایا:

﴿لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ﴾[3]

اگر آپ خرچ کرتے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب، تو نہ الفت ڈال سکتے ان کے دلوں میں

لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے اپنی ۲۳ سالہ زندگی میں اپنی حکمت بالغہ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پوری قوم ایک بنیان مرصوص بن گئی۔ یہ صرف متحد و تنظیم ہی نہیں بلکہ اس کے اندر صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزوع واختلاف بھی ایک ایک کر کے دور ہو گئے، یہ صرف اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہو گئی بلکہ اپنے باطنی عقائد و نظریات میں بھی بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہو گئی، یہ صرف خود ہی منظّم نہیں ہو گئی بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا اور اس کے اندر حکم واطاعت دونوں چیزوں کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ابھر آئیں کہ صرف استعارے کی زبان میں نہیں بلکہ واقعات کی زبان میں یہ قوم شتربانی کے مقام سے جہانبانی کے مقام پر پہنچ گئی اور اس نے بلا استثناء دنیا کی ساری ہی قوموں کو سیاست، حکمت اور جہانبانی کا درس دیا۔[4]

سورۃ الجمعہ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾[5]

وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک (باعظمت) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھیجا وہ ان پر اس کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان (کے ظاہر و باطن) کو پاک کرتے ہیں

۱۔ نراج پسندی کی اصطلاح ہے، نراج (Anarchism) ایک سیاسی نظریہ ہے جس کا منشا معاشرہ میں مملکت کے وجود سے انکار کرنا ہے۔(احمد سہیل، نظریاتی نراجیت اور ادب، https://www.mukaalma.com/146417/)

۲۔ مریم: ۹۷/۱۹

۳۔ الانفال: ۶۳/۸

۴۔ تدبر قرآن، ۱۴۱/۴

۵۔ الجمعہ: ۲/۶۲

اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں، بیشک وہ لوگ ان (کے تشریف لانے) سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اصطلاح قرآنی میں آپ ﷺ کے وصف حکمت کی تفسیر میں ماقبل آیت کی ساتھ مناسبت بیان کرتے ہوئے علامہ ثقفیؒ لکھتے ہیں:

"وهي في معرض التنبيه لمن تقدم الثناء عليه"[1]

اس سے ماقبل سورت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف وتوصیف فرمائی ہے جو اسلام کی راہ میں مشکلات برداشت کرتے ہیں۔

جب کہ اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو انہی لوگوں کے لیے کتاب کی تعلیم اور تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ حکمت ودانائی سکھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اس عظیم نعمت کے قابل ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی طرف سے عطا کی جانے والی حکمت سکھائی جائے۔ حکمت کی تعلیم اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے محبوب بنایا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دین اسلام کی خاطر مضبوط دیوار کی طرح یک جان ہو کر لڑتے ہیں۔[2]

نبی کریم ﷺ کی دفاعی حکمت عملی

سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾[3]

اور جب کہ آپ صبح کے وقت اپنے گھر سے چلے مسلمانوں کو مقاتلہ کرنے کے لیے مقامات پر جما رہے تھے اور اللہ تعالیٰ سب سن رہے تھے سب جان رہے تھے۔

یہ آیت کریمہ جنگ اُحد میں آپ ﷺ کی سرپرستی اور کمانڈر کی حیثیت اور آپ ﷺ کی جنگی ذمہ داریوں اور جنگی حکمت عملی کو واضح کر رہی ہے۔ آپ ﷺ نے خود اپنی تدبیر کے ساتھ پہاڑ کے ایک درے پر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو پچاس صحابہ کے ساتھ متعین فرمایا اور حکم فرمادیا کہ آپ لوگ خوب چوکنے رہیں اگر تیروں کی بارش بھی ہو جائے تو آپ نے اپنی جگہ نہیں چھوڑنی، مگر کتب تفسیر اور کتب سیرت اس بات کی گواہ ہیں کہ اس جماعت سے غلطی ہوگئی تھی۔ اس غلطی کا نتیجہ جو صحابہ کرام اور خصوصا ان غلطی کرنے والوں نے دیکھا تو آپ ﷺ اپنی حکمت عملی اور تدبیر سے صحابہ کرام کو بتانا چاہتے تھے کہ مومنوں کو اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ رکھنا چاہیے، فتح دینا یا شکست سب اللہ

۱۔ الثقفی، البرھان فی تناسب سور القرآن، ص ۳۳۶

۲۔ ایضاً، ص ۳۳۷

۳۔ آل عمران: ۱۲۱/۳

تعالیٰ کی قدرت میں ہے، آپ ﷺ کی تمام تدبیروں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلحہ اور مجاہدین تیار کر کے میدان میں آنا چاہیے پھر نتیجہ اللہ کی ذات پر چھوڑنا چاہیے۔[۱] صوفی عبدالحمید سواتی[۲] کا مؤقف اسی طرح ہے۔

سورۃ الحشر میں ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ ۚ مَا ظَنَنتُمْ أَن يَخْرُجُوا ۖ وَظَنُّوا أَنَّهُم مَّانِعَتُهُمْ حُصُونُهُم مِّنَ اللَّهِ فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا ۖ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ ۚ يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ﴾[۳]

وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے کافروں کو پہلی بار جلاوطن کرنے کے لیے ان کو ان کے گھروں سے نکال، تمھیں ان کے نکلنے کا گمان (تک) نہ تھا اور وہ اس گھمنڈ میں تھے کہ ان کے قلعے ان کو اللہ (کے عذاب) سے بچالیں گے، پس ان پر اللہ کا عذاب ایسی جگہ سے آیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا، اور اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے منہدم کر رہے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے (بھی) سوائے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔

نبی کریم ﷺ نے بنو نضیر کے یہودیوں کو جلاوطن فرمانے کا فیصلہ فرمایا تو اس موقع پر مفسرین کرام نے آپ ﷺ کی اس حکمت عملی کو بیان فرمایا ہے، بنو نضیر کے یہودی جو اپنا تمام قیمتی اثاثہ لے گئے تھے اور ان کا چھوڑا ہوا اثاثہ اور اراضی مسلمان مہاجرین میں تقسیم کی گئی، صرف دو انصار کو اس میں سے ان کے افلاس کے باعث حصہ دیا گیا، آپ ﷺ کی اس حکمت عملی کی وجہ سے مہاجرین کے معاشی بوجھ سے انصار آزاد ہوگئے۔ مفسرین کرام نے آپ ﷺ کی اس حکمت عملی کے درج ذیل فوائد لکھے ہیں:

۱۔ مسلمانوں کو بیرونی حملہ کی صورت میں اندرونی غداروں سے چھٹکارا حاصل ہوا۔

۲۔ معاشی لحاظ سے مسلمانوں کو استحکام نصیب ہوا۔

۳۔ مسلمانوں کی عسکری پوزیشن مضبوط ہوگئی اور مدینہ کے اندر بسنے والے دیگر یہودی و منافقین پر دھاک بیٹھ گئی۔

---

۱ ۔ سواتی، معالم العرفان فی دروس القرآن، ۲۸/۴

۲ ۔ (مولانا عبدالحمید خان سواتی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے بانی، ان کا تعلق مانسہرہ کے علاقہ میں آباد سواتی پٹھان قوم سے تھا۔ وہ ۱۹۱۷ء میں شنکیاری سے چند میل آگے کڑمنگ بالا کے پہاڑ کی چوٹی پر واقع "چیڑاں ڈھکی" میں جناب نور احمد خان مرحوم کے گھر میں پیدا ہوئے اور ۹۲ برس کی عمر میں ۶ اپریل ،۲۰۰۸ء کو طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے، دور حاضر کی مایہ ناز تفسیر "معالم العرفان فی دروس القرآن" دراصل حضرت والد محترم مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی رحمہ اللہ کے اُن دروس کا مجموعہ ہے جو آپ نے چالیس سال سے زائد عرصہ جامع مسجد نور و مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ میں بیان فرمائے، ابتداء ہی سے ان دروس کی افادیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ریکارڈ کر لیا گیا تھا، اس طرح قرآن پاک کی یہ مکمل تفسیر چار سو پچھتّر کیسٹوں میں پوری ہوئی، پھر اس کی طباعت کا سلسلہ رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ بمطابق اگست ۱۹۸۱ء میں شروع کیا گیا جو کہ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ بمطابق ۱۹۹۶ء میں تیرہ ہزار صفحات کے ساتھ بیس جلدوں میں پایہ تکمیل کو پہنچا)

۳ ۔ الحشر: ۲/۵۹

۴۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے یہودی محرر کی جگہ حضرت زید بن ثابت کو مقرر فرمایا۔

۵۔ مسلمانوں کو مدینہ کے اندرونی خلفشار سے نجات مل گئی اور اس طرح وہ گردوپیش کے بدوؤں کی خبر لینے کے لیے تیار ہوگئے۔[۱]

نبی کریم ﷺ کو قریش مکہ اور یہود مدینہ سے قدرے اطمینان حاصل ہوا تو آپ ﷺ نے مدینہ کے گردوپیش کے سرکش قبائل کی سرکوبی کا ارادہ فرمایا، آپ ﷺ نے مختصر عرصہ میں غزوہ بنولحیان، غزوہ ذی قرد اور غزوہ بنی المصطلق پیش آیا۔ مفسرین کرام نے سورۂ نور کی ابتدائی آیات کے ضمن میں لکھا ہے کہ ان غزوات میں واقعات اور نتائج کے اعتبار سے غزوہ بنی المصطلق بہت اہم ہے، اس غزوہ کے دوران ایسے واقعات پیش آئے جن کی الجھنوں کو دور کرنے میں آپ ﷺ نے کمال حکمت اور تدبر سے کام لیا اور ملت اسلامیہ کا شیرازہ ابتدائی مراحل پر ہی بکھرنے سے بچا لیا، ان معاملات کو آپ ﷺ اگر خوش اسلوبی سے نہ نمٹاتے تو امت مسلمہ پر ان کے دوررس نتائج مرتب ہوتے اور آج ملت اسلامیہ کی ہئیت ترکیبی بالکل مختلف ہوتی۔

سورۃ نور میں واقعہ افک بیان ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾[۲]

اور اللہ تمہارے لیے آیتیں صاف بیان فرماتا ہے، اور اللہ علم و حکمت والا ہے

واقعہ افک میں منافقین کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو پریشان اور افسردہ کرنے کی کوشش کی گئی، اس موقعہ پر آپ ﷺ نے نہایت حکمت عملی سے ابتداء حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کنارہ کشی اختیار فرمائی۔ آپ ﷺ نے اس واقعہ میں جذباتیت کو غالب نہ آنے دیا اور صبر و تحمل کا دامن تھامے رکھا۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بریت میں قرآن کریم کی آیات نازل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حکمت کا ذکر فرمایا ان آیات میں صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برات کا اظہار نہیں تھا بلکہ ایسے واقعات میں اسلامی معاشرہ کا طرز عمل بھی بتلایا گیا تھا جس میں حکمت کے بے شمار پہلو ہیں۔ اس سارے واقعے میں نبی کریم ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اور مسلمانوں کا طرز عمل ملاحظہ کریں تو سمجھ آتی ہے کہ آپ ﷺ کمال ضبط اور حکمت کی تصویر ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تحمل و وقار کے ساتھ اسے برداشت کرتی ہیں، اللہ کے کلام کے ذریعہ مسلم معاشرہ کے طرز عمل کے خدوخال واضح کیے جاتے ہیں اور ایسے معاملات سے نمٹنے کا ایک دائمی بندوبست کر دیا جاتا ہے اور اس میں ملوث افراد کے ساتھ کوئی خصوصی برتاؤ نہیں کیا جاتا ہے، نہ ہی قانون کی نظر میں ممتاز اور معتبر شخصیتوں کے ساتھ ترجیحی سلوک روا رکھا جاتا ہے، جن افراد پر تعزیر لاگو کی گئی بعد ازاں ان کے ساتھ مخصوص برتاؤ نہیں کیا جاتا ماسوائے جس کا حکم قرآن کریم میں صادر ہوا ہے۔[۳]

۱۔ پانی پتی، تفسیر مظہری، ۱۳۹۹/۵

۲۔ النور: ۱۸/۲۴

۳۔ بھوپالی، صدیق حسن خان، فتح البیان فی مقاصد القرآن، ۱۸۲/۹

آپ ﷺ کو تمام علوم وحکمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیے گئے:

﴿وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾[1]

اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور آپ کو ان تمام چیزوں کا علم عطا فرمادیا ہے جن کو آپ (پہلے) نہیں جانتے تھے اور اللہ کا آپ پر فضل عظیم ہے۔

علامہ صدیق حسن خان نے یہاں وصف حکمت کا معنی (القضاء) سے کیا ہے یعنی آپ ﷺ کتاب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی امت کے نزاعی فیصلوں میں بھی مرتبہ قضا پر فائز ہیں۔ آپ ﷺ ہی تمام دنیوی اور دینی مسائل کے فیصلے حل کرنے والے ہیں۔ اسی لیے تو آپ ﷺ کو اپنی زبان حق سے کہلوایا گیا۔

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ﴾[2]

اور جب آیا عیسیٰ نشانیاں لے کر بولا میں لایا ہوں تمہارے پاس پکی باتیں اور بتلانے کو بعضی وہ چیز جس میں تم جھگڑتے تھے سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حکمت کی تعلیم کے لیے تمثیلات کا اسلوب اختیار فرمایا۔ تاہم اس مرحلے پر انجیل کی تعلیم بھی ادھوری رہی کیونکہ بنی اسرائیل کا ذہنی معیار ابھی بھی کامل حکمت کو قبول کرنے والا نہ تھا۔ حضرت عیسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ میں نے تم سب کو بہت چیزیں سکھائی تھیں مگر تم ان کے متحمل نہیں ہو سکو گے۔ ایک رسول جو بعد میں آنے والے ہیں وہ شریعت کے قوانین اور دین کی حکمت دونوں کے جامع ہوں گے۔ ایک طرف وہ شریعت کے احکام (حلال اور حرام کی حدود وغیرہ) بتائیں گے اور دوسری طرف گہری حکمت اور دانائی کی باتیں بھی سکھائیں گے۔ آپ کے نزدیک قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کے وصف حکمت اور کتاب سے یہی مراد ہے کہ آپ ﷺ دونوں پہلوؤں سے امت کو تعلیم دیں گے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ حکمت سے اس مقام پر سنت مراد لیا ہے مگر علامہ فراہی کے نزدیک آپ نے اپنی کتاب الرسالہ میں ہر علم کو قرآن کریم کے علوم پر منحصر مانا ہے اور لکھا ہے کہ دل اگر

۱۔ النسآء: ۱۱۳/۴

۲۔ الزخرف: ۶۳/۴۳

منور ہوتے ہیں تو صرف حکمت کے نور سے ہی منور ہوتے ہیں اور یہ حکمت اللہ تعالیٰ کی کتاب کے علم اور اس کے مطابق عمل کرنے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔[1]

آپ ﷺ کو خود حکیم ہونا تو قرآن کریم سے ثابت ہے لیکن آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے عجائب و غرائب اور علوم کے ایسے معارف عطا کیے گئے کہ آپ ﷺ نے حکمت و دانائی اور سلیقہ مندی کی باتیں سکھا کر لوگوں کو ایسا حکیم اور دانشور بنا دیا کہ دنیا کے بہت بڑے دانا اور حکیم اور علماء وفضلاان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔[2]

خلاصہ

قرآن کریم کے وصف حکمت اور اللہ تعالیٰ کی صفت الحکیم کے ساتھ ساتھ قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کا ایک عظیم اور بلند رتبہ وصف الحکمۃ ہے، آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ منصب بھی عطا کیا گیا کہ آپ ﷺ لوگوں کو حکمت بھی سکھائیں، بدیہی طور پر یہ ہر انسان جانتا ہے کہ جب معلم کو تعلیم دینے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے تو معلم کی صلاحیتوں اور اس کے اوصاف کے پیش نظر اس کو تعلیم کے لیے چنا جاتا ہے اور اس کو یہ عظیم ذمہ داری اسی لیے سونپی جاتی ہے کہ نہ صرف وہ خود عالم ہے بلکہ تعلیم اور تعلم کے طریقے اور مناہج کو بھی جانتا ہے۔ اور دوسرں تک منتقل کرنا بھی جانتا ہے، پھر جب ہم علمی میدان میں تخصصات (Specialization) کی بات کریں تو یہ بات بھی ہر ایک بخوبی جانتا ہے کہ تعلیم میں ہر شعبہ جات کے مخصوص اور ماہر تعلیم استاتذہ کا انتخاب کیا جاتا ہے اس لیے کہ ان کا تخصص ہی اسی ایک شعبہ میں ہوتا ہے، ایک ایسے معلم جن کی بعثت کا مقصد (انما بعثت معلما) ہی تعلیم دینا ہے اور اس پر مزید یہ کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جن چار فرائض نبوت سے نوازا اور ان چار ذمہ داریوں کے لیے آپ ﷺ کو حکم دیا تو عقلاً اس کو سمجھنا ہر ایک کے لیے مشکل نہیں ہے کہ آپ ﷺ ان چاروں شعبہ جات کے تخصصات میں اپنی مثال آپ تھے، آپ ﷺ کے علمی تخصصات کو قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾[3]

۱۔ الفراہی، حمید الدین، حکمۃ القرآن، ص۱۹

۲۔ دیکھیے: روح المعانی، ۲۴۰/۱۴، مزید دیکھیں: شوکانی، فتح القدیر، ۴/۷/۷، قاسمی، محاسن التاویل، ۱۷۶/۷

۳۔ آل عمران: ۱۶۴/۳

درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

آپ ﷺ پر حکمت کے نزول کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے خود جو اجتہادات فرمائے اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے جو نتائج نکالے اس اجتہاد اور نتائج کا تعلق بھی حکمت سے ہے، اس علم کا تعلق بھی آپ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے جو بلا شرکت غیر صرف آپ ﷺ کو ہی عطا فرمایا گیا۔آپ ﷺ پر نازل کردہ حکمت کا معنی یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اعلیٰ صفات ، فن تدریس کی اعلیٰ مثال اور تربیت کے بہت مفید اور عمدہ اسالیب میں آپ ﷺ اپنی مثال آپ ہیں تو اس اعتبار سے بھی آپ ﷺ کو قرآن کریم نے ایک خاص امتیاز عطا فرمایا:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾[1]

اور تو پیدا ہوا ہے بڑے خُلق پر

طالب علم ،شاگرد اور متعلّم کو عظیم کردار اور منزل کے حصول کے لیے معلم ، راہنما، مربی اور استاذ کے پاکیزہ اور اعلیٰ کردار و اطوار (Role Model) کی تلاش ہوتی ہے ، جس کی چال ڈھال سے اور اس کے انداز و کردار سے طالب علم خود کو سنوارتا ہے، نبی کریم ﷺ کا وصف حکمت اگر اس اعتبار سے ہو تب بھی آپ ﷺ کی چال اور انداز کو قرآن کریم نے حسین کردار اور حسین نمونہ کہا ہے:

﴿لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[2]

تمہارے لیے بھلی تھی سیکھنی رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کی چال

---

۱ ۔ القلم: ۴/۶۸

۲ ۔ الاحزاب: ۲۱/۳۳

فصل چہارم

انبیاء علیہم السلام کی صفتِ حکمت کے تفسیری اطلاقات

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی قرآن کریم میں صفت (الحكمة) بیان فرمائی ہے۔ اس صفت حکمت میں کچھ انبیاء علیہم السلام کو خاص کیا گیا جن کا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے اس صفت کا ذکر فرمایا، مگر ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے عمومی طور پر تمام انبیاء علیہم السلام کے لیے صفت الحکمت ذکر فرمائی ہے۔ سورۃ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ﴾[1]

اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتادے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا بولے ہم نے اقرار کیا فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

سورۃ الانعام میں اجمالی طور پر دس انبیاء علیہم السلام کے نام ذکر کیے گئے اور پھر ان کے لیے وصف حکمت ذکر کیا گیا۔[2]

مگر یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم میں کچھ مقامات پر اللہ تعالیٰ نے پہلے تمام انبیاء یعنی (النَّبِيِّين) فرما کر کسی بات یا صفت کو عمومی طور پر ذکر فرمایا ہے اور اس کے متصل بعد اسی صفت کو ذکر کرتے ہوئے کچھ انبیاء علیہم السلام کے نام بھی لیے ہیں کہ ان کو یہ صفت عطا فرمائی گئی۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرہ کی ایک آیت کریمہ میں ہے:

﴿قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾[3]

اس کے بعد سورۃ آل عمران میں اسی مضمون کو مختلف انداز میں

۱۔ البقرہ: ۱۳۶/۲

۲۔ سورۃ الانعام میں ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَى قَوْمِهِ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ (۸۳) وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَى وَهَارُونَ وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۸٤) وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَى وَعِيسَى وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ (۸٥) وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ (۸٦) وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۸۷) ذَلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۸۸) أُولَئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ﴾ الانعام: ۸۹-۸۳

۳۔ البقرہ: ۱۳۶/۲

﴿قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾[1]

اسی تکرار کے بارے میں شاہ عبدالعزیز[2] محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ

اوچه بجميع انبيا داده اند اجمالا ازان معادم شده پس اعاده برآن مطلب باز در مقام اجمال تكرار محض ميشود آرى در مقام تفصيل وتخصيص بعضے انبياء ذكر آن مفيد است[3]

جو کچھ انبیاء علیہم السلام کو عطافرمایا گیا اگرچہ اس کا اجمالی طور پر ذکر پہلے ہو چکا مگر مقام اجمال میں اس کا تکرار اعادہ ہے البتہ بعض انبیاء علیہم السلام کی تفصیل اور تخصیص کے مقام میں اس کا ذکر فائدے سے خالی نہیں ہے۔

قرآن کریم میں اوصاف کا تکرار کہیں بھی اور کبھی بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوتا۔اسی طرح حکمت کی صفت تمام انبیاء علیہم السلام کے لیے کا ایک مقام پر اجمالی ذکر کرنا اور پھر کچھ مخصوص انبیاء علیہم السلام کا نام لے کر حکمت کی صفت کو ذکر کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔ہمارا مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جن انبیاء علیہم السلام کے نام لے کر صفت حکمت ذکر فرمائی اور پھر ایک مقام پر جس آیت کریمہ میں انبیاء علیہم السلام سے میثاق لینے کا ذکر کیا گیا تو وہاں پر حکمت کی صفت کو عمومی ذکر کیا گیا ۔ قرآن کریم کے عمومی اسلوب یعنی عام کے بعد خاص کا کیا گیا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۚ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ﴾[4]

یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ آج ہم نے تمہیں کتاب و حکمت و دانش سے نوازا ہے' کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس' اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے' تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو' اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو۔" انہوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں' اللہ نے فرمایا۔ اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

---

۱ ۔ آل عمران: ۸۴/۳

۲ ۔ (شاہ عبدالعزیز شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی کے بڑے فرزند تھے، نام عبدالعزیز اور لقب سراج الہند تھا،۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھجری /۱۰ اکتوبر ۱۷۴۶ء کو پیدا ہوئے،ان کی مشہور تصانیف میں تحفہ اثناء عشریہ، عجالہ نافعہ، بستان المحدثین، فتاوی عبدالعزیز، تفسیر فتح العزیز شامل ہیں، ان کی فارسی میں یہ تفسیر جس کی دو اول کی اور دو آخر کی جلدیں موجود ہیں، تفسیر کے مقدمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب کے ایک شاگرد شیخ مصدق الدین عبداللہ تھے، جن کی تحریک پر یہ تفسیر لکھی گئی اور ان ہی کو شاہ صاحب نے اس کا املاء کرایا تھا اور یہ سلسلہ ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء میں مکمل ہوا، شاہ صاحب کا وصال اسّی برس کی عمر میں ۹ شوال ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ کو یک شنبہ (اتور) کے روز وفات پائی)

۳ ۔ شاہ عبدالعزیز، محدث دہلوی، فتح العزیز (تفسیر عزیزی)، (لاہور، مطبع محمدی، ۱۸۷۰ء)، ج۱، ص ۳۴۷

۴ ۔ آل عمران: ۸۱/۳

امام رازی لکھتے ہیں کہ (الكتاب هو المنزل المقروء والحكمة هي الوحي الوارد بالتكاليف المفصلة التي لم يشتمل الكتاب عليها)[1] تمام انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا گیا ان کو حکمت اس طرح عطا کی گئی کہ کتاب الٰہی کے علاوہ باقی ماندہ جن احکام کا ان کو اور ان کی امتوں کو مکلّف کیا گیا وہ سب حکمت کے دائرے میں آتے ہیں، لہٰذا یہاں کتاب سے مراد تو وہ ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے لیکن حکمت سے مراد معاشرتی زندگی کے تمام احکامات اور ان کی سمجھ بوجھ مراد ہے۔

علامہ نسفی لکھتے ہیں کہ (لَمَا آتَيْتُكُم) میں ما مصدریہ ہو تو معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی آمد اور بعثت سے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام کو کتاب اور حکمت جیسی خصوصیات عطا کر دی گئی تھیں اور ان صفات اور صلاحیتوں کے عطا کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے عہد لیا تاکہ کسی قسم کا کوئی ابہام اور اعتراض اس طرح باقی نہ رہے کہ آخری نبی کے لیے کوئی ماحول، اسباب اور آلات اور قوت نہیں ہے، بس حکمت سے یہاں یہی مراد ہے کہ حکمت جیسی خصوصیت ذکر کرنے اور حکمت عطا کرنے کے بعد ہی عہد لیا گیا۔ اور لام تعلیلیہ ہو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے پختہ عہد لیا کہ تم رسول پر ضرور ایمان لانا اور انکی ضرور مدد کرنا اس لیے کہ میں نے تمہیں حکمت دی ہے۔[2]

اس کے ساتھ اس شبہ کا ازالہ بھی مقصود ہے کہ حکمت و دانائی تو تمام انبیاء علیہم السلام کو عطاء کی گئی مگر اس کے ساتھ کتاب تو ہر نبی کو عطا نہیں کی گئی اس شبہ کا ازالہ غلام رسول سعیدی اس طرح کرتے ہیں:

> "اگر یہ شبہ ہو کہ اس آیت میں ان انبیاء علیہم السلام سے میثاق لینے کا ذکر ہے جن پر کتاب نازل کی گئی ہے اور وہ صرف تین سو تیرہ رسول ہیں' اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام نبیوں سے یہ میثاق لیا گیا ہے' اس کا جواب یہ ہے جن نبیوں پر کتاب نازل نہیں کی گئی وہ بھی ان نبیوں کے حکم میں ہیں جن پر کتاب نازل کی گئی ہے کیونکہ انکو نبوت اور حکمت دی گئی ہے' نیز جن انبیاء علیہم السلام کو کتاب نہیں دی گئی ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ سابق نبی کی کتاب پر عمل کریں' نیز اس آیت میں کتاب اور حکمت سے مراد دین ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کا دین واحد ہے اور توحید' نبوت' تقدیر' قیامت' مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے' حشر و نشر' حساب و کتاب اور جزاء و سزا پر ایمان رکھنے میں تمام نبی ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ البتہ شریعت ہر نبی کی الگ الگ ہے۔"[3]

انبیاء علیہم السلام کے لیے حکمت کی صفت قرآن کریم میں اکثر مقامات پر الکتاب کے متصل بعد مذکور ہوئی ہے۔ اسی لیے مولانا اکرم اعوان[4] لکھتے ہیں کہ جہاں بھی حکمت کی صفت کتاب سے ساتھ آئی اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں نہ صرف آیات بلکہ معانی بھی اسی پاک ذات کی طرف سے ہیں اور یہ معانی اور مفاہیم بھی انبیاء کرام علیہم السلام کو سکھائے جاتے ہیں، کتاب کے ساتھ متصل حکمت کا یہی معنی ہے۔[5]

۱۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۳۵/۸

۲۔ النسفی، مدارک التنزیل، ۲۶۹/۱

۳۔ سعیدی، تبیان القرآن، ج ۳، ص ۹۱

۴۔ (امیر محمد اکرم اعوان مفسر قرآن اور مذہبی پیشوا ہیں جو تنظیم الاخوان کے امیر ہیں۔ شہر چکوال میں ۳۱ دسمبر ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے اور سلسلہ تصوف میں سلسلہ نقشبدیہ اویسیہ کے ساتھ تعلق ہے ان کے مرشد اللہ یار خان ہیں، اکرام اعوان ۷ دسمبر ۲۰۱۷ کو راولپنڈی میں فوت ہوئے۔) (اردو ویکیپیڈیا، ۵ ستمبر، ۲۰۲۳)

۵۔ اعوان، محمد اکرام، **اسرار التنزیل** (لاہور، ادارہ نقشبندیہ اویسیہ، ۲۰۱۸ء) ۳۲/۴

حضرت داؤد علیہ السلام اور علم حکمت

﴿فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾[1]

پھر انھوں نے اللہ کے حکم سے ان کو شکست دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اور اللہ نے داؤد کو بادشاہت اور دانائی عطا کی اور جن چیزوں کا چاہا علم بخشا، اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا رہے تو زمین فساد سے بھر جائے۔ مگر اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

امام ابن کثیرؒ کے مطابق یہاں حکمت سے مراد (أي: النُّبُوَّةُ)[2] ہے یعنی جو سلطنت اور حکومت حضرت طالوت کے تصرف میں تھی وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا کر دی گئی، یہاں حکمت سے آپ علیہ السلام کو نبوت عطا کیا جانا مراد ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو شمعویل علیہ السلام کے بعد نبوت عطا فرما کر ان خصوصی علوم سے بھی مشرف فرمایا جو آپ علیہ السلام کی حکومت اور آپ کی امت کے لیے ضروری اور خاص تھے۔

امام رازیؒ لکھتے ہیں:

"الحكمة هي وضع الأمور مواضعها على الصواب والصلاح، وكمال هذا المعنى إنما يحصل بالنبوة، فلا يبعد أن يكون المراد بالحكمة هاهنا النبوة"[3]

حضرت داؤد علیہ السلام کو حکومت کے معاملات میں صحیح اور درست اور عدل کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی گئی اور یہ صلاحیت نبوت ہی کی وجہ سے ملی اس طرح یہاں حکمت سے مراد آپ علیہ السلام کی نبوت ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں سولہ مقامات پر کیا گیا ہے[4]، آپ علیہ السلام کے وصفت حکمت کے بارے میں علامہ ابن کثیر مزید وضاحت میں لکھتے ہیں:

"جمع الله له بين الملك والنبوة بين خير الدنيا والآخرة"[5]

آپ علیہ السلام پہلے نبی تھے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادشاہت اور نبوت کو دنیا اور آخرت میں جمع فرمایا

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں پہلے نبی حضرت داؤد علیہ السلام ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں

﴿وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ﴾[6]

داؤد نے جالوت کو اور دی داؤد کو اللہ نے سلطنت اور حکمت اور سکھایا ان کو جو چاہا

۱۔ البقرہ: ۲۵۱/۲

۲۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۹۶/۶

۳۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۵۱۷/۶

۴۔ سیوہاروی، محمد حفظ الرحمٰن، قصص القرآن (کراچی: دار الاشاعت، ۲۰۰۲ء)، ۴۷۲/۲

۵۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ (بیروت: دار إحیاء التراث العربی، ۱۴۰۸ھ)، ۱۲/۲

۶۔ البقرہ: ۲۵۱/۲

یعنی حکومت اور حکمت عملی کو جمع فرمایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حکمت عطا کیے جانے کا معنی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو علم کے ساتھ عمل کی قوت اور صلاحیت بھی عطا فرمائی اور آیت کریمہ میں﴿ قَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ﴾ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حق اور باطل کے اس حیران کن معرکہ میں ایک طرف قلیل لوگ تھے اور دوسری طرف کثیر لوگ، تو قلّت اور کثرت میں قلّت نے کثرت کو شکست فاش دی۔ پھر داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا اور آپ علیہ السلام کا حکمت اور دانائی اور تجربہ سے اس کا قتل کرنا یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ حکمت کی دلیل ہے کہ ایک طرف تجربہ کار جنگجو اور جوان لڑنے والے تھے اور ان کے پاس بے شمار ہتھیار اور جنگی حکمت عملی تھی لیکن دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے نبی نہ ہی جنگ وجدال میں حصہ لینے والے اور نہ ہی ہتھیاروں سے لیس تھے پھر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو دانائی عطا فرمائی اور آپ نے اس سے پہلے کسی جنگ میں حصہ نہ لیتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جانے والے حکمت کے تحت جالوت کو قتل کیا۔

اس پر مزید انعام کے طور پر یہ فرمایا کہ﴿ عَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ﴾ آپ علیہ السلام کو حکمت کے خزانے عطا فرمانے کے بعد اپنی کتاب زبور عطا فرمائی ۔حکومت کا منصب عطا فرمانے اور اس کو سنبھالنے کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو حکمت کا علم عطا فرمایا اس لیے کہ وہ حکمت کا علم اسی کو عطا فرماتا ہے جس کے اندر اس خیر کثیر کو سنبھالنے اور اس کو کماحقہ استعمال کرنے کی طاقت وصلاحیت ہو۔[1]

آیت کریمہ میں پہلے بادشاہی عطا کرنے کا ذکر ہے اور پھر حکمت کی صفت ذکر کی گئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے درجات اور مراتب اسی طرح بیان کر رہا ہے جس ترتیب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ترقی عطا فرمائی یعنی عام سے خاص کی طرف ترقی عطا فرمائی پہلے حکومت اور اس پر مزید انعام کہ حکومت چلانے کا طور طریقہ بھی خود سکھایا۔[2]

حفظ الرحمٰن کے مطابق بنی اسرائیل میں اس سے پہلے نبی کے لیے حاکم بننا اور حکومت کرنا نہ صرف ناممکن تھا بلکہ اس سے پہلے ایسی کوئی مثال اور رسم نہ گزری تھی کہ ایک نبی اپنے وقت کا حاکم اور بادشاہ بھی ہو تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں خلاف رسم آپ علیہ السلام میں نبوت اور خلافت جمع فرما دی اس لیے حکمت کا بھی یہی تقاضا تھا کہ ان کو ایسے لقب سے پکارا جائے جو ان کے شایان شان ہو اس لیے ان کو اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کے لقب سے مخاطب فرمایا۔[3]

قرآن کریم میں آپ علیہ السلام کی ایک اور صفت

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾[4]

جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو، اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو قوت والا، رجوع کرنے والا تھا۔

۱۔ دیکھیے: ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۱۱۷/۴، مزید دیکھیں: اصلاحی، تدبر قرآن، ۱۳۹/۳، عثمانی، تفسیر عثمانی، ص ۳۸۸

۲۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۵۱۷/۶

۳۔ سیوہاروی، قصص القرآن ۴۷۴/۲

۴۔ ص: ۱۷/۳۸

بیان ہوئی ہے جس کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ وہ ہاتھوں والے تھے لیکن عربی میں اس سے مراد طاقت اور قوت کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا جاتا ہے، امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ آپ علیہ السلام بڑی قوت اور طاقت کے مالک تھے، جسمانی طاقت میں بھی بے مثال اس طرح تھے کہ جالوت کو اکیلے حکمت و دانائی سے قتل کیا حالانکہ جالوت ایک مشہور جنگجو اور بہادر تھا، اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام بکریاں چرا رہے تھے اور اس حالت میں بھی انہوں نے تجربات اور طاقت کی مدد سے جالوت کو قتل کر ڈالا، آپ کے پاس فوجی اور سیاسی قوت بھی تھی، اخلاقی اور فقیرانہ صلاحیت سے بھی آپ علیہ السلام مزین تھے۔

علامہ بغوی کے نزدیک حکمت سے مراد یہ ہے کہ آپ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ہدایت کی طرف رغبت دلاتے اور اجتماعی طور پر معاشرے کے مسائل کا بھی حل فرماتے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو حکمت کا علم عطا فرمایا۔[1] اسی حکمت کی وضاحت دوسرے مقام پر اس طرح فرمائی گئی

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾[2]

اور قوت دی ہم نے اس کی سلطنت کو اور دی اس کو تدبیر اور فیصلہ کرنا بات کا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی صفت حکمت کو تکرار کے ساتھ بیان کیا گیا جس کا مدعا یہ ہے کہ ایک تو حکمت سے آپ کا وصف نبوت مراد ہے اور دوسرا یہ کہ آپ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جس منصب پر فائز فرمایا، آپ علیہ السلام نے کبھی بھی اس منصب میں کوتاہی نہیں کی اور کج روی اختیار نہیں فرمائی، بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے تورات موجود تھی لیکن حالات اور واقعات کے تغیر کے ساتھ آپ علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی گئی اور آپ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب تورات کے احکام، اس کے قوانین اور اصول کی وضاحت کرنے والی تھی، اس طرح حکمت سے مراد یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو از سر نو زندہ کیا، بنی اسرائیل جو عرصہ دراز سے راہ راست سے بھٹک گئے تھے آپ علیہ السلام کی حکمت کی وجہ سے راہ راست پر آگئے اور ان کو پھر سے معرفت الٰہی نصیب ہو گئی۔[3]

حمید الدین فراہی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"حکمت سے مراد یہاں دو ٹوک بات کرنا حق کے مطابق فیصلہ کرنے کی قوت کا حاصل ہونا ہے۔ جہاں حکمت ہو گی وہاں دو ٹوک حق پر بات کی جائے گی۔"[4]

قاضی ثناء اللہ لکھتے ہیں کہ حکمت سے مراد یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کو تقریر و خطابت میں کمال حاصل تھا، جب آپ وعظ فرماتے تو سننے والے ہر فقرے اور ہر قول کو اچھے اور بہترین انداز میں سن سکتے تھے، آپ علیہ السلام کے کلام میں بھرپور لطافت اور فصاحت تھی[5]، آپ علیہ السلام کو عطا کی جانے والی کتاب زبور میں اللہ تعالیٰ کی حمد اشعار کی

---

۱ ۔ البغوی، معالم التنزیل، ۳۳۶/۱

۲ ۔ صٓ: ۲۰/۳۸

۳ ۔ دیکھیے: الازہری، ضیاء القرآن، ۲۲۴/۵، مودودی، تفہیم القرآن، ۲۳۱/۶

۴ ۔ الفراہی، حمید الدین، حکمت قرآن، ص ۱۳

۵ ۔ پانی پتی، تفسیر مظہری، ۸۸/۵

صورت میں تھی، آپ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسا لہجہ اور کلام کرنے کا ایسا انداز اور اسلوب عطا کیا گیا تھا کہ جب آپ علیہ السلام زبور کی تلاوت فرماتے تو انسان اور جنوں میں وجد طاری ہو جاتا حتیٰ کہ پرندے میں بھی وجد میں آجاتے تھے۔[1]

حضرت داؤد علیہ السلام کی صفت حکمت کے متعلق قطب شہید لکھتے ہیں:

"صناعة الزردوعدة الحرب مما يفصله القرآن"[2]

اللہ تعالیٰ نے ان کو زرہ اور اس کے علاوہ جنگ کی تیاری کے لیے سارا سامان تیار کرنے کی بھی مہارت دی تھی۔

اس لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّن بَأْسِكُمْ ۖ فَهَلْ أَنتُمْ شَاكِرُونَ﴾[3]

اور ہم نے اس کو تمہارے لیے ایک خاص جنگی لباس کی صنعت سکھائی تا کہ وہ تم کو جنگ میں محفوظ رکھے تو کیا تم بھی اسی طرح شکر کرنے والے بنتے ہو!

ایک دوسرے مقام پر

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ ۖ وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ﴾[4]

اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے بڑی نعمت دی۔ اے پہاڑو، تم بھی اس کے ساتھ تسبیح میں شرکت کرو۔ اور اسی طرح پرندوں کو حکم دیا۔ اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام ان کو زرہ بنانے کو مکمل اور کامل تجربہ تھا اور حرب کا سارا سامان وہ خود اپنے ہاتھوں سے تیار فرماتے تھے۔[5] اس کو علاوہ لوہے کو پگھلا کر اس سے مختلف اشیاء تیار فرماتے، آپ علیہ السلام نے لوہے کی باریک کڑیاں بنا کر اس فن کو بام عروج تک پہنچایا، آپ لوہے کی ایسی کڑیاں بناتے کہ گویا یہ کپڑے کی بنائی گئی ہیں ان کو پہن لینا انتہائی آسان ہوتا اور یہ حفاظت کے لیے کام دیتی تھی۔[6]

حضرت سلیمان علیہ السلام اور علم حکمت کے مظاہر

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ ۚ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُودَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۚ وَكُنَّا فَاعِلِينَ﴾[7]

۱۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۳۴/۴

۲۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۲۵۲/۱

۳۔ الانبیاء: ۸۰/۲۱

۴۔ سبا: ۱۰/۳۴

۵۔ الحقانی، تفسیر حقانی، ۸۸/۳

۶۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۳۳/۷

۷۔ الانبیاء: ۷۹/۲۱

دوآدمی حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ لائے، ان میں سے ایک بکریوں کا مالک تھااور دوسرا آدمی کسان تھا، کسان نے اعتراض کیا کہ اس شخص کے ریوڑ نے میرے کھیت کو تباہ کر دیا ہے، آپ علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا تمہارے کھیت کا نقصان اس کے ریوڑ جتنی قیمت کے برابر ہے، لہٰذا جس کا کھیت تباہ ہوااس کو سارا ریوڑ ملنا چاہیے، یہ دونوں آدمی باہر نکلے تو حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور ان کو اس واقعہ کی اطلاع دی، تو آپ علیہ السلام نے اپنے والد کی اجازت سے یہ فیصلہ دیا کہ آپ کھیت کے مالک کو بکریاں دیں جب کہ کھیت کی زمین بکری والے کو دے دیں تاکہ وہ فصل کاشت کر کے کھیت کو اسی حالت میں لے آئے جیسا کہ کھیت تباہ ہونے سے پہلے تھا پھر یہ کھیت واپس اسی مالک کو دے دیں اور بکریاں اِس کے اپنے مالک کو واپس کر دیں، حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔[1]

حضرت سلیمان علیہ السلام کا بکریوں کے بارے میں فیصلہ وحی کے ذریعے نہیں تھا بلکہ آپ علیہ السلام کی اجتہادی صلاحیت کا نتیجہ تھا، قرآن کریم نے آپ علیہ السلام کے وصف میں ( ) فرمایا گیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ علیہ السلام پہلے سے موجود احکامات کی تشریح وتوضیح کرتے تھے مگر آپ علیہ السلام کوئی ایسی نئی شریعت اور احکامات لے کر نہیں آئے جو سابقہ شریعت کو منسوخ کر دے۔[2]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ﴿فَفَهَّمْنَاهَا﴾ کا وصف صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہے جب کہ اسی آیت میں حکم اور علم اور ﴿يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ﴾ کے اوصاف دونوں کے لیے یعنی حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے لیے مشترک ہیں۔ یہ اوصاف اس بات کی دلیل ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام فیصلہ کرنے میں اور دانائی اور حکمت میں منفرد ہیں۔

اس آیت کریمہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے وصف فہم کو وصف حکم اور علم پر فوقیت حاصل ہے۔اس آیت کی تفسیر میں امام ماتریدیؒ لکھتے ہیں:

> ” أن المجتهد إذا حكم وأصاب الحكم أنه إنما أصاب بتفهيم الله إياه وبتوفيقه؛ حيث أخبر أنه قد آتاهما جميعًا العلم، ثم خص سليمان بالتفهيم، والتفهيم هو فعل الله؛ حيث أضاف ذلك إلى نفسه.“
>
> مجتہد جب احکام میں اجتہاد کر کے کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی گئی توفیق اور فہم وفراست کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علم کے وصف کو دونوں کے لیے مشترک رکھا جب کہ (فہم) تفہیم کے لیے حضرت سلیمان کو منفرد خصوصیت سے نوازا گیا۔اور تفہیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی عنایت ہوتی ہے اور اس پر مزید کہ فہم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا (ہم نے فہم عطا کیا)۔

---

۱ ۔ ابو حیان اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں بھی اس واقعے کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکمت کے مظاہر میں لکھا ہے۔ (ابو حیان، البحر المحیط، ۳۰۶/۶)، مزید دیکھیں: ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۲۳۶/۵

۲ ۔ الشنقیطی، اضواالبیان، ۳۱۳/۳

امام آلوسیؒ کے مطابق آپ علیہ السلام کی حکمت، تفکر وتدبر اور آپ کی اجتہادی قوت کا نتیجہ تھا۔[1] اسی طرح سورۃ النمل میں بھی آپ علیہ السلام کی حکمت اور حکمت عملی کے مظاہر موجود ہیں۔ ہدہد نے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس خبر لائی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے اختیار کے باوجود ہدہد کو سزا نہ دی۔ جب کہ اس نے معذرت پیش کی اس لیے کہ ہدہد کی صداقت عذر بن گیا تھا۔ لیکن سزا نہ دینا بھی آپ کی حکمت کے مظاہر میں سے ہے۔ ہدہد اس نے اس امر کی خبر دی وہ جن کے پاس میں گیا تھا وہ جہاد کا تقاضا کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی جہاد سے محبت کرتے تھے۔ آپ علیہ السلام نے ہدہد کی اس خبر کی تحقیق کے لیے وہ فرمایا جس کو قرآن مجید میں اس طرح ذکر کیا گیا:

﴿قَالَ سَنَنْظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْكَاذِبِينَ. اذْهَبْ بِكِتَابِي هَذَا فَأَلْقِهِ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ﴾[2]

سلیمان نے کہا ہم اب دیکھتے ہیں تو نے سچ کہا یا تو جھوٹا ہے۔ لے جا میرا یہ خط اور ڈال دے ان کی طرف پھر ان کے پاس سے ہٹ آ پھر دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

امام قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"أَمَرَهُ بِالتَّوَلِّي حُسْن أَدَب لِيَتَنَحَّى حَسْب مَا يَتَأَدَّب بِهِ مَعَ الْمُلُوك"[3]

یہ امر حسن ادب کے طور پر تھا تاکہ وہ اس طرح الگ ہو جائے جس طرح بادشاہوں کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے

یعنی اس کا معنی ہے کہ تو ان کے قریب ہی رہنا تاکہ تو ان کے جواب کو دیکھے۔ اس طرح آپ علیہ السلام کو عطا کردہ حکمت کا نتیجہ تھا کہ آپ علیہ السلام نے ہدہد کو خط دے کر بھیجا اور ساتھ ہی بادشاہوں کے سامنے ادب کا معاملہ بھی سکھایا کہ کس طرح ادب واحترام سے حاکم وقت کے پاس جایا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ علیہ السلام کی حکمت عملی کے مظاہر میں سے ہے۔ اسی سورت میں ارشاد ربانی ہے:

﴿قَالَ الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَن يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِندَهُ قَالَ هَٰذَا مِن فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ ۖ وَمَن شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ﴾[4]

(پھر) ایک ایسے شخص نے عرض کیا جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ علم تھا کہ میں اسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ کی نگاہ آپ کی طرف پلٹے (یعنی پلک جھپکنے سے بھی پہلے)، پھر جب (سلیمان (علیہ السلام) نے) اس (تخت) کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا (تو) کہا: یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا میں شکر گزاری کرتا ہوں یا ناشکری، اور جس نے (اللہ کا) شکر

۱۔ الآلوسی، روح المعانی، ۹/۷۳

۲۔ النمل: ۲۷/۲۷

۳۔ القرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۱۸۸/۳

۴۔ النمل: ۲۷/۴۰

ادا کیا سو وہ محض اپنی ہی ذات کے فائدہ کے لیے شکر مندی کرتا ہے اور جس نے ناشکری کی تو بیشک میرا رب بے نیاز، کرم فرمانے والا ہے

اس آیت کریمہ میں ایک حکمت یہ بھی پوشیدہ ہے کہ جب بھی قومی سطح پر کوئی اہم نوعیت کی ذمہ داری سونپنے کا مرحلہ درپیش ہو تو محض قوت اور جسمانی طاقت کو ہی فوقیت نہیں دی جانی چاہیے بلکہ اس کے لیے علم کا ہونا بھی لازمی ہونا چاہیے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پہلے زمانے میں جسمانی قوت بھی ایک اہم میرٹ تھا جسے اب صرف جسمانی صحت سے بدل دیا گیا تاہم اگرچہ ہر دو افراد جن میں سے ایک کے پاس جسمانی قوت ہو اور دوسرے کے پاس علمی قوت تو جب وہ دونوں ہی قومی سطح پر اس اہم ذمہ داری کو نبھانے کی مطلوبہ اہلیت رکھتے ہوں تو جو شخص صاحب علم ہو گا وہ اس ذمہ داری کی بطریق احسن نبھائے گا اور اسی لیے اس آیت کریمہ میں بھی اس اہم ذمہ داری کو سونپنے کے لیے علم کو ہی بنیاد بنایا گیا۔[1]

حضرت ایوب علیہ السلام اور علم حکمت

حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم کی چار سورتوں، سورۃ النساء، الانعام، الانبیاء اور سورۃ ص میں آیا ہے۔ قرآن کریم میں آپ علیہ السلام حکمت کا عطا کیا جانا صبر اور شکر اور احسان کے ساتھ مستلزم ہے۔ اسی وجہ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾[2]

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عطا کیے، اور ہم نے سب کو ہدایت دی، اور اس سے پہلے نوح کو ہدایت دی اور ان کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت دی) اور ہم اسی طرح نیکی کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں۔

ان سب انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جسمانی قوت اور ذہنی بصیرت دونوں اعلیٰ درجہ کی حاصل تھی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب فرما کر اپنا پیغام دے کر امتوں کی طرف مبعوث فرمایا۔[3]

سورۃ ص میں آپ علیہ السلام کی صفات اور آپ علیہ السلام کے حالات کو اولوا الباب کے لیے نصیحت کہا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾[4]

اور ہم نے ان کو ان کے اہل و عیال اور ان کے ساتھ ان کے برابر (مزید اہل و عیال) عطا کر دیئے، ہماری طرف سے خصوصی رحمت کے طور پر، اور دانش مندوں کے لیے نصیحت کے طور پر۔

مفسر قرآن عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

۱۔ دریاآبادی، تفسیر ماجدی، ۲۴۳/۶

۲۔ الانعام: ۸۴/۶

۳۔ وحیدالدین خان، تذکیر القرآن، ص ۸۳۴

۴۔ ص: ۴۳/۳۸

”وہ نصیحت یہ ہے کہ ہر ایماندار اور صاحب عقل کو چاہیے کہ وہ خوشحالی کے دور میں اللہ کا شکر ادا کرے اور اگر ابتلا میں پڑ جائے اور اس پر تنگی ترشی کا دور آئے تو سیدنا ایوب علیہ السلام کی طرح صبر کا مظاہرہ کرے۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ جس طرح سیدنا ایوب علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کی بارش فرمائی تھی۔ اللہ تعالیٰ اسے بھی اپنے ایسے ہی انعامات سے نواز دے۔“[1]

اس سے واضح ہوا کہ اگر آپ علیہ السلام کی سیرت سے اہل عقل و دانش کو فلاح اور نصیحت اور دنیوی واخروی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے تو خود آپ علیہ السلام کے اندر کتنی عقل و دانش، کمال تدبر و تفکر اور حکمت و دانائی ہو گی۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ صاحب تدبر ہی حضرت ایوب علیہ السلام کے اس قرآنی قصہ سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے وفادار بندے اس کے امتحان پر پورا اُترتے ہیں اور ان کو ہی خیر کثیر اور کامیابی ملتی ہے جو اس کے امتحان میں استقلال اختیار کرتے ہیں۔[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ ۗ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾[3]

اور آپ اپنے ہاتھ تنکوں کی ایک جھاڑو لے کر ماریں اور اپنی قسم نہ توڑیں، بیشک ہم نے ان کو صابر پایا، وہ کیا خوب بندے ہیں، بیشک وہ بہت رجوع کرنے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ (إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا)[4] سے واضح ہوتا ہے کہ اس قسم پورا کرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو صابر و شاکر پایا اور پر ان کی خوب تعریف اور توصیف فرمائی اسی سے آپ علیہ السلام کو عطا کردہ تدبیر اور حکمت کا نتیجہ واضح ہوتا ہے۔[5]

حضرت ایوب علیہ السلام کے حالات زندگی سے ہمیں صبر ایوبی کا سبق ملتا ہے۔ اس لیے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی حکمت کا خاصا شکر اور صبر ہے۔ شکر اللہ تعالیٰ کے انعام کے ہر مرحلہ پر اور صبر ہر مشکل اور مصیبت میں نبوت کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ہر نبی کے حالات زندگی میں صبر و شکر کا عنصر بدرجہ اتم ملتا ہے اور ہر قدم پر شکر ادا کرنے کا درس ملتا ہے مگر ہر مشکل میں صبر و برداشت اور یاد خداوندی کا عنصر حضرت ایوب علیہ السلام کے حالات زندگی کا خاصا ہے اور آپ علیہ السلام کے حالات زندگی سے یہ تلقین ملتی ہے کہ تکلیف کس قدر شدید ہی کیوں نہ ہو مشکل کتنی کڑی اور مصیبت کتنی سنگین ہو، انسان کو صبر سے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اور اس مصیبت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے ہوئے برداشت کرنا چاہیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور علم حکمت

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

۱۔ کیلانی، عبدالرحمٰن، تیسیر القرآن (لاہور، مکتبہ السلام، ۱۴۳۲ھ)، ۲۲۷/۳

۲۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۲۸۸/۵

۳۔ ص: ۴۴/۳۸

۴۔ ص: ۴۴/۳۸

۵۔ رشید رضا، تفسیر القرآن الحکیم، ۲۲۶/۱۲، مزید وضاحت کے لیے دیکھیں: مودودی، تفہیم القرآن، ۱۴۵/۵

﴿وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَى آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾[1]

اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی کرنے والوں کو

اس آیت کی تفسیر میں امام طبریؒ مجاہدؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"العقل والعلم قبل النبوة"[2]

حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت سے قبل حکمت اور علم عطا کر دیا گیا تھا

جب کہ امام جوزیؒ کے مطابق (حُكْمًا) سے مراد فقہ، عمل اور نبوت ہے۔ امام جوزی نے زجاج کے حوالے سے لکھا ہے کہ حکیم کا اطلاق اس عالم پر ہوتا ہے جو اپنے علم کو کماحقہ استعمال کرے اور اس سے جہل اور نادانی کا صدور ممتنع ہو۔ اس اعتبار سے حضرت یوسف علیہ السلام پر حکمت اور حکیم کا اطلاق ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام کو حکمت اور دانش مندی کا علم اور اس پر عمل کا صحیح طریقہ عطا کر دیا گیا تھا۔[3]۔ علامہ قرطبیؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر مراد یہ ہو کہ آپ علیہ السلام کو بچپن میں ہی نبوت عطا کر دی گئی تھی تو حکمت سے مراد یہ ہو گا کہ آپ علیہ السلام کے علم اور فہم میں ترقی عطا کی گئی۔[4]۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا کردہ حکمت کا اطلاق حکمت نظریہ اور حکمت عملیہ دونوں پر ہوتا ہے۔ امام رازیؒ لکھتے ہیں:

"وطريقة يوسف عليه السلام هو الأول، لأنه صبر على البلاء والمحنة ففتح الله عليه أبواب المكاشفات، فلهذا السبب قال: آتيناه حكما وعلما"[5]

اس مقام پر حضرت یوسف علیہ السلام کا پہلا طریقہ (حکمت نظریہ) کا تھا اس لیے آپ علیہ السلام نے مشکلوں اور مصیبتوں کو صبر اور استقامت اور مخلوق خدا پر احسان کرتے ہوئے وقت گزارا پھر اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام پر آسانیوں اور سہولتوں کے دروازے کھول دیئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو وہاں کی تاریخ، روایات، لوگوں کا رہن سہن، تہذیب و تمدن، کلام وغیرہ کا اُسلوب اور انداز تکلم سکھا دیا تھا۔ پھر آپ علیہ السلام کو فیصلہ کرنے کی قوت بھی عطا کی گئی تھی۔ ایک اجنبی ملک میں بغیر کسی رشتے ناطے اور قربت اور کسی کی پشت پنائی کے بغیر ہی تھوڑے ہی عرصہ میں وہاں پر

۱۔ یوسف: ۲۲/۱۲

۲۔ الجصاص، احمد بن علی، أحکام القرآن (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۵ھ)، ۵۱۲/۳

۳۔ ابن الجوزی، زاد المسیر، ۴۲۵/۲

۴۔ القرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۱۴۲/۹

۵۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۴۳۷/۱۸

اپنا سکہ جمالینا اور لوگوں کے دلوں میں آپ علیہ السلام کی عظمت اور رفعت کا پیدا ہو جانا یہ اللہ تعالیٰ کی آپ علیہ السلام کو عطا کردہ حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔[1]

آپ علیہ السلام کی حکمت سے مراد یہ بھی ہے کہ آپ علیہ السلام جب عقلی اور جسمانی اعتبار سے حد کمال کو پہنچ گئے تو تب اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو حکمت سے نوازا اور مستقبل میں پیش آنے والے جملہ مسائل اور مصائب کو برداشت کرنے کے لیے نہ صرف آپ علیہ السلام کو تیار کیا گیا بلکہ ان کی مناسب حکمت عملی بھی آپ علیہ السلام کو عطا فرمائی گئی۔ اسی حکمت کا نتیجہ تھا کہ آپ علیہ السلام نے وقت اور حالات کے تقاضے کے مطابق درست فیصلے فرمائے۔ اس مقام پر حکمت سے یہی مراد ہے کہ آپ علیہ السلام کو خاص علم لدنی اور صحیح فکر اور فہم عطا فرمائی گئی[2]۔

دعوت دین میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حکمت عملی

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوتی حکمت علمی اس اعتبار سے اہم ہے کہ جب قید خانے میں آپ علیہ السلام کی ملاقات دو نوجوانوں کے ساتھ ہوئی اور انہوں نے اپنا خواب سنایا تو آپ علیہ السلام کو چونکہ حکمت عطا فرمائی گئی تھی اس لیے آپ علیہ السلام نے قید خانہ میں بھی دعوت دین کے عمل کو نہ سست روی کا شکار ہونے دیا اور نہ دعوت دین کو چھوڑا بلکہ آپ علیہ السلام اپنی مقصد بعثت کو بھی نہ بھولے۔ اگرچہ آپ علیہ السلام پر زور اور شدت کی مصیبت آئی ہوئی تھی مگر اس مقام پر بھی آپؑ اللہ تعالیٰ کی کلمہ حق اور دین کی دعوت کو نہ بھلایا۔ آپ علیہ السلام نے موقع کو غنیمت جان کر ان قیدیوں سے نرمی اور محبت کا برتاؤ فرمایا:

﴿يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ. مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾[3]

اے میرے قید خانہ کے دونوں ساتھیو! (بتاؤ) کیا الگ الگ بہت سے معبود بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے تم (حقیقت میں) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے ہو مگر چند ناموں کی جو خود تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (اپنے پاس سے) رکھ لئے ہیں، اللہ نے ان کی کوئی سند نہیں اتاری۔ حکم کا اختیار صرف اللہ کو ہے، اسی نے حکم فرمایا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا راستہ (درست دین) ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یوسف علیہ السلام کا انداز خطاب اور تبلیغ کے اندر حکمت علمی حیران کن ہے کہ سوال کرنے والے آپ علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھتے ہیں اور آپ علیہ السلام تعبیر بعد میں بتاتے ہیں پہلے ان کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، اس کی وحدانیت اور شرک سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اس ہدایت کے پیغام کے فوراً بعد آپ علیہ السلام ان کو خواب

۱۔ صدیقی، روح القرآن، ۴۲/۵

۲۔ رشید رضا، تفسیر المنار، ۴۵/۴

۳۔ یوسف: ۱۲/۳۹-۴۰

کی تعبیر بھی بتلاتے ہیں۔ اس سے آپ کی سلیقہ مندی، حکمت و دانش اور موقع و محل کی مناسبت کے ساتھ کلام کرنے کی حکمت سمجھ آتی ہے۔[1]

آپ علیہ السلام کی دعوت میں حکمت کا ایک انداز یہ بھی ہے جس کو قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے کہ جب آپ نے ساقی کو یہ بتایا کہ بادشاہ کو خواب کی تعبیر کرنے والے یعنی میرے بارے میں بتانا تو کچھ عرصہ تک تو اس کو یاد ہی نہ رہا۔ جب یاد آیا تب تک بہت عرصہ بیت چکا تھا۔ امام قرطبیؒ کے نزدیک سات یا نو سال بعد ساقی کو یاد آیا[2] اور جب وہ اتنی مدت کے بعد آپ علیہ السلام کے پاس گیا تو آپ علیہ السلام کا صبر واستقامت کا یہ عالم تھا کہ آپ علیہ السلام نے اس کو ملامت یا سرزنش نہیں کی اور نہ اس کو برا بھلا کہا، نہ جھڑک دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء ہونے والی علم و حکمت پر اس مقام پر بھی بخل سے کام نہ لیا بلکہ اسی وقت تفصیل سے خواب کی تعبیر بیان فرما دی۔ یہ آپ علیہ السلام کے تدبر اور آپ علیہ السلام کی حکمت عملی کی تصویر تھی۔[3]

حضرت ابراھیم علیہ السلام اور علم حکمت

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی بعثت سے پہلے آپ کی اُمت اور اس معاشرے میں سے قبل قبائلی نظام تھا اور ایک مستقل سیادت و قیادت کا فقدان تھا۔ مگر حضرت ابراھیم علیہ السلام کے وقت میں بادشاہت قائم ہو چکی تھی اور اس ضمن میں سلطنت میں کافی ترقی آچکی تھی۔ پوری قوم کی قوت کا مرکز و محود بادشاہ تھا اور وہی ان کے لیے مطلق العنان تھا تاہم وہ ایک قانون اور ضابطے کے بہر حال پابند تھے جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے کہ آپ علیہ السلام کو بت توڑنے پر سزا کا تعین، پھر آگ میں پھینکنے کا عزم وغیرہ وغیرہ۔[4]

دعوت دین میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کی حکمت

آپ علیہ السلام سے قبل دین حق کی تبلیغ میں انبیاء کو بت پرستوں کی طرف سے مزاحمت ہوتی تھی لیکن اب بتوں کے ساتھ ساتھ ایک صاحب قوت حکمران بھی اس مزاحمت پر اتر آئے تھے۔ اس لیے کہ ان کو اپنے تخت وتاج کا دفاع بھی کرنا تھا جب کہ انبیاء علیھم السلام ایسے جھوٹے تخت کو ختم کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

اب جہاں تہذیب و تمدن نے ترقی کر لی تھی وہاں دین کی تبلیغ اور دعوت کا کام مزید مشکل ہو گیا تھا۔ اس دور میں حضرت ابراھیم علیہ السلام جیسی ہستی کو حکمت دے کر مبعوث کیا گیا۔ آپ علیہ السلام کے دعوت دین کے اسلوب میں طرز استدلال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تہذیب و تمدن اور انسانی ذہن نے اتنی ترقی تو کر لی تھی کہ ان کے ساتھ دلیل و براہین سے بات کی جاسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے دلائل کا نیا اسلوب اختیار فرمایا اور دعوت دین میں حکمت کے ایسے موتی بکھیرے جو ترقی یافتہ معاشرے میں بھی مشعل راہ ہیں۔ آپ علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے چچا جو بت تراش تھے ان سے مخاطب ہوئے اور عرض کی:

۱۔ سعیدی، تبیان القرآن، ۱۳۳/۴

۲۔ القرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۷۳/۹

۳۔ پانی پتی، تفسیر مظہری، ۱۷۶/۷

۴۔ السیوہاروی، قصص القرآن، ص ۱۳۷

﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا . يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا . يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا . يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا﴾[1]

جب انہوں نے اپنے باپ (یعنی چچا آزر سے جس نے آپ کے والد تارخ کے انتقال کے بعد آپ کو پالا تھا) سے کہا: اے میرے باپ! تم ان (بتوں) کی پرستش کیوں کرتے ہو جو نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ تم سے کوئی (تکلیف دہ) چیز دور کر سکتے ہیں، اے میرے ابا! بیشک میرے پاس ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا آپ میری پیروی کیجیے میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا، اے میرے ابا! آپ شیطان کی پیروی نہ کریں، بیشک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے، اے میرے ابا! مجھے خطرہ ہے کہ آپ کو رحمٰن کی طرف سے عذاب پہنچے گا پس آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں گے۔

اس آیت کریمہ کے بعد جب اگلی آیت میں یہ بیان ہوا کہ جب آپ علیہ السلام کے والد نے آپ علیہ السلام کو سختی سے جھڑک دیا اور پتھروں سے ہلاک کرنے اور ہمیشہ کے لیے اپنے آپ سے دور کرنے کا عندیہ دے دیا تو آپ علیہ السلام نہ ان سے فضول بحث و مباحثہ کرتے ہیں اور نہ کسی قسم کا تکرار اور جھگڑا کرتے ہیں بلکہ آپ علیہ السلام حکمت اور دانائی سے ان سے الگ ہو جاتے ہیں۔ مقام غور ہے کہ ایک داعی اور مبلغ کے لیے یہ کتنا مشکل کام ہوتا ہے کہ جس نے پرورش کی وہ خود ہی دھمکی آمیز رویہ اختیار کرے تو پھر اپنی یا اپنوں کی ذات کو ترجیح دینے کے بجائے دعوت دین اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرنا حکیم کے ہی بس کا کام ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر مبلغ کا لیے مزید مشکل تب ہوتی ہے جب لوگ دین کی طرف راغب ہونے کے بجائے دھتکارنا شروع کر دیں۔[2]۔ اس سخت گیر کلام کے جواب پر بھی آپ نے بہت زیادہ صبر اور احترام کیا اور جواب میں فرمایا:

﴿قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا﴾[3]

ابراہیم نے کہا تجھے سلام ہو میں عنقریب اپنے رب سے تیرے لیے استغفار کروں گا، بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔

آپ علیہ السلام کی دعوت دین کے اندر یہ حکمت کی ابتدا ہو رہی تھی جب آپ علیہ السلام کی قوم وہی دقیانوسی جواب کہ ہم تو کچھ نہیں جانتے البتہ ہم اپنے آباء کی روش پر قائم ہیں۔ کہہ رہی تھی۔ تب اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو ایک عظیم صفت سے نواز دیا تھا جس کی بنا پر آپ علیہ السلام کے لیے بعد کے مراحل آسان سے آسان ہوتے چلے گئے اور آپ علیہ السلام کی استقامت مزید بڑھتی چلی گئی: ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ﴾[4]

۱۔ مریم: ۱۹/۴۲-۴۵

۲۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۹۵/۵

۳۔ مریم: ۱۹/۴۷

۴۔ الانبیاء: ۲۱/۵۱

اور بیشک ہم نے پہلے سے ہی ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کے (مرتبہ کے مطابق) فہم وہدایت دے رکھی تھی اور ہم ان (کی استعداد واہلیت) کو خوب جاننے والے تھے۔

یعنی آپ علیہ السلام وہ کام نہیں کریں گے جو قوم کے اندر حقیر اور بُرے سمجھے جاتے ہوں۔ رشد کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ آپ علیہ السلام کو کامل ہدایت عطا کر دی گئی اس لیے کہ آپ علیہ السلام راہ ہدایت کی طرف بلانے والے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی ہر وقت، ہر جگہ اور ہر مقام پر رہنمائی فرمائی اور ان امور کی طرف بھی رہنمائی فرمائی کہ جو ایک نبی کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوم کے اندر رہتے ہوئے پاکیزگی اور فضائل سے متصف زندگی گزارے اور دین کی دعوت کا کام کرے اور ایسا رویہ اپنائے جو دنیا میں لائق نمونہ اور آخرت میں لائق تحسین ہوں۔[1] قرآن کریم میں آپؑ کے وصف کو اس طرح ذکر کیا گیا:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ﴾[2]

بیشک تمہارے لیے ابراہیم (علیہ السلام) میں اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ (اقتداء) ہے۔

آپ علیہ السلام کو عطا کردہ حکمت کا نتیجہ تھا کہ آپ علیہ السلام تبلیغ کے ساتھ ساتھ دعائیں بھی کر رہے تھے۔ آپ علیہ السلام کی دعائیں بھی حکمت سے لبریز ہیں یعنی خشوع کے ساتھ اپنی، اور اپنی اولاد کی بخشش اور رزق کی کشادگی کے لیے دعائیں مانگتے رہے، جو آپ علیہ السلام کے نافرمان ہوئے ان کے لیے بھی غفران اور رحم کے طالب رہے۔ یہی آپ علیہ السلام کی حکمت، رحم دلی اور حلم کی دلیل ہے۔[3]

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی دعوت میں حکمت اور حکمت عملی کے مظاہر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب آپؑ قوم کے سب سے بڑے بت کو توڑتے ہیں تو آپ علیہ السلام نے حکمت سے یہ جان لیا تھا کہ یہی وقت دین کی تبلیغ کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اور یہی وقت کا صحیح استعمال ہے۔ پھر الفاظ کا صحیح طریقہ آپ علیہ السلام کی حکمت کو نمایاں کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ﴾[4]

آپ نے فرمایا: بلکہ یہ (کام) ان کے اس بڑے (بت) نے کیا ہو گا تو ان (بتوں) سے ہی پوچھو اگر وہ بول سکتے ہیں

بت توڑنے کے بعد آپ علیہ السلام نے مختصر اور جامع نصیحت فرمائی اور کہا کہ جب یہ دیوتا نفع اور نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتے تو معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟

آپ علیہ السلام کی تدبیر اور حکمت کہ قوم کے ساتھ میلہ میں شامل نہ ہونا اور پھر بتوں کو توڑنا اور بڑے بت کو سلامت رہنے دینا اور قوم کے سامنے آنے پر ان کو بڑے بت سے دریافت کرنے کی دعوت دینا۔ اس طرح

۱۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۱۵۱/۸

۲۔ الممتحنہ: ۴/۶۰

۳۔ رشید رضا، تفسیر المنار، ۳۹/۴

۴۔ الانبیاء: ۵۱/۲۱

مدلل اور جامع انداز میں ان پر اپنے باطل اور بودے عقائد کا پول کھولنا ایک خاص حکمت عملی کے ساتھ اپنی تدبیر کو آگے بڑھانا تھا۔ یہ آپ علیہ السلام کی حکمت و دانائی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔[1]

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی دعوت کے اندر حکمت، تدبیر کی ایک اور عمدہ مثال وہ ہے جب آپ علیہ السلام نے نمرود کو دعوت دین بلاخوف وخطر خود اس کے پاس جاکر دی:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ﴾[2]

(اے حبیب!) کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اس وجہ سے کہ اللہ نے اسے سلطنت دی تھی ابراہیم (علیہ السلام) سے (خود) اپنے رب (ہی) کے بارے میں جھگڑا کرنے لگا

اگرچہ نمرود کا اعتراض بودا اور کمزور تھا مگر حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ بحث میں نہ الجھا جائے اور اسے طول دینے کے بجائے ایسی برھان قاہرہ لائی جائے کہ کافر کے پاس اس کا جواب نہ ہو۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے پہلی دلیل پر بحث کو طول دینے کے بجائے دوسری دلیل پیش کی کہ میرا خدا تو وہ ہے جو ہر روز سورج کو مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب کرتا ہے۔ بس تم مغرب سے ہی نکال دو، یہ وہ دلیل اور قانون قدرت تھا جس پر نہ تو نمرود کا بس تھا اور نہ ہی وہ اس قسم کا دعویٰ کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ پس وہ حیرت زدہ ہو گیا۔[3]۔ مولانا اصلاحی آپ کے طرز استدلال کے بارے میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہاں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے خاص طور پر سورج کی تسخیر کا ذکر فرمایا جس کو نمرود کی نظر میں معبود اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے آپ کو اسی معبود اعظم کا مظہر بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔ بہترین استدلال اور لطیف ترین طنز کی یہ ایک نہایت خوب صورت مثال ہے۔''[4]

حضرت ابراھیم علیہ السلام کے حکمت کے مظاہر ایک اور وقت میں بھی ظاہر ہوتے ہیں جب آپ اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مکہ چھوڑ کر چلے گئے، ارشاد ہوا:

﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ﴾[5]

اے ہمارے رب! بیشک میں نے اپنی اولاد (اسماعیل (علیہ السلام)) کو (مکہ کی) بے آب و گیاہ وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسا دیا ہے، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم رکھیں پس تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ وہ شوق و محبت کے ساتھ ان کی طرف مائل رہیں اور انھیں (ہر طرح کے) پھلوں کا رزق عطا فرما، تاکہ وہ شکر بجالاتے رہیں۔

۱۔ دیکھیے: قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۵/۸۱، اصلاحی، تدبر قرآن، ۵/۱۷۷

۲۔ البقرہ: ۲/۲۵۸

۳۔ دیکھیے: مودودی، تفہیم القرآن، ۵/۲۳۱

۴۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۴/۲۸۴

۵۔ النسآء: ۴/۶۳

یہ آپ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جانے والی حکمت کا عملی ثبوت تھا کہ آپ علیہ السلام کے اس عمل ہی کی وجہ سے مکہ کی وادی میں آبادی کی بنیاد پڑی۔[۱] ارشاد ربانی ہے:

﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا﴾[۲]

یا جو خدا نے لوگوں کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کا حسد کرتے ہیں تو ہم نے خاندان ابراہیم کو کتاب اور دانائی عنایت فرمائی تھی اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔

اس آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت کے ساتھ ساتھ حکمت اور بادشاہت بھی عطا فرمائی۔ آپ علیہ السلام کے دشمن چاروں طرف طاقتور تھے۔ آپ علیہ السلام کی حکمت، علم اور نبوت سے حسد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو جو حکمت عطا فرمائی تھی اسی کی وجہ سے آپ علیہ السلام ہر میدان میں کامیاب ہوئے۔[۳] علامہ نسفی نے اس مقام پر الحکمت کا معنی (الموعظة والفقه)[۴] لکھا ہے یعنی آپ علیہ السلام کو وعظ ونصیحت میں کمال حاصل تھا اور آپ علیہ السلام دلائل وبراہین کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دیتے تھے۔

فقہ جعفریہ کے مستند مفسر عیاش السلمی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"و كل هؤلاء من الذرية التي بعضهامن بعض التي جعل فيهم البقية، و فيهم العاقبة و حفظ الميثاق، حتى تنقضي الدنيا، و للعلماء و بولاة الأمر الاستنباط للعلم و الهداية"[۵]

اللہ تعالیٰ نے حکمت کو حضرت ابراہیمؑ کے بعد بھی ان کے ذریت کے لیے باقی رکھا۔ ذریت میں سے وہ لوگ حکمت کی نعمت سے سرفراز ہوئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کے دین اور اللہ کی عہد ومیثاق کو پورا کیا۔

یعنی یہ حکمت کی نعمت آپ علیہ السلام کی اولاد میں قیامت تک برقرار رہے گی حتی کہ علماء اور ریاست کے امراء حکمت کے ذریعے علم اور ہدایت سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

یہودیوں کو بخوبی اس بات کا علم تھا کہ اللہ تعالیٰ جس کو نبوت عطا فرماتا ہے اس کو حکمت، حکومت اور سلطنت بھی عطا کرتا ہے۔ بنی اسرائیل پر نازل ہونے والی کتب بھی اس بات کی گواہ تھیں۔ تو اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انہی کے حسد کا ذکر فرمایا کہ وہ پھر بھی حسد کرتے ہیں کہ ابراھیم علیہ السلام اور ان کی آل کو حکمت اور خلافت یعنی نبوت سے کیوں نوازا گیا۔

۱۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۲۷۶/۶

۲۔ النسآء: ۵۴/۴

۳۔ البغوی، معالم التنزیل، ۶۴۶/۱

۴۔ النسفی، مدارک التنزیل، ۲۳۲/۱

۵۔ عیاشی، محمد بن مسعود، تفسیر عیاشی (تہران: انتشارات مکتبۃ العلمیۃ الاسلامیۃ، ۱۳۸۰ھ)، ۱۶۹/۱

اس مقام پر حکمت سے مراد یہ بھی ہے کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام اور آپ علیہ السلام کی آل کو ایسا اقتدار ملنے والا ہے جو سب سے برتر اور لازوال ہو گا۔ اور آل ابراھیم کو حکمت دیئے جانے کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمت، نبوت، علم، فقہ یعنی دین کی سمجھ بوجھ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور آپ کی اولاد کو عطا فرمائی۔ حکمت کے متعلق اگر یہ شبہ ذہن میں آئے کہ حکمت میں آل ابراھیم میں آل اسماعیل کی کیوں تخصیص ہے حالانکہ حضرت اسحاق علیہ السلام بھی آپ علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس لیے یہود کو سرزنش کی جا رہی ہے کہ تم حسد کی اگ میں جلتے رہو۔ حکمت اور نبوت اب حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد میں ہو گی۔[1] سورۃ النحل میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کی صفات بیان ہوئی ہیں، ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ . شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ. وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾[2]

اصل میں ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا فرماں بردار اللہ کا سب سے ایک طرف ہو کر، اور نہ تھا شرک کرنے والوں میں۔ حق ماننے والا اس کے احسانوں کا، اس کو اللہ نے چن لیا اور چلایا سیدھی راہ پر۔ اور دی ہم نے دنیا میں اس کو خوبی اور وہ آخرت میں اچھے لوگوں میں ہے۔

قرآن کریم میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کی حکمت کے ساتھ ساتھ ان کی پانچ عظیم صفات بھی ذکر فرمائی گئی ہیں۔ جن میں:

۱۔ آپ کا وجود ایک امت کی مانند تھا۔
۲۔ آپ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مطیع بندے تھے۔
۳۔ آپ علیہ السلام کو قرآن کریم نے شرک سے مبراء اور منزا قرار دیا۔
۴۔ آپ علیہ السلام ہمیشہ شکر کرنے والے تھے۔
۵۔ آپ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہ حق پر تھے۔[3]

متولی الشعراوی (۱۹۱۱ء-۱۹۹۸ء) درج بالا آیت کی تفسیر میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کے وصف حکمت کے متعلق لکھتے ہیں:

"فَقَدْ آتَيْنَآ آلَ إِبْرَاهِيمَ الكتاب والحكمة وَآتَيْنَاهُمْ مُّلْكاً عَظِيماً} و «الكتاب» هو المنهج الذي ينزل من السماء، و «الحكمة» هي الكلام الذي يقوله الرسول مفسراً به منهج الله"[4]

۱۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۱۰/۱۰۵

۲۔ النحل: ۱۶/۱۲۲

۳۔ دیکھیے: پانی پتی: تفسیر مظہری، ۵/۹۲، الازہری، ضیاء القرآن، ۴/۳۴۴، تھانوی، بیان القرآن، ص ۳۸۸

۴۔ الشعراوی، محمد متولی، تفسیر الشعراوی، ۴/۲۳۲۷

کتاب سے مراد تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکامات نازل ہوئے اور حکمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی تشریح، اس کلام کے اندر حکمت اور مقاصد جو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے بیان فرمائے ہیں۔

آپ علیہ السلام کی تاریخی شخصیت کے وہ تمام پہلو جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے حکمت سے معمور نظر آتے ہیں۔ آپ علیہ السلام کے ہجرت کرنے اور اپنی اولاد کی ایک شاخ کو مکہ میں آباد کرنے، خانہ کعبہ تعمیر کرنے اور اس کے ساتھ نسبت قائم کرنے اور وقت تعمیر اللہ تعالیٰ سے اپنی آئندہ نسل اور نوع انسانی کی بہتری اور فلاح کے لیے دعائیں کرنے سے آپ علیہ السلام کی حکمت عیاں ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور علم حکمت

قرآن کریم میں حضرت عیسی علیہ السلام کی صفت حکمت کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ﴾[1]

اور اللہ تعالیٰ عیسیٰ (علیہ السلام) کو لکھنا اور عقل مندی اور تورات وانجیل سکھائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ذریعے حضرت مریم علیہ السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کو عطا کی جانے والی صفات اور حکمتوں سے متعلق خوشخبری عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خط وکتاب کا علم عطا فرمایا اور شریعت کے احکام کی سمجھ بوجھ بھی عطا فرمائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے قول وعمل میں نہایت پاکیزہ اور پختہ تھے اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلنے والے تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو پہلے کتاب یعنی انجیل عطا فرمائی اور پھر امت کے ساتھ معاملات اور مسائل کے حل کے لیے حکمت، تدبیر منزل اور تہذیب اخلاق عطا فرمایا، امام بغوی، رازی اور ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اگرچہ آپ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی لیکن آپ تورات کے نہ صرف خود حافظ تھے بلکہ امت کو تورات اور انجیل دونوں کی تعلیم دیتے اور دونوں کے احکامات سکھاتے اور حکمت کی تعلیم وتربیت دیتے تھے۔[2]

آپ علیہ السلام کو عطا کردہ حکمت کا معنی یہ بھی ہے کہ یہودیوں نے اب تورات کو بالکل بے روح اور بے جان سمجھ لیا تھا اور محض رسم ورواج کا مجموعہ سمجھ لیا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حکمت کی تعلیم دے کر تورات کے اندر نئی جان ڈالی اور دانش مندی سے امت کو اس پر عمل کرنے کی تلقین فرمائی۔[3]۔ سورۃ المائدہ میں ارشاد ہے:

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ﴾[4]

۱۔ آل عمران: ۴۸/۳

۲۔ دیکھیے: بغوی، معالم التنزیل ۳۰۲/۱، رازی، مفاتیح الغیب، ۵۹/۸، ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ۳۴۴/۱

۳۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۲۲۱/۲

۴۔ المائدہ: ۱۱۰/۵

جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے یاد کر میرا احسان جو ہوا ہے تجھ پر اور تیری ماں پر جب مدد کی میں نے تیری روح پاک سے تو کلام کرتا تھا لوگوں سے گود میں اور بڑی عمر میں اور جب سکھائی میں نے تجھ کو کتاب اور تہہ کی باتیں اور تورات اور انجیل

سورۃ الزخرف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ﴾[1]

اور جب عیسیٰ واضح دلیلیں لے کر آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ میں تمہارے پاس دانائی کی باتیں لایا ہوں اور تاکہ تم پر بعض وہ باتیں واضح کر دوں جن میں تم اختلاف کرتے تھے پس اللہ سے ڈرو اور میرا حکم مانو۔

امام طبریؒ کے نزدیک حکمت سے مراد تورات اور انجیل دونوں کی تعلیمات مراد ہیں [2]۔ جب کہ ابن عاشورؒ لکھتے ہیں:

"والحكمة هي معرفة ما يؤدي إلى الحسن ويكف عن القبيح وهي هنا النبوءة"[3]

یہاں حکمت سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا علم عطا کرنا مراد ہے جس میں اشیاء کی خوبیوں اور ان کے نقصانات اور قبیح امور سے اجتناب کیا جا سکے اور حکمت سے یہاں نبوت بھی مراد ہے۔

محمد کرم شاہ الازہریؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس وقت بنی اسرائیل کی حالت یہ تھی کہ مذہبی بحثیں اور مناظرے روزمرہ کا معمول تھے۔ ایک دوسرے کی تکفیر پسندیدہ مشغلہ تھا۔ دین ان کے لیے اتحاد واتفاق کا منبع نہ رہا تھا بلکہ خلفشار وانتشار کا سبب بن گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے انہیں فرمایا کہ آؤ میں نور حکمت لے کر آیا ہوں۔ اگر تم تعصب اور بے جا ضد کا طریقہ چھوڑ دو گے تو تمہارے بہت سارے مختلف فیہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ مناظرہ بازی کا چکر ختم ہو جائے گا۔ ساتھ ہی یہ تنبیہہ بھی فرما دی کہ میری رہنمائی سے وہی فائدہ اٹھا سکے گا جس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور وہ میری اطاعت کرنے کے لیے تیار ہو"[4]

آپ علیہ السلام کی حکمت کے مظاہر میں سے آپ کا طب میں بھی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہونا ہے۔ آپ علیہ السلام علم امراض کی جانچ پڑتال کے مسیحا بن کر آئے اور علم بصارت اور سماعت، علم الاجسام، گیسوں اور عناصر کے اعجازات سے حیرت انگیز اُڑنے والی ایجادات اور نفساتی علوم میں ایسا کمال دکھایا کہ کہ آج ان کی اُمت کے علمائے فطرت بھی انہی کے نقش قدم پر چل کر دنیا میں مظاہر پیش کر رہے ہیں۔[5]

۱۔ الزخرف: ۶۳/۴۳

۲۔ الطبری، جامع البیان، ۸۳/۷

۳۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۲۴۶/۲۵

۴۔ الازہری، ضیاء القرآن، ۱۹۲/۶

۵۔ دیکھیے: آزاد، ترجمان القرآن، ۳۳۲/۱

اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو کتاب اور شریعت دونوں کا علم عطا فرمایا، آپ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی کتاب تورات اور ان کی شریعت پر عمل کرنے اور عمل کی تلقین کرنے والے تھے اور آپ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی دعوت دینے والے تھے۔[1]۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يَاعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَى وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَى بِإِذْنِي وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ﴾[2]

اس آیت کے مخاطب اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے حق دار دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ لوگ جو صاحب عقل و دانش اور دل سے نصیحت کو قبول کرنے والے اور نفسانی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو مادیت پرست اور دنیادار ہیں جو کائنات میں غیب پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ پہلے طبقہ کے لوگ جو عقل و دانش کی باتوں پر یقین رکھتے اور ان میں تفکر اور تدبر کی صلاحیت موجود ہے آیت مبارکہ میں کتاب، حکمت، تورات اور انجیل کی تعلیم انہی کے لیے رکھی گئی ہے۔ دوسری قسم کی تعلیم دوسرے طبقے کے لوگوں کے لیے ہے جو مادیت پرست تھے اور سمجھتے تھے کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو عقل سے ماورا کام کر رہے ہیں وہ کوئی اور نہیں کر سکتا یعنی آپ علیہ السلام کے معجزات جیسے مٹی سے پرندہ بنانا، مادہ زاد اندھوں کو اور کوڑھی کے مریضوں کو تندرست کرنا اور مردے زندہ کرنا وغیرہ۔ اس طبقے کے لیے ایسے معجزات دکھا کر ہی ان کو دین کی دعوت کی طرف قائل کیا گیا ہے اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی حکمت کا ثمر ہے۔[3]

خلاصہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں کو حکمت کے تمام ارکان، اس کے تمام اجزاء اور اس حکمت کی ہر صفت سے مزین کر کے بھیجا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اور رسول کو اپنے وقت اور زمانے اور اس کے پیش آمدہ مسائل اور ضرورتوں کے اعتبار سے حکمت اور حکمت عملی سکھائی گئی۔ تمام انبیاء علیہم السلام اقوال، افعال، تعلم اور تعلیم میں حکمت سے خود بھی مزین تھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی امت کو بھی حکمت کی تعلیم دینے والے تھے۔

حکمت عملیہ کے تینوں اقسام تہذیب نفس، تدبیر منزل اور سیاست مدن میں ہر شخص کی رہنمائی انبیاء علیہم السلام کے بنیادی فرائض میں شامل رہی ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قوم اور امت کو دین کی دعوت پہنچانے کے لیے حکمت کے اعلیٰ مراتب پر فائز تھے۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام، حضرت داودؑ علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوتی حکمت عملی کو خصوصی طور پر قرآن کریم میں مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور مفسرین کرام نے اپنی آراء کے مطابق ان کے حکمت کے مظاہر کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔

۱۔ دیکھیے: زمخشری: الکشاف، ۲۶۲/۴، رازی، مفاتیح الغیب، ۲۲۴/۲/۷

۲۔ المائدہ: ۱۱۰/۵

۳۔ الشعراوی، محمد متولی، تفسیر الشعراوی، ۲۳۲۷/۴

فصل پنجم

صالحین کی صفت حکمت کے تفسیری اطلاقات

حضرت لقمان علیہ السلام

حضرت لقمان کی حکمت ودانائی علماء کے نزدیک مسلم تھی۔آپ کی حکمت کی ضرب المثل اہل عرب میں ضرب المثل چلی آتی تھی،آپ مختلف اقوال کی روشنی میں بادشاہ تھے یاغلام مگرایک بات قرآن کریم سے بھی ثابت ہے کہ حکمت ودانائی میں مشہور تھے،قرآن کریم کے مطابق جس شخص کو حکمت کے خزانہ سے اللہ تعالیٰ نے حصہ دیااسے خیر کثیر عطا کی گئی،آپ اگر بادشاہ نہ بھی ہوں تو پھر بھی قرآن کریم میں آپ کی قدرومنزلت بادشاہوں جیسی بیان کی گئی ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام کے بارے میں ارشادربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾[1]

اور بیشک ہم نے لقمان کو حکمت عطافرمائی کہ تم اللہ کا شکرادا کرو٬اور جو شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے شکرادا کرتا ہے٬اور جو ناشکری کرتا ہے تواللہ بے نیاز ہے٬حمد کیا ہوا

ابی حاتم رازی امام واقدی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کان أسود من سودان مصر ذا مشافر أعطاه الله الحکمة ومنعه النبوة"[2]

حضرت لقمان علیہ السلام سیاہ فام حبشی تھے،اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت عطافرمائی اور نبوت کو ان سے روک دیا۔

آپ علیہ السلام بنی اسرائیل کے دور میں قضاۃ کے منصب پر فائز تھے جب کہ سعید بن مسیب کے قول کے مطابق آپ مصری سیاہ فام حبشی تھے،اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت عطافرمائی اور نبوت کو ان سے روک لیا،جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے ولی تھے اور نبوت آپ کو عطا نہیں کی گئی۔[3] علامہ طبرسی حضرت لقمان کو عطا کردہ حکمت کے مفہوم میں لکھتے ہیں:

"أي أعطيناه العقل و العلم و العمل به و الإصابة في الأمور"[4]

آپ کو کامل عقل اور علم نافع دیا گیااور حکمت عملیہ سے بھی سرفراز کیا گیااور امور میں اصابت رائے (حق بات) کا بھی ملکہ عطافرمایا گیا تھا۔

۱۔ لقمان:۱۲/۳۱

۲۔ الرازی،ابن ابی حاتم،۲۲۲/۸

۳۔ السیوہاوی،قصص القرآن،۲۴۴/۱

۴۔ الطبرسی،فضل بن حسن،مجمعُ البیان فی تفسیر القُرآن(بیروت:دارالعلوم لطباعة والنشر،۱۴۲۶ھ)،۷۰/۸

حضرت لقمان کے نام سے منسوب سورت مبارکہ میں ہمیں جن امور کی طرف اشارے ملتے ہیں ان میں بھی حکمت کی لطافت نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا فرمانے کے متصل بعد شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور اس سے بڑھ کر یہ بھی فرمایا کہ شکر کرنے کا فائدہ اور منفعت خود شکر کرنے والے کے لیے ہے، اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اور اور اس کی حمد تو مخلوق ہر وقت کرتی رہتی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا﴾[1]

ساتوں آسمان اور زمین اور وہ سارے موجودات جو ان میں ہیں اللہ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اور (جملہ کائنات میں) کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح (کی کیفیت) کو سمجھ نہیں سکتے، بیشک وہ بڑا بردبار بڑا بخشنے والا ہے۔

اس کریمہ میں حکمت کے متصل بعد شکر کا حکم دیا جانا حکمت کو مزید بڑھاتا ہے، اور حکمت کا لازمی نتیجہ ذات انسانی کو شکر خداوندی کی طرف مائل کرتا ہے، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکمت اور شکر لازم وملزوم ہیں، اگر ایک ذات میں حکمت کا عنصر ہے تو شکر کا ہونا لازمی ہے اور اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں پیش پیش ہے تو لازمی بات ہے کہ وہ شخص حکیم ودانا بھی ہو گا۔ حکمت کا عام تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے لیے سود مند پہلو تلاش کرے، اور ایسے پروگرام ترتیب دے جو بالاخر، انجام کار اس کے لیے مفید ثابت ہوں۔ لہٰذا اسی آیت میں فرمایا گیا کہ جو شخص اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ وہ اس شکر کی ادائیگی کے ذریعہ سے اپنے نفس کے لیے فوائد حاصل کرتا ہے اور جو شکر کے بجائے کفر کا راستہ اپناتا ہے اللہ تعالیٰ سے اپنی توجہ ہٹا لیتا ہے اور اس آیت کریمہ کے روشنی میں اس سے بے نیاز اور بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ قانون فطرت سے نبرد آزما ہو کر نیست و نابود ہو جاتا ہے۔[2]

حضرت لقمان علیہ السلام کی حکمت کے مظاہر

سورۃ لقمان میں حضرت لقمان کی وہ نصائح ہیں جو آپ نے اپنے بیٹے سے کی، اس نصیحتوں میں جو امور خاص طور پر زیر بحث آئے ہیں ان کا تعلق حکمت سے بلاواسطہ ہے، سب سے پہلے آپ اپنے بیٹے کو فرماتے ہیں کی اللہ تعالیٰ کا کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرانا۔ اس لیے توحید باری تعالیٰ کائنات کا وہ اولین راز پوشیدہ ہے جس کے بغیر انسان کو صحیح سمت اور رخ مل ہی نہیں سکتا۔ جب تک انسان اس کائنات کے مالک ومختار اور خالق اور رزق دینے والے کو نہیں مانے گا اس کی فکر اور سوچ درست سمت میں رواں ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ بنیاد ہے انسانی شخصیت کی تعمیر اور نوع انسانی کو ایک مقام پر لانے کی جب انسان ایک ہستی کو تمام کائنات کا مرکز، محور، مالک، خالق، ملجا اور ماوا تصور کر لے گا تو اس کی ذات سے پیدا ہونے والی تمام تر افکار صحیح سمت میں سفر کرتی چلی جائیں گی۔ توحید کی ضد شرک ہے اور شرک سے ذات کا انتشار اور اختلاف اور پھر نوع انسانی کا اختلاف اور افتراق پیدا ہوتا ہے، جب اس کائنات کے مالک اور مختار ہی ایک سے زائد ہو گئے تو نوع انسانی کا یکجا ہونا کیا معنی رکھتا ہے، انسانی فکر میں ہم آہنگی

۱۔ الاسراء: ۱۷/۴۴

۲۔ دیکھیے: ثعلبی، الکشف والبیان، ۷/۸/۱۷، مزید ملاحظہ فرمائیں: بغوی، معالم التنزیل، ۶/۵/۳۷۶

کیسے پیدا ہو سکتی ہے، ایک سلطنت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے تو اس کائنات میں دو یا دو سے زائد خدا کیسے سما سکتے ہیں لہٰذا شرک حکمت کی ضد ہے اور یہ ظلم عظیم ہے اور عقیدۂ توحید باری تعالیٰ حکم کی اصل ہے۔[1]

حضرت لقمان نے دوسری نصیحت کے درمیان موقع کی مناسبت سے ایک حکم صادر فرمایا ہے کہ والدین کی قدر و منزلت کے بارے میں اور اس میں بھی شرک سے بچاؤ کی ترکیب اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے ، والدہ کی تکلیف اُٹھانے کی بات کی اور پھر فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے رحم مادر میں تخلیق کیا اور والدین کا بھی شکر ادا کرے کہ والدہ نے پیٹ میں حمل میں اُٹھائے رکھا اور پھر پیدائش کے بعد دودھ پلایا اور والد نے تربیت کا دیگر سامان مہیا کیا۔ حضرت لقمان کی یہ اہم نصیحت انتہائی بلند اخلاق کی علامت ہے[2]

﴿وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ۚ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾[3]

اور اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کی کوشش کریں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس (کی حقیقت) کا تجھے کچھ علم نہیں ہے تو ان کی اطاعت نہ کرنا، اور دنیا (کے کاموں) میں ان کا اچھے طریقے سے ساتھ دینا، اور (عقیدہ و امور آخرت میں) اس شخص کی پیروی کرنا جس نے میری طرف توبہ وطاعت کا سلوک اختیار کیا۔ پھر میری ہی طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے تو میں تمہیں ان کاموں سے باخبر کر دوں گا جو تم کرتے رہے تھے۔

والدین کے حقوق بتلاتے کے ساتھ ایک اشتباہ کا پہلو تھا اس کو واضح کر دیا کہ آپ والدین مشرک ہونے کی صورت میں بھی فرمانبرداری کی تلقین کرتے ہیں مگر شرک کا حکم دینے پر حکم عدولی کی اجازت دیتے ہیں مگر پھر بھی یہ نصیحت کرتے ہیں کہ دنیوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا ہے یہ انتہائی بلند اخلاق ہونے کی علامت ہے اور یہی آپ کی حکمت کا عملی ثبوت ہے جو آپ اپنے بیٹے کو نصیحت فرما رہے ہیں ان نصیحتوں کی عظمت کا یہی پہلو ہے کہ ان کو قرآن کریم بیان کر رہا ہے۔[4]

ایک اور اشتباہ یہ بھی تھا کہ شرک کرنے کی صورت میں حکم عدولی اور پیروی نہ کرنے کی اجازت کے ساتھ بھی ایک اشتباہ تھا کہ اس سے والدین سے ترک تعلق نہ ہو بلکہ دنیوی تعلق اور نسبت قائم رکھی جائے اور ان کی دنیوی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھا جائے اور ان کے ساتھ حسن سلوک میں کمی واقع نہ ہونے پائے، یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو بیک وقت بہت نازک بھی ہے، اور یہ کام ذمہ داری، بردباری، بلند حوصلہ مندی کا متقاضی ہے۔[5]

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ان الفاظ میں وصیت فرمائی۔ ارشاد ربانی ہے:

۱۔ القاسمی، محاسن التاویل، ۲۸/۸، مزید دیکھیں: اصلاحی، تدبر قرآن، ۷۸/۵

۲۔ المراغی، تفسیر المراغی، ۳۹۸۰/۱

۳۔ لقمان: ۱۵/۳۱

۴۔ الاندلسی، البحر المیط، ۴۱۶/۸

۵۔ دیکھیے: مفتی شفیع: معارف القرآن، ۸۸/۶

﴿يَا بُنَيَّ إِنَّهَا إِن تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُن فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ﴾[1]

(لقمان نے کہا) اے میرے پیارے بیٹے! اگر ایک رائی کا دانہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں یا زمینوں میں، تو اللہ اس کو لے آئے گا بیشک اللہ ہر باریکی کا جاننے والا ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے

شرک سے اجتناب کی نصیحت کے بعد اللہ تعالیٰ کے لطیف اور خبر دار ہونے کی صفت کا اظہار ضروری تھا کہ بیٹے پر اور اس کے ذریعہ تمام قرآن کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ واضح ہو جائے کہ ایک ذات کو اپنا مال اور ملجا تو سمجھ لیا ہے مگر یہ نہ سمجھنا کہ وہ مالک اور خوشی اور غم دینے اور لینے والی ذات تمہارے اعمال سے اور افعال سے کسی بھی لمحہ بے خبر ہے۔ بے خبر ہونے سے انصاف اور عدل کا قیام ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ انصاف کے تقاضے پورے ہونے کے لیے کماحقہ باخبر ہونا ضروری ہوتا ہے، خبر کا ذریعہ اگر ذاتی مشاہدہ ہے تو وہی خبر مستند ہے اور اس خبر پر مبنی انصاف ہی عدل کے تمام تر تقاضے پورے کر سکتا ہے، لہٰذا اب اللہ تعالیٰ کو باخبر ماننا ہی ایک ایسے کامل نظام کی بنیاد ہے جس پر جزا و سزا اور حساب و کتاب کا مکمل نظام قائم ہو سکتا ہے۔[2] علامہ مودودی لکھتے ہیں کہ حضرت لقمان کی باقی نصائح کے ساتھ اس نصیحت کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عقائد کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ اہل عرب کو جو اخلاقی تعلیمات دے رہے ہیں وہ بھی کوئی نئی، انہونی یا انوکھی بات نہیں ہے۔[3]

دعوت دین میں حضرت لقمان کی حکمت

والدین کی نافرمانی سے بچنے کے متعلق نصیحت فرماتے ہوئے اور شرک کی قباحت بیان کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾[4]

اور اگر وہ دونوں تجھ سے اڑیں اس بات پر کہ شریک مان میرا اس چیز کو جو تجھ کو معلوم نہیں تو ان کا کہنا مت مان اور ساتھ دے ان کا دنیا میں دستور کے موافق اور راہ چل اس کی جو رجوع ہوا میری طرف پھر میری طرف ہے تم کو پھر آنا پھر میں جتلا دوں گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے۔

یعنی شرک سے نہ صرف بچنا بلکہ مشرکین کی سنگت سے بھی اجتناب کرنا اور ماں اور باپ دونوں سے معروف طریقے سے رہنا، قرآن کریم میں حضرت لقمان علیہ السلام کے نصائح میں (معروفا) کی اصطلاح استعمال فرمائی گئی، امام نسفی اس آیت کی تفسیر میں (معروفا) لکھتے ہیں:

"أي صحاباً معروفاً حسناً بخلق جميل وحلم واحتمال بر وصلة"[5]

۱۔ لقمان: ۱۶/۳۱

۲۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۱۲۱/۲۵

۳۔ المودودی، تفہیم القرآن، ۱۳۷/۵

۴۔ لقمان: ۱۵/۳۱

۵۔ النسفی، مدارک التنزیل، ۷۱۵/۲

اس کے معنی میں خوبی اور خوبصورت اخلاق اور حلم و حوصلہ اور برّ و صلہ رحمی سب کچھ ہی داخل ہے۔

آپ علیہ السلام کے نصائح میں الفاظ کے جامعیت کو من و عن قرآن کریم میں بیان کیا گیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت کے کتنے عظیم مقامات عطا کیے گئے تھے۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے دین کی دعوت میں معروف کا حکم اور منکرات سے بچنے کی بھی تلقین فرمائی، ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾[۱]

اے میرے پیارے بیٹے ! تم نماز کو قائم رکھنا اور نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اور تم کو جو مصیبت پہنچے اس پر صبر کرنا' بیشک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

ابن عاشور اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''فهذه كلمة جامعة من الحكمة والتقوى''[۲]

حضرت لقمان نے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں حکمت اور تقویٰ سے لبریز جملے ارشاد فرمائے۔

آپ نے اپنے بیٹے کو لوگوں کے لیے خیر اور بھلائی اور ان کو نصیحت فرمائی کہ تم لوگوں کو برے کاموں سے باز رہنے کی تلقین کرو اور اس کے فوراً بعد آپ نے صبر کی بھی تلقین فرمائی اس لیے کے نیکی کے کاموں کی تلقین اور لوگوں کو برائی کے کاموں سے بچانے کے لیے صبر ضروری ہے اس لیے کہ داعی کو معاشرے کے اندر دین حق کی دعوت دینے کے لیے لوگوں کی مخالفت اور ان کی طرف سے دی جانے والی مختلف قسم کی تکالیف سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ایسی صورت میں اگر داعی ان مصیبتوں اور تکلیفوں پر صبر کرے تو اس کا یہ کام جاری رہ سکتا ہے ورنہ اس کو یہ کام ترک کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور بالآخر وہ دعوت دین کا کام ترک کر دیتا ہے، حضرت لقمان نے دعوت دین میں حکمت کے ان پہلوؤں کو نہایت احسن طریقے سے اجاگر کیا ہے۔

آپ نے اپنے بیٹے کو تلقین فرمائی لیکن اس میں سب داعین حق کے لیے سبق ہے کہ آپ نے نہ صرف صبر کی تلقین فرمائی بلکہ فرمایا کہ صبر کا فائدہ خود صبر کرنے والے ہی کی طرف لوٹتا ہے، اسی وجہ سے صبر کو ہمت اور عظمت کے ساتھ ملایا گیا کہ صبر مشکل ضرور ہے لیکن بہت زیادہ فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ ابن عاشور نے قاسم بن یامون التلیدی کی کتاب النکاح میں مذکور حضرت لقمان کی ستر (۷۰) حکمتوں کو اپنی تفسیر میں ذکر فرمایا ہیں۔[۳]

حضرت لقمان کی اس نصیحت سے واضح ہوتا ہے کہ صبر حکمت کے دو اہم عناصر میں سے ہے جن میں مقدم شکر اور مؤخر صبر ہے، حکمت کی دو شاخیں ہیں ایک صبر اور دوسرا شکر ہے، پھر آپ اپنے بیٹے کو زمین پر اترا کر چلنے سے منع فرماتے ہیں اور اپنے رخسار کو لوگوں کی طرف متوجہ کرنے کا حکم دیتے اور میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور اسی طرح تکلم میں اپنی آواز کو پست کرنے کا حکم دیتے ہیں، مفتی شفیع لکھتے ہیں کہ حضرت لقمان

۱۔ لقمان: ۳۱/۱۷

۲۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۲۱/۱۶۵

۳۔ ایضاً، ۲۱/۱۷۲

صاحب حکمت ہیں اور پھر جب بھی کوئی باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے تو وہ اپنی حکمت اور تجربے کا نچوڑ اور مغز بیان کرتا ہے اس لیے کہ بیٹے سے بڑھ کر نصیحت پدری کا اور کوئی حق دار نہیں۔[1]

آصف بن برخیا کی حکمت

قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ آپ علیہ السلام نے بلقیس کو انتہائی مختصر مگر جامع ترین دعوتی خط لکھا کہ وہ ہماری اور ہمارے دین کی دعوت قبول کرے، ملکہ بلقیس نے اپنے وزیروں کے مشورے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں جانے کے فیصلہ کر لیا۔ علامہ اشرف علی تھانوی کے مطابق آپ علیہ السلام کو وحی یا کسی پرندے وغیرہ کی اطلاع ملی کی بلقیس اِن کے دربار کی طرف چلنے لگی ہے تو آپ علیہ السلام نے اپنے حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ تم میں کون اس کے تخت کو اس کو پہنچنے سے پہلے لا سکتا ہے۔ ایک جن نے عرض کی کہ میں محفل ختم ہونے سے پہلے لا سکتا ہوں۔ غالباً آپ اس سے بھی پہلے چاہتے تھے تو ایک آدمی نے کہا کہ میں آپ علیہ السلام کی آنکھ آپ کی طرف پلٹنے سے پہلے یعنی آنکھ کی پلک جھپکنے سے بھی پہلے تخت حاضر کر سکتا ہوں۔

مفسرین کرام نے بہت عمدہ اور علمی نکات اس واقعہ کے تحت درج فرمائے ہیں، حکمت کے تحت اس شخص کے واقعہ کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حکمت کا علم عطا فرمایا تھا۔ اس لیے کہ وہ شخص نبی نہیں تھا کہ وہ اپنے معجزہ کے ذریعے اس کو لے آتا۔ مگر اس نے جس ذریعے سے اس تخت کو حاضر کیا وہ حکمت کا علم تھا، اس لیے کہ ہم صوفیا کرام کے نزدیک حکمت کا تصور ذکر کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک حکمت اور خیر کثیر سے مراد اللہ تعالیٰ کے اولیاء کا تصرف ہے جس کو کرامت بھی کہا جاتا ہے۔[2] سورۃ النمل کی آیت نمبر ۴۰ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ﴾[3]

اور بیشک میں اس کو اٹھالانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں (اور) امین بھی ہوں۔ عرض کی اس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا (اجازت ہو تو) میں لے آتا ہوں اسے آپ کے پاس اس سے پہلے کہ آپکی آنکھ جھپکے پھر جب آپ نے دیکھا کہ وہ رکھا ہوا ہے آپ کے نزدیک تو وہ فرمانے لگے یہ میرے رب کا فضل (وکرم) ہے تاکہ وہ آزمائے مجھے کہ آیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور جس نے شکر کیا تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے اور جو ناشکری کرتا ہے (وہ اپنا نقصان کرتا ہے) بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے (اور) کریم بھی

۱۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۶/ ۱۴۷

۲۔ التھانوی، بیان القرآن، ص ۴۰۴

۳۔ النمل: ۲۷/ ۴۰

قرآن کریم میں جس شخص کا تذکرہ ہے کہ جو ملکہ بلقیس کا تخت یمن سے عراق حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم پر آپ کے دربار میں آنکھ جھپکنے سے پہلے لے آیا تھا۔ اس شخص کا نام آصف بن برخیا تھا۔ ابن ابی حاتم اپنی تفسیر میں ابن عباس کی روایت نقل کرتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ يَعْنِي قَوْلَهُ: الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ قَالَ آصِفُ كَاتِبُ سُلَيْمَانَ عَلَيْهِ السَّلامُ.[1]

ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق ان کا نام آصف تھا جو حضرت سلیمانؑ کے کاتب تھے۔

ابن عطیہؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

واختلف المفسرون في الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتابِ من هو، فجمهور الناس على أنه رجل صالح من بني إسرائيل اسمه «آصف بن برخيا»[2]

جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا وہ کون تھا۔ اگرچہ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے لیکن جمہور مفسرین کی رائے یہی ہے کہ یہ بنی اسرائیل کا صالح شخص تھا جس کا نام آصف بن برخیا تھا۔

اس کے علاوہ اسی قول کی مزید تائید میں امام ابن کثیرؒ، امام خازنؒ، علامہ بیضاویؒ، علامہ آلوسیؒ اور مفتی شبیر احمد عثمانی اور علامہ غلام رسول سعیدی نے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔[3]

حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ لکھتے ہیں:

مفسرین کہتے ہیں کہ جس شخص کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے اس کے پاس کتاب کا علم تھا اس کا نام آصف بن برخیا تھا اور یہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا معتمد خاص اور قاصد (وزیر) تھا اور یہی حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے منقول ہے۔ اور بعض مفسرین نے کچھ اور نام بھی ذکر کئے ہیں مگر زیادہ ابن عباس (رض) کے قول ہی کو مفسرین راجح تسلیم کرتے ہیں۔[4]

آصف بن برخیا کے پاس بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت کا علم تھا۔ جس کے بارے میں علامہ بقاعیؒ لکھتے ہیں:

"ولما كانت القصة لإظهار فضل العلم المستلزم للحكمة"[5]

قرآن کریم میں خارق عادت کا یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کا اپنے فضل اور حکمت کا اظہار کرنا ہے۔

یعنی امت محمدیہ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو کس طرح حکمت و دانائی اور فضل عطا فرماتا ہے اور وہ اس حکمت کو لوگوں پر کس طرح استعمال کرتے ہیں، آپ لکھتے ہیں کہ جس طرح نبی کریم ﷺ کی شریعت مطہرہ میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہے اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کا

---

۱ ۔ الرازی، تفسیر ابن ابی حاتم، ۱۶۶/۸

۲ ۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۲۱۹/۴

۳ ۔ مزید دیکھیے: خازن، مدارک التنزیل، ۲۴۱/۳، اندلسی، البحر المحیط، ۲۴۰/۲، ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ۲۰۰/۳، بیضاوی، حاشیہ شیخ زادہ، ۳۹۷/۶، شوکانی، فتح القدیر، ۴-۱۸۴، عثمانی، تفسیر عثمانی، ص ۵۰۵، سعیدی، تبیان القرآن، ۲۷۵/۷

۴ ۔ السیوہاروی، حفظ الرحمٰن، قصص القرآن، ۱۴۸/۲

۵ ۔ البقاعی، نظم الدرر، ۴۲۶/۵

مظہر ہو کر اس کی کائنات میں تصرف کرتے ہیں اسی طرح آصف بن برخیا نے بھی اس تخت کو تصرف کے ذریعے حاضر کر دیا۔

امام ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"أَنَّهُ أَمَرَهُ أَنْ يَنْظُرَ نَحْوَ الْيَمَنِ الَّتِي فِيهَا هَذَا الْعَرْشُ الْمَطْلُوبُ"[1]

آصف بن برخیا نے آپ علیہ السلام سے عرض کی کہ آپ یمن کی طرف دیکھیں جہاں بلقیس کا تخت ہے پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو وہ تخت آپ علیہ السلام کے دربار میں موجود پایا گیا۔

شیخ محی الدین نے بھی اسی بات کو قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ تخت کو معدوم کر کے دوسری جگہ پر موجود کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے ولی کے کن کہنے کے مترادف ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے کا کسی کام میں تصرف کرنے میں دیر اور وقت نہیں لگتا بلکہ اللہ تعالیٰ جس طرح اپنا ارادہ اور کسی کام کی تکمیل کن سے فرما دیتا ہے اسی طرح وہ اپنے محبوب بندوں کے تصرفات میں اپنی طاقت عطا فرماتا ہے، ہمارا مدعا بھی یہی بیان کرنا ہے کہ حکمت کا ایک معنی کائنات اور اس کی اشیاء میں تصرف کرنا اور ان کے حقائق کو جاننا ہے، غور و فکر کرنے والا عقل و قلب سے اشیاء کی حقیقتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ جس کو اللہ تعالیٰ علم، اور حکمت عطا فرماتا ہے وہ تصرفات کے ذریعے کائنات کے حقائق تلاش کرتا ہے، اسی کا نام حکمت ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے پہاڑ، اور طیور اور جنات جیسی مخلوقات مسخر کی دی گئی تھی اور پھر آپ علیہ السلام نبی ہوتے ہوئے خود بھی تخت حاضر کر سکتے تھے، اس کام کے لیے آپ نے اہل مجلس سے مدد اس لیے مانگی تا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی حکمت یعنی خیر کثیر جو اس نے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ بھی اپنے بندوں کو عطا کی وہ عام مخلوق پر ظاہر ہو جائے اور تا کہ سب پر دین کا یہ پیغام واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے کہ وہ کتنا شکر ادا کرتے اور مخلوق خدا پر کتنا احسان کرتے ہیں ہیں، اور شکر کرنے اور احسان کرنے سے ہی خیر کثیر اور فضل عطا کیا جاتا ہے اور پھر شکر کرنے کا فائدہ بھی خود شکر کرنے والے ہی کو ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی نعمتوں سے منہ پھیرنے والا اور ناشکری کرنے والے سے اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہو جاتا ہے، اسی لیے آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خود غنی اور کرم کا مالک ہے۔[2] جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾[3]

اور جب وہ اپنی پختگی کو پہنچ گیا تو ہم نے اسے حکم (قوت فیصلہ) اور علم عطاء کیا۔ حسن عمل کا رویہ اختیار کرتے والوں کو ہم اسی طرح بدلہ عطاء فرماتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اس شخص کا نام نہیں لیا گیا کہ وہ کون تھا اور نہ اس کتاب کا ذکر ہے جس کا علم اس کے پاس تھا۔ یہ ایک مومن شخص تھا، اللہ کے ساتھ اس کا اتصال تھا، اللہ تعالیٰ کی رضا کو پا لینے والا تھا اور وہ اللہ کی جانب سے ایسی قوتوں کے مالک تھے جن کے لیے غیب کے پردے اور دوریاں ختم ہو جاتی ہیں اور یہ ایسے امور اور کرامات ہیں

۱۔ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ۱۷۴/۶

۲۔ الآلوسی، روح المعانی، ۲۰۳/۱۹

۳۔ یوسف: ۲۲/۱۲

جن کا صدور بعض اوقات خدا رسیدہ لوگوں سے ہوتا ہے اور جس کے اسرار و رموز سے عام لوگ واقف نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ عام انسان جس دنیا میں بستے ہیں اور جن اسباب کے تحت وہ زندگی گزارتے ہیں اس سے یہ مختلف زندگی ہوتی ہے۔ قطب شہید اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”وهذا الذي عنده علم من الكتاب ، كانت نفسه مهيأة بسبب ما عنده من العلم ، أن تتصل ببعض الأسرار والقوى الكونية التي تتم بها تلك الخارقة التي تمت على يده ، لأن ما عنده من علم الكتاب وصل قلبه بربه على نحو يهيئه للتلقي ، ولاستخدام ما وهبه الله من قوى وأسرار.“ [1]

یہ شخص جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ اس علم کی وجہ سے اس کا نفس اس کام کے لیے تیار تھا۔ اللہ نے بعض کائناتی راز اس شخص پر منکشف کر دیئے تھے اور یوں یہ کرامت اس کے ہاتھ سے ظاہر ہو گئی کیونکہ علم کتاب کی وجہ سے یہ شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت کو پانے والا تھا اور وہ روحانی طور پر اس کے لیے تیار تھا کہ اس پر بعض اسرار کھول دیئے جائیں۔

اللہ تعالیٰ جب کسی ایک انسان کو ان اسرار سے واقف کر دیتا ہے تو پھر دوسروں کے لیے ایک معجزہ صادر ہو جاتا ہے کیونکہ یہ معجزہ عام انسانوں کی طبیعی زندگی کے لحاظ ہوتا ہے جبکہ یہ خارق عادت معجزہ بھی اللہ ہی کی قوتوں میں سے کسی قوت کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ اس خارق عادت بات کو جس کے ہاتھ پر چاہتا ہے جاری کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

”البتہ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ کے الفاظ میں سائنسی اور ٹیکنیکل علم کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ ہو سکتا ہے انہیں کوئی ایسی ترکیب معلوم ہو جس کے ذریعے سے سائنسی طور پر ایسا کرنا ممکن ہوا ہو۔ بہر حال سائنسی نقطہ نظر سے ایسا ہونا کوئی ناممکن بات بھی نہیں ہے۔ آج سائنس جس انداز اور جس رفتار سے ترقی کر رہی ہے اس کے نتیجے میں ممکن ہے بہت جلد ایسی ٹیکنالوجی حاصل کر لی جائے جس کے ذریعے سے کسی مادی چیز کو atoms میں تحلیل کرنا اور پھر ان atoms کو چشم زدن میں دوسری جگہ منتقل کر کے ان سے اس چیز کو اسی حالت میں دوبارہ ٹھوس شکل دے دینا ممکن ہو جائے۔“ [2]

اگر جمہور مفسرین کے نزدیک وہ آصف بن برخیا ہی ہیں تو ان کی وہ صفت جس کی وجہ سے انہوں نے یہ عظیم کام کیا، اللہ تعالیٰ نے اس صفت کو ﴿ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ ﴾ فرما کر بیان فرمایا یعنی تصرف، کرامت وغیرہ تو بعد کی بات ہے لیکن اصل چیز جس کو قرآن کریم نے بیان کیا ہے وہ کتاب کا علم ہے، اس علم سے مفسرین میں سے کسی نے اسم اعظم یا دعا وغیرہ مراد لی ہے لیکن ہم سابقہ فصل میں بیان کر آئے ہیں کہ جس طرح قرآن خود حکمت کی کتاب ہے اور یہ اپنے قاری پر کماحقہ مطالعہ کرنے والے پر حکمت کا علم نچھاور کرتی ہے تو اسی طرح جس کتاب کو قرآن کریم نے الف لام کے ساتھ یعنی خاص کتاب کہا ہے وہ قرآن کریم ہے یا کوئی اور کتاب، بہر حال کوئی خاص کتاب ہے جس کے ساتھ الف لام لگایا گیا ہے، لہٰذا اس شخص نے اس کتاب کو عقل و فہم اور فکر و تدبر کے ساتھ پڑا تو اس کو اس کتاب کے ذریعے حکمت یعنی خیر کثیر عطا فرمائی گئی اور اسی حکمت ہی کے ذریعے اس نے ایک لمحہ میں بلقیس کا تخت یمن سے بیت المقدس منتقل کر دیا۔

۱۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۲۶۴۱/۵

۲۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، بیان القرآن، ۱۷۷/۴

خلاصہ

قرآن کریم کے مطابق جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا اور جو اس کی رضا اور خوشنودی کے حق دار ہوئے ان میں انبیاء علیہم السلام، صدیقین ، شہداء اور صالحین شامل ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد باقی درجات کے لوگوں کو مختلف انعامات سے نوازا گیا اور حکمت بھی ان اوصاف میں سے ایک ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے ہر صالح بندے کو حکمت کے اجزاء میں سے کچھ عطا فرما دیتا ہے لیکن حضرت لقمان علیہ السلام جو کہ نبوت کے درجے پر فائز بھی نہیں تھے لیکن پھر بھی قرآن کریم نے ان کا با قاعدہ تذکرہ کیا اور ان کے نام لے کے ان کے لیے وصف حکمت کو بیان کیا ہے۔

مفسرین کرام کے مطابق آپ علیہ السلام کو حکمت عطا کیا جانا آپ کے اخلاق حسنہ ، شکر ، تقوی، شرک سے مکمل اجتناب کا نتیجہ اور بدلہ تھا۔ آپ علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں فرمائی ان کو قرآن کریم کا حصہ بنا دیا گیا اس لیے کہ وہ سب حکمت سے لبریز تھیں۔

قرآن کریم کا حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت کے بدلے میں شکر کا حکم دینا اور پھر آپ کے نصائح ذکر کرنا بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان اوصاف کی وجہ سے حکمت عطا کر دیا جاتی ہے۔

آصف بن برخیا جن کے نام پر قدیم اور جدید مفسرین کا اتفاق ہے کہ انہوں نے ہی بلقیس کے تخت کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر کیا تھا۔ قرآن کریم میں (علم من الکتاب) کے وصف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے پاس حکمت کی وہ طاقت تھی جس کی وجہ سے اشیاء میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے تصرف کر سکتے تھے۔ لہٰذا یہ بھی قرآن کی اصطلاح (الحکمة) کے تحت اور اسی وصف کے تحت آتے ہیں۔

باب سوم

تدبیر منزل اور معاشرت میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور اس کے تفسیری اطلاقات

فصل اول: دعوت دین میں حکمت اور اس کے تفسیری اطلاقات

مبحث اول: دعوت دین میں سبیل ربك کا مفہوم

مبحث دوم: داعی کے لحاظ سے قرآنی حکمت کے مظاہر

مبحث سوم: مدعو کے لحاظ سے قرآنی حکمت کے مظاہر

فصل دوم: معاشرتی و سماجی زندگی میں حکمت اور اس کے تفسیری اطلاقات

مبحث اول: تہذیب نفس میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور اس کے تفسیری اطلاقات

مبحث دوم: تدبیر منزل میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور اس کے تفسیری اطلاقات

مبحث سوم: زوجین کے حقوق میں توازن کی حکمت کے تفسیری اطلاقات

فصل سوم: معاشرتی زندگی میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور حکمت کے تفسیری اطلاقات

مبحث اول: ذوی القربی کے حقوق اور صلہ رحمی میں حکمت اور اس کے تفسیری اطلاقات

مبحث دوم: ہمسایہ کے حقوق میں قرآنی حکمت کے تفسیری اطلاقات

فصل اول

دعوت دین میں حکمت اور اس کے تفسیری اطلاقات

مبحث اول

دعوت دین میں سبیل ربك کا مفہوم اور حکمت

انسانوں کے ذاتی مسائل سے لے کر عائلی، معاشی اور معاشرتی مسائل اور پھر اجتماعی اور ملکی مسائل کے حل کے لیے ہر شعبہ ہائے زندگی میں حکمت عملی کی ضرورت اور اہمیت تو مسلم ہے لیکن ایک ایسا کام اور حکم جو ہر ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ معروف کا حکم اور منکرات سے روکنا۔ اگرچہ قرآن کریم میں ایک مقام پر ایک خاص طبقے اور ایک خاص جماعت اس عظیم کام کے لیے ضروری قرار دی گئی لیکن خیر امت کے لقب سے واضح ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کے لیے نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا ضروری ہے۔ اس بھلائی کا حکم کس طرح اور کس کو کیا جائے اور کب کیا جائے اور کس حکمت عملی کے تحت کیا جائے۔ قرآن کریم نے اس شعبہ میں بھی حکمت کو لازم قرار دیا ہے۔ اور دعوت کے لیے پہلا اصول ہی حکمت کو قرار دیا گیا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ دعوت دین میں حکمت اور حکمت عملی کو سمجھا اور اپنایا جائے۔

سبیل ربك سے مراد

خالق کی صحیح پہچان اور اس کی معرفت ہی انسان کی پیدائش کا اصل مقصد ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے خالق کے احکام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے دعوت کے عمل کا آغاز کیا گیا، کوئی بھی انسان دنیا کی غرض اور لالچ کے لیے کسی دوسرے انسان کو مختلف اعمال اور افعال پر اکساتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ دین کی دعوت کا صحیح مقصد تب ہی ہوگا جب وہ صرف بغیر دنیوی لالچ اور حرص کے دی جائے گی۔ اور اس دعوت کا اصل مقصد بھی تب ہی پورا ہوگا جب خلوص ہوگا۔ اسی لیے قرآن کریم میں دعوت دین کے حکم کے آغاز ہی میں ﴿فی سبیل ربك﴾ کا حکم دیا گیا تاکہ کسی دنیوی جاہ و حشمت کی طرف توجہ نہ رہے اور یہی اصل حکمت ہے جس کی وجہ سے داعی اگرچہ اکیلا ہی کیوں نہ ہو۔ دعوت دین کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ٱدۡعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلۡحِكۡمَةِ وَٱلۡمَوۡعِظَةِ ٱلۡحَسَنَةِۖ وَجَٰدِلۡهُم بِٱلَّتِي هِيَ أَحۡسَنُۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعۡلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِۦۖ وَهُوَ أَعۡلَمُ بِٱلۡمُهۡتَدِينَ﴾[1]

ا۔ النحل: ۱۶/۱۲۵

(اے محبوب !) بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے اور ان سے بحث (ومناظرہ) اس انداز سے کیجیے جو بڑا پسندیدہ (اور شائستہ) ہو۔ بیشک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جو بھٹک گیا اسکے راستے سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو

قرآن کریم میں (الحكمة) کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سبیل ربك کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے جس کا مفہوم، انفرادیت اور اس کا اعجازی پہلو ذکر کرنا مناسب ہوگا۔امام رازی لکھتے ہیں:

"فالمراد به في طريق الدين، لأن السبيل هو الطريق، وسبيل الله هو دينه. فكل ما أمر الله به في دينه"[1]

"سبیل سے مراد دین کا طریق یعنی راستہ ہے۔اس لیے کہ سبیل کا معنی طریقہ ہے۔اور سبیل اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کا حکم شامل ہو وہی اس کا دین ہے (اور یہی سبیل اللہ) ہے۔"

اس اعتبار سے دین کی دعوت کا کام اور اس میں حکمت کا معنی صرف یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو توحید، رسالت، ایمانیات، نماز، روزہ، اور باقی احکام دینیہ جن کا تعلق دین کی اساسیات کے ساتھ ہے، سکھائیں جائیں یا ان کی طرف بلایا جائے بلکہ اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے میں ہر ایسا کام جس کی وجہ سے اسلامی نظام میں خلل آتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی دین اور لوگوں کی اخلاقیات میں خرابیاں پیدا ہوتی ہوں ایسے اور اس جیسے کاموں میں لوگوں کی صحیح رہنمائی کرنا ﴿سبيل ربك﴾ کے دائرے میں آئیں گے۔

اس وسیع تر مفہوم کا فائدہ انفرادیت اور اعجازی پہلو یہ ہے کہ داعی کی ذمہ داریاں بھی بڑھیں گی اور داعی کو اپنی دعوت اور مبلغ کو اپنی تبلیغ کا دائرہ وسیع کرنا ہوگا۔اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ پہلے ﴿فی سبيل ربك﴾ کا تعین کر لیا جائے اور پھر قرآن کریم کے پہلے اور اہم ترین اصول یعنی حکمت کو پیش نظر رکھا جائے، اللہ کی راہ اور اس کا طریقہ اور اس کا راستہ کون سا ہے؟ اور اس کے اندر کون کون سی چیزیں آتی ہیں؟ ان کا تعین ضروری ہے۔

امام رازی نے ﴿سبيل ربك﴾ کا ایک اور مفہوم یہ بھی لکھا ہے:

"وسميت العبادات سبيلا إلى الله تعالى من حيث إن الإنسان يسلكها، ويتوصل إلى الله تعالى بها"[2]

عبادات پر بھی سبیل ربك کا اطلاق کیا جاتا ہے اس لیے کہ سبیل اللہ سے مراد ہر ایسا طریقہ اور ہر ایسا راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی معرفت کا پتہ دلائے اور اللہ تعالیٰ سے ملانے کا ہر طور طریقہ ﴿سبيل ربك﴾ میں داخل ہے۔

---

۱ ۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۲۹۴/۵

۲ ۔ ایضاً، ۲۹۸/۵

امام رازی کے قول سے یہ بھی واضح ہوا کہ دین کی دعوت صرف عبادات تک ہی محدود نہیں بلکہ ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے ہو اس کے لیے لوگوں کو اکسانا یا قائل کرنا بھی دین کی دعوت میں شمار ہو گا چاہے وہ معاملات ہوں یا عبادات۔

قرآن کریم نے سبیل ربك کی جو اصطلاح استعمال فرمائی ہے اس سے مراد صرف دین اسلام کی دعوت نہیں ہے بلکہ دینی معاشرے میں عدل وانصاف کا قیام ، اجتماعی وانفرادی عدل ، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی، اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے ضروری اقدامات کی تگ ودو کرنا اور اسی طرح نہی عن المنکر میں رزائل اخلاق کا خاتمہ، حرام اور سود کی کاروبار سے اجتناب کرنے اور لوگوں کے مال واسباب کی حفاظت اور ان کے حقوق کے سلب ہونے سے بچانے کے اقدامات کرنے جیسے تمام احکامات کی دعوت سبیل ربك کے تحت آتی ہے لیکن یہ سب کام حکمت کے تحت کرنے ضروری ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کا تزکیہ نفس اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکامات کے بجالانے میں رضا وجزا کی خوشخبری اور نافرمانی میں اس کی پاسداری کرنے میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کی طرف سے متعین کردہ سزا کے بارے میں بتلانا بھی سبیل ربك میں داخل ہے اور یہ تمام امور سب سے پہلے قرآن کریم کے بتائے گئے اصول حکمت یعنی منصوبہ بندی اور تیار کردہ ایک خاص سکیم کے تحت کرنے ضروری ہیں۔

دین کی دعوت میں حکمت کا مفہوم اور اس کے اطلاقات

قرآن کریم کے حکم

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾[1]

تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی راہنمائی کے لیے نکالا گیا ہے۔ معروف کا حکم دیتے ہو منکر سے روکتے ہو

سے یہ ہر گز مراد نہیں ہے کہ ہر شخص اندھا دھند دین کی تبلیغ اور دعوت کی ذمہ داری لے اور اس کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن اور ناممکن کوشش کرتا رہے بلکہ دعوت میں ایک خاص طریقہ کار متعین ہے جو کہ حکمت کہلاتا ہے اور جس کے پاس یہ دولت ہے وہی اس کار خیر کو انجام دینے کی سعی کرتا ہے۔

دعوت دین میں حکمت سے مراد یہ ہے کہ دین اسلام کے بارے میں ایسے دلائل اور براہین قائم کرنا کہ جو دلائل وبراہین مخاطب کے دل میں اس بات کا یقین پیدا کر دیں کہ دین اسلام ہی حقانیت پر مبنی دین ہے اور پھر اس دین کی حقانیت بھی اس کے دل میں راسخ ہو جائے۔

۱۔ آل عمران: ۱۱۰/۳

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کی استعداد، ذہنیت، نفسانیت، حالات اور موقع و محل کو پیش نظر رکھ کر دعوت دی جائے یعنی کلام کی جائے۔

علامہ آلوسی کے مطابق دین کی دعوت کے اندر حکمت کا لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں فضائل اخلاق کے جملہ اوصاف کو اپنانا اور رزائل اخلاق سے خود کو بچانا شامل ہے۔[1]

سورۃ النحل کی آیت کریمہ

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾[2]

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو جو سب سے اچھا ہو۔

میں دعوت دین کے تین اصول بیان کیے گئے ہیں جن میں سے حکمت کو پہلے درجے پر رکھا گیا، امام سلمی[3] کے نزدیک حکمت کا تعلق قول اور بات چیت کے ساتھ بھی ہے اور اعضا انسانی جس میں عقل و قلب بھی ہے ان کو صحیح اور درست سمت اور درست فکر کی طرف لے کر جانا اور اپنی حرکات و سکنات اور اپنے قدموں کا درست استعمال یعنی کہ داعی کو کس مقام پر جانا چاہیے اور کس جگہ جانے سے اجتناب کرنا چاہیے اور کلام کس قدر اور کتنی کرنی چاہیے اور اسی طرح داعی کے عقل میں سوچ وبچار اور فکر و تدبر کا رخ اور انداز کیا ہونا چاہیے۔ ان سب کا تعلق حکمت کے ساتھ ہے اور یہی پہلا اصول ہے جس کو ترتیب کے اعتبار سے مقدم کیا گیا، امام سلمی اپنے صوفیانہ منہج کے اعتبار سے اس آیت کے مفہوم میں لکھتے ہیں کہ حکمت سے یہاں مراد یہ ہے کہ تم دعوت کا آغاز اللہ تعالیٰ کی ذات سے کرو یعنی صرف اسی کا پرچار کرو اور لوگوں کو اس طرح دعوت دو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کے دربار تک لے جاو۔ آپ نے عبداللہ رازی کا قول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

لا يكون الرجل حكيمًا حتى يكون حكيمًا فى أفعاله، حكيمًا فى أقواله، حكيمًا فى أحواله، فإنه يقال له ناطق بالحكمة، ولا يقال له حكيمًا[4]

ایک آدمی اس وقت تک حکیم نہیں ہو سکتا جب تک اپنے افعال، اقوال اور احوال میں حکیم نہ ہو ورنہ اس کی کلام میں حکمت تو ہے لیکن اس کو حکیم نہیں کہا جاسکتا۔

۱۔ الحقی، روح البیان، ۳۶۰/۷

۲۔ النحل: ۱۲۵/۱۶

۳۔ آپ کا پورا نام محمد بن الحسین بن محمد بن موسی ہے، آپ السلمی اور الازدی کے لقب سے بھی مشہور ہیں اس لیے کہ آپ کے والد قبیلہ بنوازد سے اور والدہ بنو سلیم سے تھیں، ۳۲۵ ھجری کو نیشاپور میں پیدا ہوئے، آپ کی مشہور تصانیف میں حقائق التفسیر اور طبقات الصوفیہ ہیں، اس کے علاوہ آپ کی ۲۹ سے زائد کتب کو تذکرہ ملتا ہے جو نام سے مذکور ہیں اور بعض کتب ضائع ہو گئیں، آپ کی وفات ۴۱۲ ھجری میں ہوئی۔ (ذھبی، سیر اعلام النبلاء، ۲۳۵/۳۳)

۴۔ السلمی، حقائق التفسیر، ۹۲/۵

امام رازی کے نزدیک اس آیت کریمہ میں حکمت سے مراد برہان اور قطعی دلیل سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کی دعوت دیناہے۔[1]

صوفی عبدالحمید سواتی نے پہلا حکمت کا طریقہ ان لوگوں کے لیے تجویز کیاہے جو حقائق کا علم رکھنے والے ہوتے ہیں، ان کے اندر ایسی استعداد اور خوبی ہوتی ہے کہ وہ امور کی تحت اور حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں،آپ کے نزدیک یہ پہلا اصول اور طریقہ ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے۔[2]

شیخ طوسی[3] لکھتے ہیں:

> وهو أن يدعوهم إلى أفعالهم الحسنة التي لها مدخل في استحقاق المدح والثواب عليها[4]
>
> اس سے مراد یہ ہے کہ داعی لوگوں کو ہر اس کام کی دعوت دے جو دین میں لائق تعریف ہوں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ کام ایسے ہوں جن پر انعام اور ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قبیح امور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندندہ ہیں اور مباح امور کی طرف دعوت دینے کا حکم نہیں ہے، دعوت ایک انتہائی اہم اور کٹھن مرحلہ ہے اس لیے دعوت واجب اور ندب یعنی مستحب امور میں دی جائے گی تاکہ جن کو دعوت دی جارہی ہے ان کو اس کا مکمل اجر و ثواب ملے ،آپ کے نزدیک حکمت کا تعلق مراتب، درجات اور احوال کے ساتھ اور قبیح اور احسن امور کے ساتھ ہے لہذا داعی کو ان چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

علامہ وحیدالدین خان لکھتے ہیں:

> حکمت سے مراد دلیل و برہان ہے۔ کوئی دعوتی عمل اسی وقت حقیقی دعوتی عمل ہے جب کہ وہ ایسے دلائل کے ساتھ ہو جس میں مخاطب کے ذہن کی پوری رعایت شامل ہو۔ مخاطب کے نزدیک "کسی چیز کے ثابت شدہ چیز ہونے کی جو شرائط ہیں، ان شرائط کی تکمیل کے ساتھ جو کلام کیا جائے اسی کو یہاں حکمت کا کلام کہا گیا ہے۔ جس کلام میں مخاطب کی ذہنی و فکری رعایت شامل نہ ہو وہ غیر حکیمانہ کلام ہے۔ اور ایسا کلام کسی کو داعی کا مرتبہ نہیں دے سکتا۔[5]

۱۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۲۹۴/۵

۲۔ السواتی، معالم العرفان، ۲۳۳/۹

۳۔ پورا نام محمد بن حسن بن علی الطوسی ۳۸۵ ہجری میں شہر خراسان میں پیدا ہوئے، فقہ جعفریہ میں جب شیخ کا لقب استعمال ہو تو اس سے آپ ہی کی ذات مراد ہوتی ہے۔ فقہ جعفریہ کی مستند کتب میں سے دو کتب تہذیب الاحکام اور الاستبصار فیما اختلف من الاخبار کے مؤلف شیخ طوسی ہیں، تفسیر میں آپ کی مشہور تفسیر التبیان فی تفسیر القرآن ہے، امام ذہبی نے آپ کی تصانیف کی تعداد تین سو لکھی ہے، آپ کی وفات ۴۶۰ ہجری کو ہوئی۔ (ذہبی، محمد بن احمد، سیر اعلام النبلاء، ۳۵/۳۰۴، بیروت، مؤسسہ الرسالہ ،۔)

۴۔ الطوسی، التبیان فی تفسیر القرآن، ۴۴۱/۶

۵۔ وحیدالدین خان، تذکیر القرآن، ۹۳/۴

امین احسن اصلاحی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ داعی دلائل و براھین سے بات کرے نیز داعی کو چاہیے کہ اپنے جذبے اور خیر خواہی اور ہمدردی کے ساتھ دین کی دعوت دے اسی وجہ سے اس کی بات کو غور سے سنا جائے گا اور لوگ اسی کی طرف مائل ہوتے چلے جائیں گے اور اسی سے خیر و برکت میں اضافہ ہو گا۔[1]، داعی کو چاہیے کہ منصوبہ بندی اس طرح کرے کہ پہلے سوچے کہ جس کو دعوت دی جارہی ہے یا جس کو نصیحت کی جارہی ہے وہ عمر اور مقام و مرتبہ میں کس طرح کا ہے، پڑھے لکھے آدمی کو عام دیہاتی انداز سے سمجھانے کو کوئی اثر نہیں ہو گا اسی طرح علمی اعتبار سے کم علم اور کم فہم لوگوں کو اشیاء کی معرفتوں اور حقیقتوں کا علم سمجھانے کے بجائے عام فہم انداز میں دعوت دی جائے تو سود مند ہو گا ، حکمت کا یہی تقاضا ہے کہ ان اور ان جیسی اور دوسری باتوں کو مکمل خیال اور لحاظ رکھا جائے، قرآن کریم نے اسی کو حکمت کہا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ معاشرے میں امراض اور خرابیوں کی پہچان کرلی جائے اور اس کے بعد دعوت کا کام شروع کیا جائے تبھی مرض کی مکمل تشخیص اور علاج ہو گا، دعوت دین کے اندر حکمت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ مرض کی پہچان ہونی ضروری ہے۔[۲]

گذشتہ آیت کریمہ میں حکمت کا تعلق خود دعوت دینے والے کی اپنی ذات کے ساتھ بھی ہے، یعنی اس کے اندر حکمت ہونی چاہیے اور اس سے مراد یہ ہے کہ داعی کو خوش اخلاق ہونا چاہیے تاکہ سامعین یہ محسوس نہ کریں کہ مجھے زبردستی کسی کام یا کسی امر پر ابھارا جارہا ہے جب کہ میرا دل اس پر آمادہ بھی نہیں ہے، خوش اخلاقی کا بھی ایک خاص معیار ہونا چاہیے اس لیے کہ نصیحت کرنے والے نے جس ماحول، جس جگہ یا جن افراد کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی معرفت اور اس کی راہ کی طرف بلایا ہے اگر وہ داعی کو ڈانٹ ڈپٹ یا مارنے پر تیار ہو گئے ہیں تو حکمت یہاں خاص طور پر اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ انتہائی دانش مندی اور خوش اسلوبی سے کنارہ کشی اختیار کریں۔[۳]

علامہ حنیف ندوی لکھتے ہیں :

> ”آج حضرات علماء کے اخلاق بگڑ چکے ہیں وہ تبلیغ و اشاعت کی نفسیات سے آگاہ نہیں، وہ نہیں جانتے قول بلیغ کیا ہے کس طریق سے لوگوں کو حق و صداقت کی طرف بلانا چاہیے قاعدہ ہے کہ اچھی بات بھی برے انداز میں پیش کیجئے تو لوگ ٹھکرا دیں گے اس لیے ضروری ہے کہ کلمہ حق کا اظہار کیا جائے مگر سلجھے ہوئے انداز میں جس میں زمانہ کی نفسیات کی رعایت نہ ہو۔“[۴]

ا ۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۲۲۴/۶

۲ ۔ دیکھیے: مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ۹۵/۵، سید مودودی، تفہیم القرآن، ۲۲۴/۵، الازہری، پیر محمد کرم شاہ، ضیاء القرآن، ۱۹۷/۴

۳ ۔ پانی پتی، ثناء اللہ، تفسیر مظہری، ۱۴۵/۵

۴ ۔ الندوی، سراج البیان، ۶۷۲/۳

یعنی لوگوں کی نفسیات کا بھی بخوبی پتہ ہونا چاہیے تاکہ داعی دعوت حق میں غلطی نہ کرے۔اسی طرح مخاطب کے احوال مختلف ہوتے ہیں لہٰذا مخاطب کی ہر ہر حالت پر نظر رکھ کر اس کا بنظر غائر جائزہ لے کر ان کو دین کی دعوت دی جائے تاکہ بات مکمل طریقے سے دلوں میں راسخ ہو جائے۔[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾[2]

آپ فرما دیجیئے کہ یہ میرا طریق ہے میں (لوگوں کو توحید) خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی (ف ۷) اور اللہ (شرک سے) پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

اس آیت کریمہ میں بصیرت کے معنی معرفت، علم اور یقین کے ہیں اس لیے داعی کو چاہیے کہ وہ دلیل اور حجت کے ساتھ کلام کرے۔[3] داعی کو ضرورت اس چیز کی ہے کہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام کا طریقہ دعوت پیش نظر رکھے، لوگوں کو اس طرح دعوت دے کہ ان کے لیے بصیرت اور معرفت کے راستے نہایت واضح اور آسان ہو جائیں، اور دعوت کا نتیجہ اس طرح برآمد ہو کہ لوگوں کو ذہنی اور قلبی سکون میسر آجائے اور دین اسلام کے بارے میں ان کے قلوب واذہان میں کسی قسم کو کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے اور پھر وہ بھی باقی لوگوں کو اسی یقین کے ساتھ دین کی دعوت دیں جس طرح داعی نے ان کے لیے بصیرت اور معرفت کی راہیں آسان کی تھیں۔[4]

خلاصہ

دین کی دعوت نہایت اہم اور مقدس فریضہ ہے، دعوت دینے والے کے لیے یہ بات پیش نظر رہے کہ دعوت اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی راہ کے لیے دینی ہے، اس کے دل ودماغ میں کوئی اور مقصد اور لالچ نہیں ہونی چاہیے، پھر معاشرتی اعتبار سے دعوت کا کام صرف مسجد، اور محراب اور منبر تک ہی محدود نہیں ہے اور نہ ہی صرف مسجد کے امام وخطباء کی ذمہ داری ہے، ایک عالم دین جو حکمت سے آگاہی بھی رکھتا ہو اور وقت، حالات اور رویوں کو جانچتا ہو اس کا تعلق مسجد اور منبر سے نہ بھی ہو پھر بھی وہ دین کی دعوت میں پیش پیش رہے اور اور دعوت کا کام صرف عبادات کے لیے مخصوص نہیں بلکہ معاشرتی اعتبار سے عبادات اور معاملات دینی اور دنیوی یعنی ہر اس کام اور عمل کے ساتھ

۱۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۳۰۵/۴، حقانی، تفسیر حقانی، ۱۹۹/۵

۲۔ یوسف: ۱۰۸/۱۲

۳۔ آزاد، ترجمان القرآن، ۸۸/۴

۴۔ وحید الدین، تذکیر القرآن، ۲۹۷/۵

ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت میں باعث نجات کے ساتھ ہو۔ دعوت کے حکم کی ابتداء میں ﴿سَبِيلِ رَبِّكَ﴾ کی قید کی بھی حکمت یہ ہے کہ داعی محض اللہ کی رضا کے حصول کے لیے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلائے۔ قرآن کریم کی آیت کریمہ کے ابتدائی حصہ ﴿ٱدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ﴾ سے یہی مراد ہے۔

پھر دعوت دین میں حکمت کو نہایت اہمیت حاصل ہے، اگرچہ یہ کام ایک مخصوص جماعت اور مخصوص طبقہ تک ہی محدود ہے جو دین کے علم سے بہرہ ور ہیں لیکن علماء کرام کو وقت، حالات اور معاشرے میں بسنے والے افراد کے رویوں سے بھی بخوبی آگاہی ہونی ضروری ہے۔ دین کی دعوت کے اندر حکمت اپنے اندر وسیع تر مفہوم کو سموئے ہوئے ہے۔ اس پہلی شرط کے اندر دعوت کے تینوں ارکان یعنی دعوت، داعی، مدعو شامل ہیں، داعی کو ہر ایک مرحلے پر حکمت اور دانش مندی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

مبحث دوم

داعی کے لحاظ سے قرآنی حکمت کے مظاہر

نبی کریم ﷺ کی امت کی اور بہت ساری امتیازی خصوصیات میں سے سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت دین کی دعوت ہے، اسی بناء پر یہ امت خیر امت کے لقب سے سرفراز ہوئی ہے۔ دین کی دعوت دینے والے کے لیے صرف حصول علم کی تگ ودو کافی نہیں ہے، داعی کے زعم میں یہ بات نہ ہو کہ وہ صرف علم کی وجہ سے لوگوں کے اللہ کے دین کے لیے قائل کرلے گا۔ بلکہ اس کے لیے دانش مندی اور حکمت عملی نہایت ضروری ہے، داعی کے لیے علم اور حکمت کے فرق کو جاننا ضروری ہے، علم کے ساتھ ساتھ حکمت بھی نہایت ضروری ہے۔ تاکہ دین کی دعوت کی خصوصیات اور مقاصد حاصل ہوسکیں۔

حکمت اور علم

علم اگر دعوت دین کے لیے حرف آخر ہوتا اور صرف یہی ایک سبب کافی ہوتا تو حکمت کے بجائے اللہ کی راہ کی طرف بلانے کے لیے علم کا حصول ضروری ہوتا جب کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ﴾[1]

(اے پیغمبر) لوگوں کو حکمت (اور تدبیر) سے اپنے رب کی طرف بلاؤ

علم کے اہمیت اور اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے کیوں کہ علم حکمت کے ارکان اور اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے، علم کی تعریف اہل علم کے نزدیک مختلف رہی ہے، کسی حالت، واقعہ یا کسی چیز کی موجودگی اور اس کے ہونے یا نہ ہونے کو جاننے کا نام علم ہے۔ شریعت اسلامیہ میں علم سے عموماً فقہ مراد لی جاتی ہے یعنی اسلام اور اس کے جملہ عقائد، اور احکام دینیہ کے جاننے، ان کے اُصول وفروع سے واقفیت حاصل کرنے کا نام علم ہے جب کہ اس حالت، شے یا حکم کے اندر مقصد، مصلحت اور علت کیا ہے اس کے جاننے کا نام حکمت ہے۔ ان تمام اُسباب اور ذرائع سے واقفیت حاصل کرنا جو اُسباب اور ذرائع اس چیز کی حقیقت اور اس کی مصلحت اور علت تک پہنچا دیں اس تگ ودو کا نام علم حکمت ہے۔ کسی چیز کے اندر نفع ونقصان کے پہلو کا ادارک کرلینا کہ اس کی افادیت اور اس کے نقصانات کے پہلو کون کون سے ہیں یہ علم حکمت کہلاتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس کے پاس علم ہو اس کے پاس حکمت بھی ہو لیکن جس کے پاس حکمت ہوگی اس کے پاس علم نافع ضرور ہوگا، گویا حکمت اور علم کے درمیان عموم خصوص ومطلق کی نسبت پائی جاتی ہے۔

دین کی دعوت کے اندر حکمت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ لوگوں تک اسلام کا علم اور اس کی واقفیت پہنچائی جائے اور ان احکام کے فوائد اور نقصانات، اجر وثواب اور سزا اور جزا کا علم پہنچا دیا جائے یا لوگوں کو اسلام کے جملہ عقائد صرف یاد

۱۔ النحل: ۱۶/۱۲۵

کرانے یا کتابی شکل میں پہنچا دیئے جائیں اور سمجھ لیا جائے کہ اس آیت پر عمل ہو گیا اور دین کی تبلیغ اور دعوت کا مقصد حل ہو گیا تو یہ ہماری محض خام خیالی ہو گی، حکمت کا یہ مفہوم بالکل نہیں ہے اور نہ ہی آیت مبارکہ اس چیز کی متقاضی ہے۔

جب تک علم کے ساتھ ساتھ حکمت بھی دین کی دعوت کے لیے ضروری رہی تب تک اسلام کی ترویج اور اشاعت اور اسلام کا غلبہ ہوتا رہا، لیکن جب حکمت کو نظر انداز کر کے اور اس کو غیر ضروری خیال کر کے علم ہی کو حرف آخر سمجھ کر میدان میں آئے گو دعوت موثر نہ رہی، تاثیرات ختم ہو گئیں اور یہ لوگوں نے یہی اُصول مد نظر رکھا کہ صرف علم حاصل کر لینے کے فورا بعد جماعت بندی کر کے دین کی تبلیغ اور اس کی دعوت کا کام شروع کیا جائے اور حکمت نام کی کسی چیز کو کوئی عمل دخل روانہ رکھا جائے تو اس تناظر میں دین کی دعوت محض رسم بن کر رہ گئی اور حکمت کو پس پشت ڈال کر صرف علم دین کو دوسروں تک پہنچا دینے کا نام تبلیغ اور دعوت رکھ دیا گیا۔ جس کے نتائج اچھے ظاہر نہیں ہوئے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾[1]

اور ہمارے ذمے تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت کو ابلاغ کے نام سے ذکر فرمایا اور اس کا نام ابلاغ رکھا اور مزید یہ کہ مبین کہہ کر یہ سمجھایا گیا کہ پیغام بھی واضح اور غیر مبہم ہونا چاہیے جیسا سورۃ ابراھیم میں ارشاد ہوا:

﴿هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾[2]

(یہ (قرآن) لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے تاکہ اس کے ذریعے انھیں خبردار کر دیا جائے اور تاکہ وہ جان لیں کہ صرف وہی ایک معبود ہے تاکہ عقلمند لوگ اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

تبلیغ کے عمل کو سورۃ الشوریٰ میں اس طرح واضح کیا گیا:

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَإِنَّ الْإِنسَانَ كَفُورٌ﴾[3]

پس اگر وہ اعراض کریں تو ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا، آپ پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، اور ہم جب انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر اترانے لگتا ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت پہنچتی ہے اس کے اعمال کی پاداش میں تو وہ ناشکرا بن جاتا ہے

بلاغ کا معنی ابن عاشور نے یوں لکھا ہے:

۱۔ یٰسین: ۱۷/۳۶

۲۔ ابراھیم: ۵۲/۱۴

۳۔ الشوریٰ: ۴۸/۴۲

"البلاغ الواضح دلالة وهو الذي لا إيهام فيه ولا مواربة"[1]

ایک ایسا واضح بیان جس میں کسی قسم کا ابہام یا قابل فساد اور قابل صراحت پہلو نہ ہو۔

ابن عاشور کے نزدیک مبلغین لوگوں کو یہ باور کروائیں کہ ان کے ایمان سے خود ان داعی کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لوگوں کے سامنے واضح اعلان کر دیں کہ شرک اور اس جیسی اور خرافات سے ہم بری ہیں، آپ مزید لکھتے ہیں:

"وذلك من شأنه أن يثير النظر الفكري في نفوس القوم"[2]

اگر بلاغ مبین اس طرح ہوئی لوگوں کے افکار تبدیل ہوں گے۔

یعنی وہ لوگ جن کو دعوت دین دی جا رہی ہے۔ یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ نہ جانے ہم پر دعوت دینے والے کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں، داعی کے اس عمل سے لوگوں کے افکار میں مثبت تبدیلی آئے گی اور ان کے دل و دماغ فکر وتدبر کی طرف مائل ہوگا۔ اور یہی بلاغ مبین کا مقصد ہے۔

دین کی تبلیغ کے لیے ایسا نظام ہو جس پر واقعتاً قرآن کریم کی اصطلاح (ابلاغ) صادق ہوتی ہے اور دوسرا یہ بھی کہ ابلاغی نظام کے لیے مبین ہونے کی شرط کو قرآن کریم نے ضروری قرار دیا اور اس طرح ابلاغ میں وضاحت اور صراحت ہو۔ ہر ایسا قول و عمل سے اجتناب ضروری ہے جس میں اسلام کی دعوت دیتے وقت یا پہنچاتے وقت لوگوں کے دلوں میں کوئی قباحت، ابہام یا تشنگی کی کسی صورت کا باقی رہ جانا پایا جاتا ہو۔ جو دعوت ایسی ہوگی جس میں وضاحت اور صراحت ہوگی اور کسی کے لیے ابہام باقی نہ رکھے گی، وہی بلاغ مبین قرار پائے گی۔ وگرنہ تعلیم اور تعلم کا سلسلہ اور عمل اور مقصد تو پورا ہو جائے گا مگر تبلیغ کا عمل ادھورا رہ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات دوسروں تک پہنچانے کے لیے حکمت کا استعمال ہوگا تو ہر بات قلب واذہاں پر اثر کرے گی اور پھر ہی اس پر بلاغ مبین صادق آئے گی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾[3]

کہہ دیجیے! یہ ہے میری راہ، میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ۔ میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ تعالیٰ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔

امام رازی لکھتے ہیں:

"لأن كل من ذكر الحجة وأجاب عن الشبهة فقد دعا بمقدار وسعه إلى الله وهذا يدل على أن الدعاء إلى الله تعالى إنما يحسن ويجوز مع هذا الشرط وهو أن يكون على بصيرة مما يقول وعلى هدى ويقين، فإن لم يكن كذلك فهو محض الغرور"[4]

۱۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۳۶۲/۲۲

۲۔ ایضاً، ۳۶۲/۲۲

۳۔ یوسف: ۱۰۸/۱۲

۴۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۵۲۰/۱۸

جس شخص نے بھی دین اسلام کی دعوت دلائل کے ساتھ دی اور مخاطب کے شکوک وشبہات دور کیے گویا اس نے اپنی بساط اور طاقت کے مطابق اللہ کے دین کی طرف بلایا اور دعوت دین یقیناً ایک احسن اور بہترین کام ہے لیکن اس کے خوبی اور کمال ان شرائط کے ساتھ وابستہ ہے کہ دعوت دینے والا جو کلام کر رہا ہے وہ حکمت وبصیرت پر مشتمل ہو اور اس کا کلام ہدایت اور یقین سے مزین ہونا چاہیے، اگر داعی کے پاس (حکمت وبصیرت، ہدایت اور یقین) نہیں ہے تو اس کی دعوت سوائے غرور اور دھوکے کے کچھ نہیں ہے۔

سورۃ النحل کی آیت کریمہ ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ﴾[1] جس سے ہمارے مرکزی مضمون کا تعلق ہے اگر اس کے سیاق وسباق کا مختصر سا جائزہ لیں تو واضح ہو جائے گا کہ اس آیت کریمہ سے پہلے حضرت ابراھیم علیہ السلام کی اوصاف گنوائے جا رہے ہیں جن میں وہ اپنی ذات میں ایک امت تھے، اللہ تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں یکسو، شرک سے مبرہ ومنزہ، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کرنے والے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت اور نبوت کے لیے منتخب فرمالیا، دنیا اور آخرت کی بھلائیاں عطا ہوئی اور آخرت میں اعلیٰ درجات والے بندوں میں ہوں گے اور پھر یہ صفات اور فضائل ختم ہوئے تو متصل بعد اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مخاطب فرمایا کہ پھر آپ ﷺ کی طرف پیغام بھیجا گیا کہ ابراھیم علیہ السلام کی ملت کی پیروی کریں جو اللہ کی اطاعت اور اس کی محبت میں بلا شرکت غیر یکسو تھے اور وہ شرک سے مکمل طور پر پاک تھے۔

اس کے بعد آیت کریمہ ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ﴾[2] کا ذکر کیا گیا، جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ فرمایا گیا کہ جس طرح ابراھیم علیہ السلام نے کسی مخصوص گروہ، طبقے یا کسی خاص قوم، مسلک یا مکتبہ فکر کے لوگوں کو تبلیغ نہیں کی اسی طرح آپ ﷺ پر آپ ﷺ کے بعد آنے والی آپ ﷺ کی امت پر یہ ضروری ہے کہ دعوت دین کا کام یا تبلیغ کا کام مسلک، مکاتب فکر اور گروہی تعصب سے آزاد ہو کر کریں اور جس طرح ابراھیم علیہ السلام دین اسلام کے پیروکار تھے اور ان کا جھکاؤ ذرا برابر بھی عیسائیت، یہودیت اور مشرکوں کی طرف نہیں تھا اسی طرح آپ ﷺ حکمت کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی کی پیروی کیے بغیر دین اسلام کی طرف دعوت دیں۔

تکلم کے مختلف پہلو

اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف دعوت دینے والا چونکہ دعوت کے لیے سب سے پہلے عملی طور پر زبان کا استعمال کرے گا تو اس سلسلے میں یہ بات حکمت کا پہلوؤں میں سے ایک ہے کہ مبلغ اور داعی کو یہ چاہیے کہ وہ زبان کے استعمال میں حکمت کو اس طرح پیش نظر رکھے کہ جو باتیں اس نے لوگوں کے سامنے پیش کرنی ہیں ان کی ترتیب اور ان کا انداز اور اسلوب حکمت پر مبنی ہونا چاہیے، جو باتیں داعی کو پہلے بیان کرنی چاہیے ان کو آخر میں بیان کرنا حکمت کے خلاف ہوگا لہذا اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ پہلے نمبر پر کس بات کو کس انداز میں بیان کرنا چاہیے اسی طرح ترتیب وار باتوں

۱۔ النحل: ۱۲۵/۱۶

۲۔ النحل: ۱۲۵/۱۶

کو خیال رکھنا ضروری ہے۔ داعی کے لیے ضروری ہے کہ دین کی دعوت میں غیر ضروری تمہیدی گفتگو سے اجتناب کرے تاکہ مخاطبین اکتانہ جائیں اور ان کو دین کی دعوت ایک بوجھ محسوس نہ ہونے لگے۔

قرآن کریم میں داعی کے لیے انداز گفتگو اور بات کرنے کا جو سلیقہ بتایا گیا اس میں ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ﴾[1] اور ﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ﴾[2] اور ﴿وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ﴾[3] جیسے آداب شامل ہیں۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام دین کی دعوت کا آغاز کرتے ہوئے اپنی قوم سے مخاطب ہوئے:

﴿وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ﴾[4]

اور اس کی قوم' اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے جواب دیا: کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ درآنحالیکہ اس نے میری رہنمائی فرمائی اور میں ان سے نہیں ڈرتا' جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔ مگر یہ کہ کوئی بات میرا رب ہی چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ تو کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے؟

حضرت ابراھیم علیہ السلام نے کسی خوف اور ڈر کے بغیر قوم کو شرک سے ڈرایا اور نہایت نرم انداز میں تبلیغ فرمائی ،آپ علیہ السلام نے لوگوں کو امن کی طرف مائل کرنے کے لیے فرمایا:

﴿فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾[5]

تو ہم دونوں گروہوں میں سے امن واطمینان کا زیادہ سزاوار کون ہے اگر تم جانتے ہو؟

امام طبری اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ولم يستوحش من قِيل الحقّ والثبات عليه, مع خلاف جميع قومه لقوله، وإنكارهم إياه عليه"[6]

آپ نے حق بات کہنے اور اس پر ثابت قدم رہنے میں کسی سے نہیں ڈرے باوجود کے قوم آپ کی تبلیغ کے بھی خلاف تھی اور آپ کے ذات کی بھی منکر تھی۔

آپ نے بطور داعی ادب اور حکمت کے پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے شرک کی نفی پہلے اس طرف فرمائی کہ اس عمل کو کیوں جائز قرار دے رہے ہو جس کو کوئی سند آسمان سے نہیں اتاری گئی۔ یقیناً یہ بہت حکمت بھری نصیحت

۱۔ البقرہ: ۲/۲۶۳

۲۔ طٰہٰ: ۲۰/۴۴

۳۔ لقمان: ۳۱/۱۹

۴۔ الانعام: ۶/۸۰

۵۔ الانعام: ۶/۸۱

۶۔ الطبری، جامع البیان، ۴/۲۸۴

فرمائی گئی۔ دوسری آپ نے اسم تفضیل[1] کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو حق بات کی جانب متوجہ کیا تاکہ قوم کے اندر تکبر، غرور اور خدائی کا جھوٹا دعویٰ اچھے طریقے سے باطل ہو سکے۔[2]

اخلاص کی اہمیت اور حکمت

ضروری ہے کہ داعی دعوت کے عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خالص رہے، اس لیے دین کی دعوت میں حضرت ہود علیہ السلام کا قول قرآن کریم میں اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾[3]

اے میری قوم کے لوگو! میں اس پر تم سے کسی معاوضے کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو بس اسی کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو کیا تم سمجھتے نہیں۔

عبدالرحمٰن السعدی لکھتے ہیں:

"فهم ليسوا يَدْعُون الخَلق طَمَعًا فيما يُصِيبُهم منهم من الأموال، وإنما يَدْعُون نصحا لهم، وتحصيلا لمصالحهم"[4]

انبیائے کرام (علیہ السلام) کی طرف سے لوگوں کو دعوت دینے میں یہ لالچ نہیں ہوتا کہ انہیں لوگوں کی طرف سے مال و دولت حاصل ہوگا۔ وہ تو صرف خیر خواہی اور ان کے اپنے فائدے کی خاطر ان کو دعوت دیتے ہیں۔

تو داعی کو ہر لالچ، حرص اور طمع سے آزاد ہو کر خلوص نیت سے دعوت دینی ہوگی، اسی لیے انبیاء کرام علیہم السلام کا دعوتی خلوص قرآن کریم میں بار بار[5] ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہی حکمتِ قرآنی کا تقاضا بھی ہے۔

دعوتِ دین میں علم کی اہمیت

مسلم معاشرے میں داعی کو انداز گفتگو اس طرح کرنا چاہیے کہ واضح ہو جائے کہ مسلمان دین کی بنیادی باتوں سے آشنا ہیں، اس طرح بات کرنا کہ مسلمان اپنے آپ کو غیر مسلم تصور کرنے لگیں تو بات دل میں بیٹھنے کے بجائے دلوں پر بوجھ بننی شروع ہو جائے گی۔ اس لیے کہ مسلم معاشرہ میں مسلمانوں سے صرف سستی اور کاہلی کی وجہ سے دین سے دوری ہے، بات چیت سے یہ احساس نہ دلایا جائے کہ ان کے معاملات غیر مسلموں جیسے ہیں یا ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں یا وہ اسلام کے بارے میں سرے سے کچھ بھی نہیں جانتے۔

۱۔ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ

۲۔ السعدی، عبدالرحمٰن بن ناصر، تفسیر السعدی، ۵۵۶/۲

۳۔ ھود: ۵۱/۱۱

۴۔ السعدی، عبدالرحمٰن بن ناصر، تفسیر السعدی، ۵۵۶/۲

۵۔ وَ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مفتی احمد یار[1] لکھتے ہیں :

گناہوں کے پے در پے ارتکاب کی وجہ سے دل سیاہ ہو گئے ، غفلت کے پردے پڑ گئے اور نفسانی خواہشات کی غلبے کی وجہ سے برائیوں کا غلبہ ہو گیا اس وجہ سے داعی کو گفتگو کے دوران یہ بتانا چاہیے کہ ان کاموں میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے اور ان اِمور کے بجالانے سے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں میں شامل کرلیا کرتا ہے۔[2]

قرآنی حکمت بھی داعی سے اسی بات اور اسی عمل کا تقاضا کرتی ہے۔

قول و عمل میں مطابقت

مبلغ اور داعی جب تک اپنے زبان اور بیان میں مطابقت پیدا نہیں کرتے تب تک ان کی تبلیغ اور دعوت بے جان ہوتی ہے، لوگ قول کے ساتھ ساتھ کردار کو بھی پرکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کا دعوتی اِسلوب قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا:

﴿وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ﴾[3]

اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میں اس طرح تمہاری مخالفت کروں کہ جن کاموں سے روکتا ہوں انہیں خود کرنے لگوں۔

امام بغوی نے لکھا کہ بطور داعی میرے لیے یہ مناسب نہیں کہ میں کسی کام سے تم کو روکوں اور پھر اس کا خود ہی ارتکاب کرلوں۔[4] امام ابن کثیر نے بھی داعی کے لیے قول اور فعل میں مطابقت کی شرط کو ضروری لکھا ہے۔ قرآن کریم کی آیت کریمہ :

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾[5]

اور اس شخص سے بات کا اچھا کون ہو سکتا ہے جو خدا کی طرف بلائے اور عمل نیک کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

۱۔ مفتی احمد یار خان بن محمد یار خان کا شجرۂ نسب حضرت بنیامین بن یعقوب تک پہنچتا ہے، آپ ۱۳۱۱ ھجری کو بھارت کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئے، آپ کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد ۳۲ کے قریب ہے جن میں چھوٹے رسائل بھی شامل ہیں، مشہور تصانیف تفسیر نعیمی گیارہویں پارہ تک، مشکوۃ المصابیح کی شرح مراۃ المناجیح ہیں۔ غیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد ۶ ہے۔ آپ ۱۳۹۱ ھجری بمطابق ۱۹۷۱ عیسوی کو فوت ہوئے۔

۲ ۔ نعیمی، نور العرفان، ۱۶۷/۴

۳ ۔ ھود: ۸۸/۱۱

۴ ۔ البغوی، معالم التنزیل، ۲۴۴/۳

۵ ۔ ھود: ۸۸/۱۱

”هو فِي نَفْسِهِ مُهْتَدٍ بِمَا يَقُولُهُ فَنَفْعُهُ لِنَفْسِهِ وَلِغَيْرِهِ لَازِمٌ وَمُتَعَدٍ وَلَيْسَ هُوَ مِنَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا يَأْتُونَهُ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيَأْتُونَهُ بَلْ يَأْتَمِرُ بِالْخَيْرِ وَيَتْرُكُ الشَّرَّ وَيَدْعُو الْخَلْقَ إِلَى الْخَالِقِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى“[1]

جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلائے اور خود بھی نیکی کرے اسلام قبول کرے اس سے زیادہ اچھی بات اور کس کی ہو گی ؟ یہ ہے جس نے اپنے تئیں نفع پہنچایا اور خلق اللہ کو بھی اپنی ذات سے نفع پہنچایا۔ یہ ان میں نہیں جو منہ کے بڑے باتونی ہوتے ہیں جو دوسروں کو کہتے تو ہیں مگر خود نہیں کرتے یہ تو خود بھی کرتا ہے اور دوسروں سے بھی کہتا ہے۔

دلوں میں بات راسخ کرنے کے لیے سلیقہ مندی

تبلیغ کا مقصد دلوں کے اندر بات کو پہنچانا ہے، دعوت اور تبلیغ میں محض تقریر اور گفتگو حکمت کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اس انداز سے بات کریں کہ وہ اثر انگیز ہو، قرآن کریم داعی سے اسی حکمت کا تقاضا کرتا ہے۔ سورۃ النحل کی آیت کریمہ [2] کے تحت علامہ خازن لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے اعتبار سے دعوت کے مختلف مراتب [3] بیان کیے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ داعی ایسا ذہین اور قابل ہو کہ :

”يُدعى بطريق الحكمة؛ يعني بالدلائل القطعية اليقينية حتى يعلم الأشياء بحقائقها“

داعی قطعی دلائل کے ساتھ دعوت دے اس اعتبار سے کہ وہ وقت اور زمانے اور معاشرے کے حالات اور واقعات اور حقائق کو جاننے اور پہنچاننے والا ہو۔

داعی کے ساتھ حکمت کے تعلق یہ بھی ہے کہ اس کے الفاظ میں کتنا اثر اور گہرائی ہے۔ داعی کو بات کرنے اور بات پہنچانے کے فرق کا پتہ ہونا چاہیے۔ حکمت کا تقاضا ہے کہ اس سلیقے اور ہنر مندی سے بات کی جائے تو دل میں اتر جائے اور یہ صرف علم سے نہیں بلکہ حکمت اور حکمت عملی سے حاصل ہو گا۔

داعی کا لب ولہجہ

داعی کا لب ولہجہ انتہائی نرم اور گفتگو میں کسی کی بھی دل آزاری نہیں ہونی چاہیے۔ بغیر کسی پر لعن وطعن کرنے اور سب وشتم کرنے کے آسان پیرائے میں دعوت کے الفاظ ادا کرنے چاہیے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے کے حکم سے جب ہدہد نے آپ کا نامہ مبارک ملکہ بلقیس کے تخت پر ڈالا تو ملکہ بلقیس نے اپنے درباریوں سے اس خط کا نہ صرف ذکر کیا بلکہ اس خط کو عزت والا خط فرمایا:

۱۔ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ۱۶۴/۷

۲۔ النحل: ۱۲۵/۱۶

۳۔ حکمت، موعظت حسنہ، احسن طریقے سے گفت وشنید

﴿قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ إِنِّي أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيمٌ﴾[1]

کہنے لگی اے دربار والو! میرے پاس ڈالا گیا ایک خط عزت کا وہ خط ہے۔

ملکہ بلقیس نے اس خط کو عزت و توقیر والا خط کیوں قرار دیا، علامہ قرطبیؒ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وَصَفَتْهُ بِذَلِكَ، لِمَا تَضَمَّنَ مِنْ لِينِ الْقَوْلِ وَالْمَوْعِظَةِ فِي الدُّعَاءِ إِلَى عِبَادَةِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَحُسْنِ الِاسْتِعْطَافِ وَالِاسْتِلْطَافِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَتَضَمَّنَ سَبًّا وَلَا لَعْنًا، وَلَا مَا يُغَيِّرُ النَّفْسَ، وَمِنْ غَيْرِ كَلَامٍ نَازِلٍ وَلَا مُسْتَغْلَقٍ، عَلَى عَادَةِ الرُّسُلِ فِي الدُّعَاءِ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ"[2]

اس نے خط کی یہ صفت اس لیے ذکر کی کیونکہ اس میں نرم گفتگو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف دعوت کی نصیحت تھی اس میں شفقت اور لطف و مہربانی تھی اس میں سب ولعن وغیرہ نہیں تھا۔ نہ وہ کوئی ایسی چیز تھی جو نفس میں تغیر پیدا کرے نہ وہ درجہ سے گری ہوئی تھی اور نہ ہی اس میں پیچیدگی تھی۔ جس طرح رسولوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

دعوت چاہے زبان کے ذریعے ہو، قلم، اشارے یا کنایۃ ہو داعی کو ہر حال میں نرم لب ولہجہ اختیار کرنا چاہیے، ضروری نہیں کہ ہر مقام پر دعوت زبان کے ذریعے ہو، پرنٹ میڈیا اور گنگے اور بہرے لوگوں کے لیے بھی دعوت کا یہی اسلوب اور طریقہ ہے کہ داعی بات کرنے، لکھنے اور اشارہ کرنے میں آداب کا خاص خیال رکھے، انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کا ہر طرح سے یہی طریقہ کار رہا ہے اور یہ قرآنی حکمت کا تقاضا بھی ہے۔

داعی اکثر اوقات ایک بات کرتا ہے اور اس کو بار بار دہرانے کے بجائے کسی اور بات کی طرف اپنی کلام کو پھیر لیتا ہے، مسلم معاشروں کا یہ حال ہے کہ زیادہ تر لوگ عہدوں اور دولت کے نشے میں لت پت ہوتے ہیں۔ امراء کا حال یہ ہے کہ داعی کا پیغام ان تک پہنچا لیکن کچھ دیر بعد دولت کا نشہ سوار ہوا تو ان کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔ مسلم معاشرے میں دعوت دین میں حکمت کا قدیم تصور یہ تھا کہ ایک بار اللہ کے دین کا پیغام پہنچا دیا تو لوگوں اللہ کے خوف سے دین کی طرف پھیر گئے اور لوگوں کی زندگیاں تقویٰ اور حسن اخلاق سے پُر ہو گئیں لیکن اب حالات بدل گئے ہیں داعی کو نئے حکمت عملی سے اسلام کا پیغام پہنچانا ہوگا، لوگوں کے دلوں کا حال اب وہ نہیں ہے جو دو یا تین صدیاں پہلے تھا، اب مسلمان کے دل میں آخرت کا تصور اور روز محشر کئے گئے اعمال کی جواب دہی کا تصور سرے سے مٹتا جا رہا ہے، سکول کی ایسی تعلیم جس میں صرف مادیت پرستی ہو۔ قیامت اور نامۂ اعمال کا تصور تک نہ ہو۔ اس کے علاوہ اخبارات، فلمیں اور روز مرہ کے مشاغل سے یہ بات کسی مسلمان سے بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ہمارے کاموں اور طور و طریقوں سے بالکل یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایسے شخص کی زندگی ہے جس نے ایک اور جہان میں اس کا جواب بھی دینا ہے، اسلامی معاشرے میں کسی جگہ پر داعی کو اللہ تعالیٰ کی رضا، اخلاص، آخرت کا خوف اور اس پر یقینی

۱۔ النمل: ۲۹/۲۷

۲۔ القرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۱۹۰/۱۳

کیفیات اور دین اسلام پر وارفتگی سے عمل درآمد کی کیفیت نہیں ملے گی۔ لوگ زبان سے اللہ تعالیٰ کے انکار، اور آخرت کو جھٹلانے کی جرات نہیں کرتے لیکن ان کے اعمال کو اگر زبان عطا کر دی جائے یا داعی ان کے اعمال کی طرف نظر کرے تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک اسلامی معاشرہ نہیں ہے اور اس میں بسنے والے یا تو ایسے ہیں جیسا کہ کچھ دن پہلے مسلمان ہوئے یا ایسے کہ جو اسلام کی بنیادی عقائد اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو بالکل بھلا کر دنیا کے کاموں میں مصروف عمل ہیں۔[1]

مسلمان کی اس طرح کی زندگی اور ایسے معاملات میں اس کی زندگی پر اسلام کے پاکیزہ عقائد اور ایمانیات کا اثر اور اس کی برکتیں بالکل ختم ہو کر رہ گئیں ہیں، لہذا داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلوب اور وہ طریقہ اختیار کرے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا۔

علامہ قطب شہید کے مطابق انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کے دلوں میں پہلے خدا پر ایمان کو راسخ کیا اور توحید کی شرائط اور اس کے آداب بتلائے اور توحید کا اصل مطلب سمجھایا، لوگوں کو آخرت سے بے خوفی اور اس سے بے نیازی کے نقصانات سے آگاہ فرمایا اور پھر رسالت پر ایمان رکھنے کی تلقین فرمائی۔ اس طرح انبیاء علیہم السلام نے اسلامی زندگی کی تعمیر فرمائی لہذا داعی کو اسی حکمت عملی کے تحت از سر نو کام کرنا ہوگا۔ داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے متعلق لوگوں کے ذہنوں اور ان کے قلوب کو پوری طرح مطمئن کرے جب تک ان کے فیصلے اور ایمان میں قوت پیدا نہ ہوگی ان کے لیے زندگی میں توحید کے تقاضوں کو پورا کرنا آسان نہیں ہوگا۔[2]

داعی کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت میں تکرار کو ملحوظ خاطر رکھے یعنی لوگوں کو دلوں میں دین اسلام راسخ کرنے کے لیے گفتگو میں بھی بار بار دلائل اور تدبر و تفکر کی بھی تلقین کرے اسی طرح لوگوں کے دلوں میں توحید کا عقیدہ مضبوط اور راسخ ہوگا۔[3]

دین اسلامی کی ترویج واشاعت اور بے عمل مسلمانوں سے لے کے نو مسلم اور غیر مسلم معاشروں تک اسلام کی تبلیغ کے لیے حکمت اور دانش مندی بہت ضروری ہے، انسانوں کے عقلی معیار، سوچ، فکر اور سمجھ کے زاویے مختلف ہونے کی وجہ سے اور حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق نہایت اعلی حکمت عملی سے اسلام کی تبلیغ ضروری ہے۔
قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف بلانے کے لیے جس تدبیر اور حکمت کی بات کرتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کو اتنی جلد بازی، سختی اور زور و تکرار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف نہ بلایا جائے بلکہ اس کے لیے پہلے اچھے طریقے سے تدبیر اور پلاننگ کی جائے، پھر جو بات داعی نے کرنی ہے اس کو انتہائی سنجیدگی اور باوقار

۱۔ دیکھیے: الازہری، ضیاء القرآن، ۴/۱۰۴

۲۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۹۵/۵

۳۔ دیکھیے: ماجدی، تفسیر ماجدی، ۲۰۶/۳

طریقے سے کرے اور بات عام فہم انداز میں کرے اور اس کے دلائل بھی عام فہم انداز میں بیان کرے ایسا انداز اور ایسے دلائل کے مخاطب متاثر ہو جائے۔ پھر حکمت سے یہ بھی مراد ہے کہ دعوت دینے والے کا موقف تلخ اور سخت نہ ہو، اس کے لب ولہجہ میں متانت، نرمی، حلم اور اس کے الفاظ شیریں ہوں۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو جب فرعون کے دربار میں بھیجا گیا تو ارشاد ہوا:

﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ﴾[1]

اس کے لیے نرم بات کہنا شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔

اس آیت سے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کے اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے۔ دعوت دین میں زبان اور ادب کا بہت بڑا تعلق ہے۔ داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ زبان وادب کا بہترین استعمال جانتا ہو۔ پھر حکمت اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ دعوت دینے والا زبان اور لب ولہجہ کی سختی سے پرہیز کرے۔ مزید یہ کہ مخاطب اگر اشتعال پر اتر آئے تو داعی کے لیے ضروری ہے کہ انتہائی حکیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے صبر اور برداشت سے کام لے، دعوت دین کے وقت شخصیات کو زیر بحث لانے سے اجتناب کرے جیسا کہ فرعون نے آپ علیہ السلام کو قرون اولی کی شخصیات کی بحث میں الجھانا چاہا تھا:

﴿قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ﴾[2]

تو آپ علیہ السلام نے جوابا فرمایا:

﴿قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى﴾[3]

خلاصہ

قرآن کریم جس شخص سے دین کی دعوت دینے کا مطالبہ کرتا ہے اس کے ظاہری و باطنی کردار کی بھی اصلاح کرتا ہے۔ ایک شخص جو دین کی تبلیغ کے لیے تگ ودو کرتا ہے اس کے لیے اس عظیم کام کے مقاصد، شرائط اور لوازمات کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ علم، بصیرت، حکمت، لب ولہجہ، کردار اور قرآنی آیات میں تفکر، تدبر کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے اور ان قوتوں اور صلاحیتوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنی چاہیے۔ اسی طرح نماز اور صبر ورضا سے مدد حاصل کرنی چاہیے، داعی کو خوب اندازہ ہونا چاہیے کہ کون سا وقت، کون سے بات اور کس قسم کی گفتگو کب اور کس کے ساتھ اور کہاں کرنی ہے، داعی کو خوب غور وفکر کرنے حالات کے تناظر سے باخبر رہنا چاہیے۔ قرآن کریم داعی سے بھی حکمت کے تمام پہلوؤں کا مطالبہ کرتا ہے اس لیے داعی کو حکمت کے تمام ارکان، اس کے اِجزاء اور اس کے اقسام کو مد نظر رکھنا ہوگا۔ تاکہ حکمت سے کام لے کر وہ دین کی تبلیغ اور دعوت کا کام کر سکے۔

۱۔ طٰہٰ:۴۴/۲۰

۲۔ طٰہٰ:۵۱/۲۰

۳۔ طٰہٰ:۵۲/۲۰

مبحث سوم

مدعو کے لحاظ سے قرآنی حکمت کے مظاہر

دعوت دینے والے کے لیے سب سے بنیادی اور پہلی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ قرآن کریم کے پیغام لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس لیے کہ اسی قرآن کریم کے ذریعے اہل مکہ کے دل اسلام کی جانب مائل ہوئے، اہل عرب کی نفسیات کے مطابق قرآن کریم نے ان کے دلوں کو فتح کیا، اگرچہ ہر ایک کے مزاج اور نفسیات میں فرق ہوتا ہے مگر قرآن کریم کے ذریعے ہی ان کی مختلف نفسیات کے پیش نظر مختلف زاویوں سے اسلام کی دعوت ملتی رہی۔ کچھ آیات میں بشارت اور کچھ میں وعید اور کچھ میں قصص اور کچھ میں کائنات میں غور و فکر کرنے کی ترغیب دی گئی، اس کا اصل مقصد ان انسانوں کی مختلف نفسیات کو اسلام کی جانب مائل کرنا تھا جن کی نفسیات اور مزاج جدا جدا ہیں۔ قطب شہید قرآن کریم کے ذریعے نفسیات انسانی کو بدلنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"تارة يواجهها بالرجاء الصبوح والأمل الندي الذي يهتف لها ويناجيها. وتارة يتخلل مساربها ودروبها ومنحنياتها فيلقي عليها الأضواء التي تكشفها لذاتها فترى ما يجري في داخلها رأي العين ، --- يطلع عليها قارئ القرآن ، وهو يتبع تلك المعركة الطويلة ، وذلك العلاج البطيء. ويرى كيف انتصر القرآن على الجاهلية في تلك النفوس العصية العنيدة."[1]

قرآن قاری کو امید کی ایک کرن عطا کرتا ہے، جس سے انسانی شعور میں روشنی اور صبح نو اور تروتازہ فضا کی امید پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی انداز یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسانی مغیبات کی پیچیدہ وادیوں اور اس کے اندرونی نشیب و فراز میں اتر جاتا ہے اور انسان کی داخلی کیفیات کو ایک منظر کی شکل عطا کر دیتا ہے اس طرح کہ انسان اس منظر کو دیکھ کر شرمندگی محسوس کرتا ہے کہ یہ تو میرا راز افشا ہو گیا۔ غرض قرآن کریم میں سینکڑوں تنبیہات، سینکڑوں پکاریں، سینکڑوں دلائل ہیں، جو تلاوت قرآن کے دوران سامنے آتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ قرآن اس فکری اور شعوری میدان جنگ کی کشمکش برپا کیے ہوئے ہے۔ غرض یہ طویل مسلسل اور پیہم جدوجہد قرآن نے جاری رکھی اور عربوں جیسے معاند دلوں کو شکست دے دی۔

داعی اور مدعو دونوں کی تربیت کے لیے قرآن کریم کی تعلیمات محور و مرکز ہیں، عبدالحمید سواتی لکھتے ہیں:

"بہر حال اجتماعی طور پر اصلاح نفس اور اصلاح ناس کا فریضہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب قرآن پاک کو اپنی فکر کا مرکز بنالیا جائے۔ جب لوگ قرآن حکیم کی باریکیوں کو سمجھنے لگیں گے تو پھر اپنی اصلاح بھی کر سکیں گے اور دوسرے لوگوں کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔"[2]

مدعو کے مزاج اور اس کی نفسیات کو قرآن کریم کے ذریعے فتح کرنا ہی بہترین حکمت ہے اور داعی کو اسی اسلوب کا اختیار کرنا چاہیے، قرآن کریم نے بھی مدعو کی تین اقسام بیان کی ہیں:

۱۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۳۶۹۳/۶

۲۔ سواتی، معالم العرفان، ۱۹۳/۲

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ﴾[1]

پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جن کو اپنے بندوں میں سے منتخب کیا۔ پس ان میں سے کچھ تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں، کچھ ان میں سے میانہ رو ہیں اور کچھ ان میں سے اللہ کی توفیق سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ یہی سب سے بڑا فضل ہے۔

اس آیت کریمہ میں تین گروہوں کو دعوت دین کے قبول کرنے کی صلاحتیوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا طبقہ جو خود بھی حق کی دعوت کی مخالفت کرتا ہے اور جو ماننے کے لیے تیار ہو رہے ہیں ان کی راہ میں بھی رکاوٹ ڈالتا ہے، ایسا شخص اپنے ہی جان پر ظلم کرتا ہے، پھر معاشرے میں (مقتصد) وہ طبقہ ہے جو دین کی دعوت کے مخالفت تو نہیں کرتے لیکن آگے بڑھ کر اس کی حمایت اور تائید اور نصرت کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے، ان کا مخالفت نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو دین اور اس کی دعوت کی اہمیت کا احساس ہے لیکن یہ احساس اس طرح قوی نہیں کہ یہ سب سے بے پرواہو کر حق کی دعوت کے لیے میدان میں آئیں، اسی وجہ سے قرآن کریم نے پہلے گروہ کی نسبت ان کی یہ امید دلائی کہ یہ حق کی طرف آنے والے ہیں اور ایک دن کی خامیاں دور ہو جائیں گی۔ اسی طرح تیسرا طبقہ جو (سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ) ہے، اس کے اندر دین کی اہمیت اور حق گوئی اتنی قوی ہوتی ہے کہ اپنوں پرائے کی پرواہ کیے بغیر داعی کی دعوت پر لبیک کہتا ہے۔[2]

مدعو کے لیے داعی کو زبردستی کرنے کے بجائے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر اور بھلائی مانگنی چاہیے اور کی قید سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح داعی کی زبان و بیان پر اثر اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کے فضل سے ممکن ہے اسی طرح مدعو کے دل کو پھیرنا بھی اللہ کے حکم سے ہی ممکن ہے۔

مدعو کو اپنی اصلاح کے لیے داعی کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ ایک جماعت اور جتھہ آئے گا اور اسی وقت انہی کے ساتھ مدعو خود بھی معروف اور منکر پر عمل کرے گا۔ اس انتظار میں مدعو کی گمراہی مزید بڑھتی چلی جائے گا، اس لیے قرآن کریم یہ آیت کریمہ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ.﴾[3]

اے ایمان والو تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جبکہ تم ہوئے راہ پر اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے تم سب کو، پھر وہ جتلادے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے۔

۱۔ فاطر: ۳۵/۳۵

۲۔ اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، ۱۴۴/۵

۳۔ المائدہ: ۱۰۵/۵

صرف داعی کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے اعمال کی فکر کرنے ، عبدالکریم اثری عصر حاضر کے ایک فتنے کی جانب توجہ کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگرچہ نیک فطرت لوگوں کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ دوسروں کا نقصان برداشت نہیں کرسکتے بلکہ وہ ان کے اپنے نقصان سے بھی ان کو زیادہ تکلیف وہ نظر آتا ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی اور کہا کہ تم اپنی اصلاح اور سلامت روی کے ذمہ دار ہو۔۔۔آج کل کے حالات میں یہ حکم خداوندی ان لوگوں کے رد میں ہے جو انفرادیت کو اجماعیت میں گم کردینا چاہتے ہیں اور اجتماع کی خرابی کے باعث اپنی خرابی کی اصلاح نہیں کرنا چاہتے۔"[1]

اسی وجہ سے ہر شخص کی اعمال میں ریاکاری اور نمود و نمائش داخل ہوگئی اور مدعو اپنے اعمال کی فکر کے بجائے اصلاحی اور دعوتی تحریکوں کے انتظار میں ہے کہ وہ اپنا محاسبہ کرے۔ پھر اس کا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ جب مدعو اپنی فکر کے لیے خود تگ و دو نہیں کرتا تو وہ ایمانی طور پر زوال کا شکار ہو جاتا ہے، پھر ایک فرد سے دو اور دو سے تین فرد اور یوں ایک جماعت اپنی اصلاح کے لیے کوئی معجزاتی عمل کا انتظار کر رہی ہوتی ہے، قرآن کریم کی آیت مبارکہ:

﴿فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا.﴾[2]

ان میں سے کسی نے اس کو مانا اور کوئی اس سے رکا رہا اور ایسوں کے لیے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے۔

اس ہی کی وضاحت علامہ وحیدالدین خانؒ نے اس طرح لکھی ہے:

وہ حقیقی زندگی میں نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات پر چل پڑتے ہیں مگر اسی کے ساتھ اپنے اوپر دین کا لیبل لگا کر سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کرنے لگیں وہی خدا کا دین ہے۔ایسی حالت "میں جب ان کے درمیان بے آمیز حق کی دعوت اٹھتی ہے تو وہ سب سے زیادہ اس کے مخالف ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کی دینی حیثیت کی نفی کر رہی ہے۔کافروں کا وجود ان کے لیے اس قسم کا چیلنج نہیں ہوتا اس لیے کافروں کے معاملہ میں وہ نرم ہوتے ہیں مگر حق کے داعی کے لیے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا۔"[3]

ایسے میں داعی اور مدعو دونوں کو یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ ہی دین کے اجارہ دار ہیں۔ایک اجارہ دار سمجھتا ہے تو دوسرا اس کو حسد کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔اس طرح دین کی دعوت کا اثر داعی اور مدعو دونوں اعتبار سے کم ہو جاتا یا ختم ہو جاتا ہے۔

۱۔ اثری، عبدالکریم، تفسیر عروۃالوثقی، ۲۴۲/۳

۲۔ النسآء، ۵۵/۴

۳۔ وحیدالدین خان، تذکیرالقرآن، ۱۳۳/۴

خلاصہ

دعوت دین کے تیسرے رکن کا تعلق مدعو کے ساتھ ہے۔ جس قوم، معاشرے، قبیلے یا جن افراد کو دعوت دی جارہی ہے، قرآنی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے حالات اور ان کی اچھائیوں اور برائیوں، ان کے اچھے اور برے اوصاف سے باخبر رہنا چاہیے۔

مدعو کے لیے اس حکمت کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ جو شریعت نبی کریم ﷺ لے کے آئے ہیں اور جن احکامات کے طرف آپ ﷺ نے امت کی توجہ مبذول کرائی ہے انہی احکامات کی دعوت قبول کی جائے، اسلام کے ارکان اور اس دین کے ضروری علوم جو ہر شخص پر سیکھنا فرض ہے، مدعو کو ان ارکان اسلام، فرائض اور دین کی ضروری باتوں کا پتہ ہونا چاہیے تاکہ داعی کے ہر جائز و ناجائز اور ہر بات کو بغیر دلیل کے قبول نہ کیا جاسکے۔ دین کی دعوت کس شخص سے یا کہاں سے لی جارہی ہے اس کا مدعو کو بخوبی اندازہ ہونا چاہیے۔

فصل دوم

معاشرتی وسماجی زندگی میں حکمت اور اس کے تفسیری اطلاقات

مبحث اول

تہذیب نفس میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور حکمت کے تفسیری اطلاقات

قرآن کریم میں انسان کی سعادت مندی کے لیے انسان کی قوِیٰ یعنی نظری اور اعتقادی قوتوں کی اصلاح کرتا ہے، ان کو علوم نظری سے تعبیر کیا جاتا ہے، ساتھ ہی قرآن کریم نے انسانی فلاح اور سعادت کے دوسرے پہلو عملی قوت کی بھی اصلاح فرمائی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ﴾[1]

بیشک بھلا ہوا اس کا جو سنورا

تہذیب نفس

علم تہذیب نفس سے مراد ایسے علوم اور معارف ہیں جن کے ذریعے ہر انسان انفرادی اعتبار سے اپنی زندگی کو اس طرح باکمال اور حسن اخلاق سے مزین کر سکتا ہے جس میں کسی قسم کے رزائل اخلاق اور عیوب نہ پائے جاتے ہوں، اس کی جملہ انسانی عادات ہر ان عیوب سے پاک ہوتی ہے جن سے شریعت اسلامیہ نے بچنے کا حکم دیا ہے، قرآن کریم میں ایسے اصول اور قوانین بیان کیے گئے ہیں جن کی مدد سے حکمت عملیہ کے ان تینوں شعبوں کی مکمل رہنمائی ملتی ہے، قرآن کریم نے علم تہذیب نفس، علم تدبیر منزل اور علم سیاست مدنیہ کے جو اصول وضوابط بیان فرمائے ہیں وہ حکمت کے زمرے میں آتے ہیں اور ان اصولوں کی پیروی کر کے ہی بہتر اور کامیاب زندگی گزاری جا سکتی ہے اس لیے کہ اسی زندگی کو قرآن کریم نے حسنہ اور فلاح سے تعبیر فرمایا ہے۔ علامہ مالک کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

"اگر ایک شخص واحد کی انفرادی اصلاح اور فلاح وسعادت کا علم ہے تو اس کو علم تہذیب نفس کہا جاتا ہے"۔[2]

انسان کے اندر دو بنیادی صفات ہیں۔ ایک فکر کی قوت اور دوسری ارادہ کی قوت ہے۔ فکری قوت کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کی کائنات میں پھیلی ہوئی نشانیوں سے حق کو پالینے کی غرض سے استدال کرتا ہے جب کہ ارادے کی قوت سے دنیا اور آخرت کی خیر اور سعادت والے امور کو اختیار کرتا ہے۔ حکمت ہر ایسے شخص کو حاصل ہو جاتی ہے جو غور وفکر کے ذریعے حاصل ہونے والے علم سے اور ارادہ کی قوت میں موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ حکمت انسان کے خارج میں نہیں بلکہ اس کی ذات کے اندر اور اسکی فطرت میں موجود ہوتی ہے۔ حکمت کی طلب کرنے والے کو چاہیے کہ اپنے نفس کی طرف رجوع کرے کہ اس کا باطن پاک ہے یا نہیں ہے؟ یعنی تہذیب نفس کی طرف رجوع کرے۔

۱۔ الاعلیٰ: ۱۴/۸۷

۲۔ الکاندھلوی، محمد مالک، منازل العرفان فی علوم القرآن (لاہور، ناشران قرآن لمیٹڈ، ۲۰۰۸ء)، ص ۶۶۶

یہاں یہ بات بھی مد نظر رہنی چاہیے کہ حکمت یکبارگی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کا حصول تدریجاً ہوتا ہے یعنی تدبیر منزل اور سیاست مدن میں تربیت اور حکمت عملیہ کے تدریجی استعمال سے حکمت کا حصول آسان ہوتا ہے۔[۱]

تہذیب نفس کی درج بالا تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ اس علم کے اندر دو پہلو نہایت اہم ہیں جن میں سے ایک کا تعلق رزائل اخلاق یعنی مختلف قسم کے جرائم اور معاصی سے اجتناب کرنے کے ساتھ ہے، جب کہ دوسرے پہلو کا تعلق انسان کا ان اوصاف اور خوبیوں کو اختیار کرنے کے ساتھ ہے جن کا شریعت اسلامیہ نے حکم فرمایا ہے، جس درجے میں انسان اپنی زندگی کو عیوب اور گندگیوں سے پاک کرے اس کو علم تزکیہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور جس درجہ میں انسان اپنی زندگی کو حسن اخلاق سے آراستہ کرے اس عمل کو علم تحلیہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔[2] تہذیب نفس کا مقصد ان دونوں ارکان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، انسان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ظاہر اور باطن اور اپنی روح کو ہر طرح کی نجاستوں اور آلائشوں سے پاک کرے اور اس پر عبادات اور محاسن و کمالات کو بھی مزین کرے۔ قرآن کریم نے ان دونوں ارکان کے اندر مختلف حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾[۳]

اے ایمان والو! اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

اس آیت میں تہذیب نفس اور تدبیر منزل کا حکم ہے یعنی اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنے گھر والوں کی بھی اصلاح کرو۔[۴]

علم تزکیہ

علم تزکیہ سے مراد ایسے طریقے اختیار کرنا جس سے انسان اپنی ظاہری اور باطنی پاکیزی اور طہارت کے لیے کوشش کر سکے۔ تزکیہ کا تعلق طہارت ظاہری یعنی طہارت اور نظافت کے ساتھ ہے، علم تزکیہ علم تحلیہ پر مقدم ہے، اس لیے کہ ظاہری اور باطنی طہارت اس بات پر مقدم ہوتی ہے کہ انسان اپنی زیب وزینت اور حسن اخلاق کو سنوارنے کی کوشش کرے، قرآن کریم میں بھی طہارت اور نظافت کا حکم باقی احکام عملیہ پر مقدم رکھا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرْ. قُمْ فَأَنْذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾[۵]

اے لحاف میں لپٹنے والے۔ کھڑا ہو پھر ڈر سنا دے۔ اور اپنے رب کی بڑائی بول۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھ۔ اور گندگی سے دور رہ

۱۔ الفراہی، حمید الدین، حکمت قرآن، ص ۲۰

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۳۔ التحریم: ۶/۶۶

۴۔ السعیدی، تبیان القرآن، ۲۴۳/۴

۵۔ المدثر: ۷۴/۱-۵

علامہ مراغی کے نقطۂ نظر کے مطابق کہ طہارت کا تعلق انسان کی ظاہری اور باطنی دونوں حالتوں سے ہے، اور دونوں طہارتوں کے مجموعے کا نام قرآنی طہارت رکھا گیا ہے۔ اسی طہارت کو اللہ تعالیٰ نے پسند[1] فرمایا ہے۔[2] علم تہذیب نفس کے اندر حکمت کے وہ تمام پہلو شامل ہیں، جن کا تعلق انسان کی ذات اصلاح کے ساتھ ہے، ان میں سے کچھ کام کرنے اور کچھ سے اجتناب کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، ذیل میں ان ضروری اوصاف کا ہے جو تہذیب نفس کے زمرے میں آتے ہیں، ان کو مفسرین نے کس طرح بیان کی ہے۔ ذیل میں اس کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے:

طہارت ظاہری اور باطنی کا اجتماع

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا رشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾[3]

بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں توبہ کرنے والے اور پسند آتے ہیں گندگی سے بچنے والے

اس آیت کریمہ میں توبہ یعنی باطنی پاکی کو طہارت ظاہری کے ساتھ جمع فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ ایسی طہارت کو قبول اور پسند کرتی ہے جس میں بدنی پاکیزگی اور نظافت دل اور روح کی صفائی کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔[4] اسی وجہ سے ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾[5]

اور اللہ دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو

اسی طرح طہارت باطنی کی اہمیت بھی ایک جگہ پر واضح طور پر کردی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ﴾[6]

اللہ کے ہاں یہ وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ دل پاک کرے ان کے

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حدیث مبارکہ کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے اور اس حدیث مبارکہ میں طہارت ظاہری اور باطنی کے اجتماع کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے۔ آپ ﷺ اہل قبا کے پاس تشریف لائے اور آپ ﷺ نے ان کی طہارت کے بارے میں سوال پوچھا تو ان کی طرف سے جواب دیا گیا کہ یہ لوگ پہلے ڈھیلے سے پاکی حاصل کرتے اور پھر پانی بہاتے ہیں، جس کی وجہ سے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری طہارت کی توصیف بیان فرمائی ہے، تم لوگ یہی طریقہ اختیار کرتے رہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدن کی ظاہری نجاست کی پاکی میں انتہائی درجہ کی احتیاط کو کس قدر اہم قرار دیا گیا ہے۔[7]

۱۔ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ (البقرہ: ۲۲۲/۲)

۲۔ المراغی، تفسیر المراغی، ۵۹۹/۴

۳۔ البقرہ: ۲۲۲/۲

۴۔ الکاندھلوی، منازل العرفان فی علوم القرآن، ص ۶۷۲

۵۔ التوبہ: ۱۰۸/۹

۶۔ المائدہ: ۴۱/۵

۷۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۶۷/۳

کبر و غرور سے اجتناب

سورۃ الاسرا کی آیت کریمہ

﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَي الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا﴾[1]

کے ضمن میں ان لوگوں کی راہنمائی فرمائی جا رہی ہے جو نیک اور اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور پھر ہر وقت اور ہر لمحہ اسی گھمنڈ میں رہتے ہیں کہ ان کے لیے بس یہی کام باعث فلاح اور نجات ہیں، اور اس طرح وہ مغرور ہو جاتے ہیں، دوسرا وہ شخص جو رحمت الٰہی سے مایوس ہوا حتی کہ مایوسی اس کو کفر تک لے گئی، ابوالکلام لکھتے ہیں:

"مادیات کی طرح روحانیات میں بھی یہی قانون کام کر رہا ہے۔ دنیا کی طرح آخرت کی محرومیاں بھی انہی دو مہلک راہوں سے آتی ہیں۔ عابدوں اور پارساؤں کے لیے گھمنڈ میں موت ہے اور گنہگاروں کے لیے مایوسی میں۔ جو نیک و پارسا ہو کر غرور میں مبتلا ہو گیا، اس نے اپنی پارسائی کی ساری کمائی ضائع کر دی۔ جو گناہوں کے بوجھ سے دب کر مایوسی میں پڑ گیا اس نے رحمت الٰہی کی چارہ سازیوں سے اپنے کو محروم کر دیا۔"[2]

غرور بھی تہذیب نفس کے لیے رکاوٹ ہے اور مایوسی بھی نفس کی تہذیب اور تزکیہ کے لیے دیوار ہے۔

ریا اور دکھاوا سے اجتناب

اعمال صالحہ میں ریاکاری اور دکھاوا کا جتنا عمل دخل ہو گا اتنا ہی اس کے خلوص اور اجر و ثواب میں کمی واقع ہوتی چلی جائے گی، مگر ریاکاری کے اندر ایک ہلکا سے ابہام دور کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ریاکاری اور دکھاوا میں دو طرح کی متضاد روایات جو تفسیر میں بیان ہوئی ہیں اور ان کا ازالہ بھی کیا گیا، اس مقام پر ان کو بیان کر تفسیری آراء بیان کرنا ضروری ہے، جس طرح قرآن کریم میں[3] بعض صدقات ونفقات کو اعلانیہ اور ظاہر کر کے دینے کا اجر و ثواب ہے اور بعض مواقع پر صدقات کو چھپا کر اور خفیہ طریقوں سے ادا کرنے کا حکم ہے، دونوں کی مصلحت اور حکمت الگ الگ ہے، اسی طرح اور اعمال صالحہ میں بھی دو طرح کے اعمال کا ذکر ہے۔ جامع ترمذی میں روایت نقل کی گئی ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ الرَّجُلُ يَعْمَلُ الْعَمَلَ فَيُسِرُّهُ فَإِذَا اطُّلِعَ عَلَيْهِ أَعْجَبَهُ ذَلِكَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُ أَجْرَانِ أَجْرُ السِّرِّ وَأَجْرُ الْعَلَانِيَةِ"[4]

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں اپنے گھر کے اندر جائے نماز پر تھا۔ اچانک ایک آدمی آ گیا اور مجھے اس کے آنے سے اس بات پر خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے

۱۔ الاسراء: ۸۳/۱۷

۲۔ آزاد، ابوالکلام، ترجمان القرآن، ۹۷/۳

۳۔ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (البقرہ: ۲۷۱/۲)

۴۔ ترمذی، سنن الترمذی، کتاب الزہد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب السر، ج۸/۲۹۳، رقم ۲۳۰۶

اس حالت میں (یعنی جانماز پر) دیکھا' حضور نے فرمایا ابوہریرہ تیرے اوپر اللہ رحمت کرے تیرے لیے دو ثواب ہیں ایک ثواب چھپ کر عبادت کرنے کا اور دوسرا ثواب ظاہر ہو جانے کا۔

جب کہ صحیح مسلم میں ایک روایت ان الفاظ کے ساتھ وارد ہوئی ہے:

''عَنْ أَبِي ذَرٍّ ، قَالَ : قِيلَ لِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : أَرَأَيْتَ الرَّجُلَ يَعْمَلُ الْعَمَلَ مِنَ الْخَيْرِ ، وَيَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ ؟ قَالَ : تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ.'' [1]

حضرت ابوذرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا' اگر کوئی شخص نیک کام کرتا ہے اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں (تو کیا اس کا عمل رائیگاں ہو جائے گا) فرمایا مومن کے لیے یہ فوری (دنیوی) بشارت ہے

قاضی ثناء اللہ اپنی تفسیر کے اندر ان احادیث میں پیدا ہونے والے اشکال کو دور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قلنا لا منافاة أصلا مراده ان من عمل لله ويريد ان يراه الناس ويحمده على عمله- او يزيد في عمله إذا راه الناس فهو من الرياء والشرك الخفي- واما من عمل لله وراه الناس وحمدوه فلستبشر به وهو لا يريد حمد الناس عليه ولاجراء منهم ولا يزيد في عمله لاجلهم فذلك بشره العاجل وله اجر السر والعلانية'' [2]

دونوں میں کوئی تضاد نہیں' آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی عمل اللہ کے لیے کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ لوگ اس کو نیکی کرتے دیکھیں یا لوگوں کے سامنے زیادہ نیکی کرتا ہے تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں تو ریاکاری اور شرک خفی ہے باقی جو شخص کوئی نیک کام اللہ کے واسطے کرتا ہے اور لوگ اس کو دیکھ پاتے ہیں اور تعریف کرنے لگتے ہیں اور وہ اس سے خوشی محسوس کرتا ہے تو چونکہ وہ نیکی لوگوں کو دکھانے اور تعریف کرانے کے لیے نہیں کرتا۔ نہ لوگوں سے کوئی معاوضہ چاہتا ہے نہ لوگوں کے دکھانے کے لیے عمل خیر میں اضافہ کرتا ہے (اس لیے یہ ریاکاری نہیں بلکہ) یہ اس کے لیے فوری خوشی ہے اور اس کے لیے دوہرا اجر ہے ایک چھپا کر عبادت کرنے کا دوسرا ظاہر ہو جانے کا۔

فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا یقینا عند اللہ احسن اور خیر اور اجر و جزا کا باعث ہے مگر پھر لوگوں کی بھلائی کے لیے کوئی کام کر کے اس پر غرور کرنا، اترانا یہ قیامت کے دن اس کے لیے باعث اجر و ثواب نہیں ہو گی۔ ثناء اللہ امر تسری کے مطابق قومی اور فلاحی اداروں پر نمود و نمائش کی غرض سے کیا گیا کام اسی مانند ہو گا جس کی آپ نے یوں تشبیہ دی ہے:

''چونکہ وہ صرف محض ننگ و نمود اور فخر و ریا کے لیے ہوتے ہیں اس لیے وہ ایسے دھوکہ کی ٹہنی ہے جیسے چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھتا ہے اور اس کی طرف دوڑتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے تو اسے مفید مطلب کچھ نہیں پاتا اور مارے پیاس کے تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے تو بعد

---

۱ ۔ القشیری، صحیح مسلم، کتاب الآداب، باب الثناء الحسن عاجل بشری المؤمن، ۸/۱۴، رقم ۶۸۱۴

۲ ۔ پانی پتی، تفسیر المظہری، ۶/۷۷

الموت اللہ ہی کو اپنے پاس پاتا ہے پھر اللہ اس کو پورا حساب دیتا ہے جس لائق ہوتا ہے وہی معاملہ اس سے کیا جاتا ہے۔"[1]

علم تحلیہ

علم تحلیہ سے مراد ایسی ہدایت اور علوم ہیں جس سے انسان اپنی زندگی کو ہر کمال سے مزین کرنے کی کوشش کرتا ہے، اچھے اور صالح اعمال اور اخلاق حسنہ کو اختیار کرنا علم تحلیہ کہلاتا ہے۔[2]

علم تحلیہ (دین اور دنیا میں فلاح و کامیابی) کے اصول قرآن کریم میں اکثر مقامات پر بیان ہوئے ہیں، علم تحلیہ کے اندر دین اسلام کے بنیادی ارکان میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور تقویٰ، نگاہ کی حفاظت، عاجزی وانکساری، اللہ تعالیٰ کا ذکر، توبہ واستغفار اور قناعت وغیرہ محاسن شامل ہیں۔

علم تحلیہ کے مخصوص ارکان، جن کے اندر مفسرین کرام نے حکمت کی تفصیل بیان فرمائی ہے، ان میں کچھ درج ذیل ہیں:

نگاہ کی حفاظت

ارشاد خداوندی ہے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾[3]

کہہ دے ایمان والوں کو نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور تھامتے رہیں

قرآن مجید میں نگاہ کی حفاظت میں حکمت کے ضمن میں پیر محمد کرم شاہ کے مطابق شریعت اسلامیہ ان تمام راستوں اور وسائل کا سد باب کرنا چاہتی ہے جو گناہ کی جانب جانے والے ہوں، اس لیے کہ شریعت اسلامیہ کا مقصد یہ ہے کہ جب ان راہوں کو بند کیا جائے گا تو گناہ کے ارتکاب میں آسانی نہیں ہو گی، ایک انسان گناہوں کو چھوڑنے کا یقین محکم بھی کرے اور نگاہ کی حفاظت بھی نہ کرے تو اس سے واضح ہو گا کہ وہ اپنے اس عمل میں مخلص اور سچا نہیں، آپ لکھتے ہیں:

> "طبیعت میں ہیجان پیدا کرنے والے اور جذبات شہوت کو مشتعل کرنے والے اسباب سے نہ روکنا اور ان کو کھلی چھٹی دے دینا، اور پھر یہ توقع رکھنا کہ ہم اپنے قانون کی قوت سے لوگوں کو برائی سے بچالیں گے، بڑی نادانی اور ابلہی ہے۔۔۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اس برائی کو برائی نہیں سمجھتا اور نہ اس سے لوگوں کو بچانے کی مخلصانہ کوشش کرتا ہے۔ اس کی زبان پر جو کچھ ہے وہ اس کے دل کی صدا نہیں، بلکہ محض ریاکاری اور طمع سازی ہے۔"[4]

۱۔ امرتسری، تفسیر ثنائی، ص ۴۳۳

۲۔ کاندھلوی، منازل العرفان فی علوم القرآن، ص ۶۹۰

۳۔ النور: ۳۰/۲۴

۴۔ الازھری، کرم شاہ، ضیاء القرآن، ۹۱/۶

لہٰذا نظر کی بھی حدود اور قیود ہیں جس طرح زبان کے بارے میں ہے کہ کب اور کیسے اور کتنا استعمال کرنا ہے۔اسی طرح نگاہ کے لیے بھی ضروری ہے کہ کب اور کس کے لیے نگاہ استعمال ہو رہی ہے ؟اس کا ہر نظر والے اور ہر نگاہ والے کو خیال رکھنا چاہیے۔

ٹیکنالوجی کا استعمال

ٹیکنالوجی کا مثبت اور منفی استعمال علم تحلیہ کو بڑھا سکتا ہے اور کم بھی کر سکتا ہے۔ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تفسیر میں ٹیکنالوجی کے منظّم، مثبت اور صحیح استعمال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اہل حق حالات وزمانہ کی ضرورت کے مطابق اپنے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے سامانِ حرب تیار کریں، رائج الوقت ٹیکنالوجی سے استفادہ کریں اور باطل کے مقابلے کے لیے مطلوبہ طاقت فراہم کریں۔ لیکن اس انقلابی عمل میں سب سے اہم سوال افرادی قوت کی فراہمی کا ہے' اور اس عمل کی ابتدا دعوت و تبلیغ سے ہوگی۔"[1]

لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ نے سورۃ الغافر کی آیت کریمہ کے ضمن میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ کافروں کی ترقی اور ان کی طرف سے نت نئی ٹیکنالوجی کا فروغ تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے کہ ان تم ان کی ترقی اور ٹیکنالوجی سے مرعوب ہو کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت،اس کے توکل اور اس کے قدرت کو بھول جاؤ۔لہذا ایک مسلمان کو جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ خود بھی اور اپنے اہل وعیال کو بھی ٹیکنالوجی کا بہتر اور صحیح اور نفع بخش استعمال بتائے وہاں ان کو اس حقیقت کا بھی بتائے کہ اصل میں خالق اور مالک اور تمام قدرتوں اور طاقتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔[2]

یعنی یہ بات پیش نظر رہے کہ ٹیکنالوجی کو ہی حرف آخر نہ سمجھ لیا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت پر سب سے زیادہ ایمان رکھنا ضروری ہے تاکہ مسلمان ٹیکنالوجی سے مرعوب ہو کر غور وفکر اور قدرتِ باری پر یقین کم نہ کرلیں۔

زبان کا استعمال

زبان کا کھردرا پن نہ صرف انسان کو اپنے ارد گرد، خاندان، معاشرے اور سماج میں ذلیل کرتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک عیب دار چیز ہے،

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيْمٌ﴾[3]

جواب دینا نرم اور درگذر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہو ستانا اور اللہ بے پروا ہے نہایت تحمل والا

مولانا ابوالکلام آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

۱۔ اسرار احمد، بیان القرآن، ۱۳۳/۳

۲۔ ایضاً، ۲۰۹/۴

۳۔ البقرہ: ۲۶۳/۲

"اگر کوئی سائل کسی سے مانگے اور کسی وجہ سے دے نہ سکتا ہو تو اس سے نرم الفاظ میں معذرت کر لینا اور اگر وہ مانگنے پر ناروا اصرار کرے تو اس کی غلطی سے در گزر کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان دے تو دے مگر بعد میں احسان جتلائے یا اسے ذلیل کر کے تکلیف پہنچائے۔"[1]

تہذیب نفس کے لیے ایک امر زبان کے استعمال میں انتہائی احتیاط کا بھی ہے۔ اس لیے کہ یہی امر قربِ الٰہی کا سبب بھی بن سکتا ہے اور عذابِ الٰہی کا مستحق بھی ٹھہرا سکتا ہے۔ لہذا علمِ تحلیہ میں زبان کا بھی نہایت اہم کردار ہے۔

علم نافع کی طلب

حکمت کے لیے علم نافع کا حاصل کرنا بہت ضروری ہے تاکہ انسان حق اور باطل، اچھے اور بُرے میں فرق کرنے کے قابل ہو سکے۔

عبدالرحمٰن السعدی آیت کریمہ

﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗٓ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾[2]

میں حُكْمًا وَّعِلْمًا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"في عبادة الخالق ببذل الجهد والنصح فيها، وإلى عباد الله ببذل النفع والإحسان إليهم، نؤتيهم من جملة الجزاء على إحسانهم علما نافعا."[3]

یعنی جو پوری کوشش اور خیر خواہی سے خالق کی عبادت میں احسان سے کام لیتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو نفع پہنچا کر ان کے ساتھ بھلائی سے پیش آتے ہیں ہم ان کو ان کے اس احسان کے بدلے علم نافع عطا کرتے ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ علم نافع کے حاصل ہونے سے حکمت کے حصول کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔

علامہ عثمانی آیت کریمہ[4] کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"اور ظاہر ہے مومن کامل کا دل اسی وقت ٹھنڈا ہو گا۔ جب اپنے اہل و عیال کو طاعت الٰہی کے راستہ پر گامزن اور علم نافع کی تحصیل میں مشغول پائے۔ دنیا کی سب نعمتیں اور مسرتیں اس کے بعد ہیں۔"[5]

ایک مسلمان کو چاہیے کہ جہاں وہ اپنی دنیا اور آخرت میں ان کے لیے کامیابیوں کی دعا کرتا ہے تو اسے یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے علم کو طلب کرے جو نافع علم ہو۔ نفع کی طلب سے مراد یہ ہے کہ ایسا علم جو اس کے دل کو اطمینان دے سکتا ہے اور اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو سکے۔ لہذا علم نافع کی طلب حکمت کی طلب کے لیے لازمی جزء ہے۔

۱۔ آزاد، ترجمان القرآن، ۱/۲۲۳

۲۔ یوسف: ۱۲/۲۲

۳۔ السعدی، تفسیر السعدی، ص۳۹۵

۴۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (الفرقان: ۲۵/۷۴)

۵۔ عثمانی، تفسیر عثمانی، ص۳۸۸

متانت اور سنجیدگی

انسان کے ذاتی کردار اور اخلاق کی بہتری میں سنجیدگی اور متانت کا بہت بڑا عمل دخل ہے، سنجیدگی انسان کے حسن اخلاق کو مزید بڑھا اور سنوار دیتی ہے، غیر سنجیدگی انسان کو دنیا اور آخرت کی بھلائی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ قرآن کریم کی آیت کریمہ

﴿فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى﴾[۱]

سواب تم بھی سب مل کر اپنی تدبیر کا پختہ انتظام کرو اور صفیں باندھ کر آؤ یعنی مقابلہ میں اور آج وہی کامیاب رہا جو غالب آیا۔

میں (فَأَجْمِعُوا) کا معنی و مفہوم سنجیدگی اور عزم واستقلال کے ساتھ کیا ہے، یعنی فرعون کے دربار میں آنے والے جادوگر بھی ایک دوسرے کو متانت، پختگی، اور سنجیدگی کی تلقین کرتے رہے، قرآن کریم میں ان کے ان الفاظ کو نقل کیا گیا ہے جن میں ان کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے حوصلے بلند کرنے کی تلقین کی گئی ہے، امام قرطبیؒ کے مطابق کسی کام میں متانت اور سنجیدگی اس کام کے انجام دہی میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے، آپ لکھتے ہیں:

فَأَجْمِعُوا" أَيِ اعْزِمُوا وَجِدُّوا[۲]

یعنی عزم کرو اور سنجیدگی اختیار کرو

نبی کریم ﷺ کے پاس آئے بیس نصرانی افراد پر مشتمل وفود حاضر ہوا۔ جو آپ ﷺ کے پاس اسلام کے بارے میں کچھ سوالات پوچھنے آئے تھے، ان کا واقعہ تحریر کرنے کے بعد امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جب ان کے سامنے اسلام کی دعوت رکھی تو چونکہ سنجیدگی اور متانت کا جذبہ اور اس قسم کی صفات ان لوگوں میں موجود تھیں تو ان صفات کی وجہ سے دین اسلام اور قرآن کی آیات کا اثر ان کے دل پر ہو گیا۔ ان کی صفات کے بارے میں لکھتے ہیں:

مُوَحِّدِينَ مُخْلِصِينَ لِلَّهِ مُسْتَجِيبِينَ لَهُ.[۳]

چونکہ یہ افراد موحد، مخلص اور اللہ تعالیٰ کو ماننے والے تھے۔ اس لیے ان سنجیدہ اور متانت سے لبریز صفات کی وجہ سے ان پر آیات قرآنی نے گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایسی صفات کا حامل شخص قرآنی علوم و معارف کو جلد قبول کرنے کی صلاحیت اور اہلیت رکھتا ہے، نیز اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ متانت اور سنجیدگی کے فوری اور دوررس نتائج نکلتے ہیں۔

صبر و تحمل

صبر و تحمل ان علوم تحلیہ میں سے ہے جن سے انبیاء علیہم السلام عمومی طور پر اور نبی کریم ﷺ خصوصی طور پر بہت مستفید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱۔ طٰہٰ: ۲۰/۶۴

۲۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۱/۲۲۰

۳۔ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ۶/۲۴۴

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ﴾[1]

اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے اللہ ہی کی مدد سے اور نہ ان پر غم کھا اور تنگ مت ہو ان کے فریب سے

یہی حکمت ایمان والوں کے لیے بھی ہے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾[2]

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تہذیب اخلاق کے علم تحلیہ اُصول کے تحت صبر و تحمل بھی ہے، صبر ملت ابراھیمی کا ایک اہم اُصول ہے، صبر کا معنی کسی چیز سے رک جانا یا کسی چیز کو برداشت کرنا کے ہیں، صبر ایک ایسی عمارت ہے جس کے اندر صبر علی المصیبت، صبر علی اطاعت اور صبر عن المعصیت شامل ہیں، مصیبت پر صبر کرنے کا معنی یہ ہے کہ مسلمان پر جب ایسی صورت حال پیش ہو تو وہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہے جس سے اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مزید مستحکم اور مضبوط ہوتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہر آنے والی تکلیف میں ہی اللہ کی رضا ہے، اسی کا ارادہ اور مشیت کا عمل دخل ہے، اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اطاعت کرنا صبر علی الطاعت ہے، کوئی بھی اطاعت بغیر حوصلے اور ہمت کے ادا نہیں ہو سکتی، وضو، نماز، جہاد، روزہ، حج غرض تمام احکام الٰہیہ کی پابندی صبر اور ہمت کے کام ہیں اور کوئی بھی اطاعت صبر کے بغیر مکمل نہیں، صبر عن المعصیت یہ ہے کہ جب نفسانی خواہشات آئیں تو مسلمان کو چاہیے کہ ان پر کنٹرول کرے، ہر خواہش کے آگے جھکنے کے بجائے ان کو کنٹرول کرنا اور ضبط کرنا سیکھے۔ کوئی مشکل در پیش ہو، اطاعت کا محل ہو یا معصیت سے رکنے کا موقع ہو، ہر حالت میں صبر کا دامن تھامے رکھو، تہذیب اخلاق کا یہ اُصول ہے۔[3]

صوفی عبدالحمید سواتی نے علم تہذیب اخلاق کے اندر پانچ اُصول بیان کیے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کا ذکر[4]، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں پر شکر ادا کرنا[5]، آنے والے مصائب وآلام پر صبر کرنا[6]، نماز پر دوام و استمرار[7]، دعاء اور شعائر اللہ کی تعظیم و تکریم[8] علم تہذیب اخلاق کے بڑے اُصول ہیں، آپ لکھتے ہیں کہ ان اہم اصولوں میں حکمت کو مد نظر رکھنے والے ہی کامیاب ہوتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

۱۔ النحل: ۱۶/ ۱۲۷

۲۔ البقرہ: ۲/ ۱۵۳

۳۔ السواتی، معالم العرفان، ۱/ ۶۶

۴۔ آپ نے یہ علم تہذیب اخلاق کے درج بالا اصول آیات کریمہ سے مستنبط فرمائے ہیں: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرہ: ۲/ ۱۵۲)

۵۔ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ، أَذْكُرْكُمْ (البقرہ: ۲/ ۱۵۲)

۶۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (البقرہ: ۲/ ۱۵۳)

۷۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (البقرہ: ۲/ ۱۵۳)

۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ (المائدہ: ۵/ ۲)

"موجودہ دور میں جس شخص کے لیے مہذب کا ہم معنی لفظ کلچرڈ (Culture) بولا جاتا ہے، وہ اسلام کے اصولوں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا، بلکہ صحیح معنوں میں کلچرڈ اور مہذب اُسے کہیں گے جو اسلام کے قائم کردہ ان پانچ اصولوں پر پورا اُترے گا۔"[1]

واضح ہوا کہ تہذیب نفس میں ان پانچ اصول کا بہت گہرا تعلق ہے۔ ان اصول کو مد نظر رکھنے والے لوگ ہی تہذیب نفس میں حکمت کے کمال کو پہنچتے ہیں۔

نرم لب ولہجہ

انسانی الفاظ اور اقوال کی اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن ان کے استعمال کا وقت، جگہ اور طریقہ بھی ضروری ہے۔ ایک اچھے الفاظ سخت اور تند لہجے کے ساتھ بے کار ہوتے ہیں اور نرم لہجہ اور زبانی کی نرمی بہت سخت اور پتھر دل لوگوں کے دلوں کو پھیر دیتی ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد

﴿وَالَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ﴾[2]

اور جن عورتوں کی بدخوئی کا تمھیں ڈر ہو ان کو نصیحت کرو

امام نسفی (فَعِظُوْھُنَّ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وعظ کا معنی ہی یہ ہے کہ انسان ایسی نرم گفتگو کرے جو سخت دل کو نرم کر دے اور جو سخت اور نفرت والی طبیعتیں ہیں ان کے اندر اپنائیت پیدا کر دے، انسان کو چاہیے کہ اپنی زوجہ کے ساتھ بھی اور معاشرے کے باقی افراد کے ساتھ بھی اسی طرح کا رویہ اور لب ولہجہ استعمال کرے۔[3]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لہجے کی نرمی صرف دعوت میں اور داعی کے لیے ہی نہیں بلکہ شوہر تو بیوی کے لیے، والد ہو تو بچوں کے لیے، اور بیٹا ہو تو والدین کے لیے بھی ضروری ہے۔ غرض زبان کے لہجے کی نرمی معاشرے کے ہر فرد کے ساتھ روابط کو مضبوط کرنے کے لیے اور کردار کے ذریعے حسن اخلاق کا خاموش پیغام پہنچانے کے لیے بہت ضروری ہے۔

خلاصہ

انسان کو دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی تربیت اور تزکیہ کرنا ضروری ہے اور یہی حکمت عملیہ کا اولین شعبہ ہے۔ اور یہ حکمت کی بنیادی شرط بھی ہے۔ انسان پہلے رزائل اخلاق سے بچنے کی تدابیر کرے اور پھر اگلے درجے پر حُسن اخلاق میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کرے یعنی نفس کی تہذیب کے بعد نفس کو اچھے اخلاق کی طرف گامزن کرے تاکہ حکمت کا پہلا شعبہ اس کو حاصل ہو جائے۔

۱۔ السواتی، معالم العرفان، ۶۶/۱

۲۔ النسآء: ۳۴/۴

۳۔ النسفی، مدارک التنزیل، ۱۲۲/۳

مبحث دوم

تدبیرِ منزل میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور حکمت کے تفسیری اطلاقات

ایسے اُمور جن میں ایک گھر کے رہنے والوں کے تعلقات کی بنیاد مستحکم ہوتی ہے جیسے مواسات و مراعات، شفقت و عطوفت وغیرہ اور تدبیر منزل یہ بھی ہے کہ ایک گھر کے اندر بچوں کا والدین کے ساتھ تعلق، آداب، طرز معاشرت اور حقوق وغیرہ جیسے امور کا تعلق تدبیر منزل کے ساتھ ہے۔

تدبیر منزل

اخلاق فاضلہ، حکمت عملیہ کے تقاضا کے مطابق گھر، قریبی رشتہ داروں، پڑوسیوں کے علاوہ دور اور نزدیک کے تمام افراد معاشرہ کے ساتھ ربط و تعلق کو اس طریقے سے استوار کرنا جس کا نتیجہ باعزت میل جول اور باوقار زندگی کی صورت میں ظاہر ہو تدبیر منزل کہلاتا ہے۔ اسی طرح کسی آدمی کا دوسرے آدمی کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کا برتاؤ کرنا اور پھر اس اخلاق کی حفاظت کے لیے جو طریقہ کار اپنائے جاتے ہیں اس کا نام تدبیر منزل ہے۔

تہذیب نفس کے علاوہ قرآن کریم نے حکمت عملیہ کے باقی شعبہ جات جن میں علم تدبیر منزل اور علم سیاست مدن شامل ہے، ان کی طرف بھی کامل رہنمائی فرمائی ہے۔ قرآن کریم میں انسان کو انفرادی زندگی کو تبدیل کرنے اور اس کے اندر کمال اور خوبصورتی پیدا کرنے کے علاوہ اجتماعیت کے بھی رہنما اُصول مقرر فرمائے ہیں، ایسے اُمور جو انسان کے باہمی معاملات اور معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں بیع و شراء، نکاح سے متعلق تمام اُمور اور میراث کے علاوہ مال، خادم، زوجہ اور اُولاد کے خصوصی طور پر حقوق اور ان کی تدبیر اور حکمت شامل ہے۔ علامہ مالک کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

"باہمی معاملات اور معاشرت کی اصلاح کے اُصول وہدایات کا نام علم تدبیر منزل ہے۔"[1]

اس کی مزید وضاحت میں غلام رسول سعیدیؒ لکھتے ہیں:

"حکمت عملیہ کا تعلق ایک خاندان کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اس کو تدبیر منزل کہا جاتا ہے"[2]

اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبیعت میں اجتماعیت کو ودیعت کر رکھا ہے، اجتماعی زندگی کو اختیار کیے بغیر انسان نہیں رہ سکتا اس لیے کہ انسان کی تعمیر، تدبیر، حکمت اور زندگی کو احسن طریقے سے گزرانے کا تقاضا ہے کہ اجتماعیت کو اختیار کیا جائے۔ انسان اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی ضروریات کی تکمیل کے لیے اپنی ہی نوع یعنی انسانوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال میں ایسے عوامل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن کی وجہ سے محبت، امن وآشتی کو فروغ ملے۔ اس کے لیے شریعت اسلامیہ نے تدبیر منزل کے اُصول اور ان کے اندر حکمت رکھی ہیں تاکہ انسان انہی حکمتوں کے پیش نظر

۱۔ الکاندھلوی، منازل العرفان فی علوم القرآن، ص ۳۵۷

۲۔ السعیدی، تبیان القرآن، ۱۹۲/۲

معاشرے کے دوسرے افراد کے ساتھ بہترین رویہ اختیار کرے اور یہی شریعت اسلامیہ کا تقاضا ہے۔اس مبحث میں حکمت عملیہ کے دوسرے شعبہ تدبیر منزل کے تحت آنے والے ارکان کے حقوق میں حکمت کے مظاہر مفسرین کی آراء کی روشنی میں بیان کیے جاتے ہیں:

والدین کے حقوق

علم تدبیر منزل کا سب سے پہلا اور اہم ترین شعبہ والدین کے حقوق اور ان کے اندر حکمت و تدبیر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾[1]

اس آیت کریمہ میں میثاق وعہد کے ایک پہلو میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بندگی کے عہد کا بیان ہے اور دوسرے پہلو میں والدین سے حسن سلوک کا بیان کیا گیا ہے۔امام رازی ان حقوق کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "أن الله تعالى لا يطلب بإنعامه على العبد عوضا البتة بل المقصود إنما هو محض الإنعام والوالدان كذلك، فإنهما لا يطلبان على الإنعام على الولد عوضا ماليا ولا ثوابا، فإن من ينكر الميعاد يحسن إلى ولده ويربيه، فمن هذا الوجه أشبه إنعامهما إنعام الله تعالى"[2]
>
> ان دونوں مضامین کو اکھٹا کرنے میں حکمت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات پر اپنے بندوں سے کوئی عوض اور بدلہ نہیں چاہتا بلکہ اس کا انعام محض منعم ہونے کی وجہ سے ہے، اسی طرح کچھ شان والدین کے اس انعام میں ہے جو وہ اپنی اولاد پر کرتے ہیں نیز حق تعالیٰ بندوں کے جرائم کے باوجود بھی اپنا انعام قطع نہیں کرتا کچھ ایسا ہی حال والدین کا بھی ہوتا ہے کہ اولاد کی برائیوں کے باوجود بھی وہ اپنی قدرت کے مطابق احسانات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔

ان دونوں پہلوؤں کو ایک آیت کریمہ کے تحت جمع کرنے اور اکھٹا کرنے سے یہ اہمیت واضح ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اہمیت کے ساتھ ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بھی اہمیت بہت زیادہ ہے، اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سب سے اہم اور مقدم اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور بندوں کے حقوق میں سب سے پہلا حق والدین کے ساتھ احسان سے پیش آنا ہے۔

اسی امر کے پیش نظر حکم دیا گیا:

﴿إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ﴾[3]

سورۃ الاحقاف میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ البقرہ: ۸۳/۲

۲۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۵۸۶/۳

۳۔ بنی اسرائیل: ۲۳/۱۷-۲۴

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا﴾[1]

خدا کی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک اور سب اقرباء و مستحقین کے ساتھ مشفقانہ تعلقات کو اس لیے ضروری قرار دیا گیا کہ مذہب کی تکمیل بلا اس طرز کے ناممکن ہے، وہ انسان جو خدا پرست ہے، لازمی ہے کہ کائنات کے ساتھ اس کا نہایت گہرا اور محبانہ تعلق ہو۔ بالخصوص والدین اور عزیز جو قریبی رشتہ، الفت و شفقت رکھتے ہیں ضرور ہماری توجہ کے مستحق ہیں، حنیف ندوی لکھتے ہیں:

"یاد رکھو جو اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے حق میں بھی اچھا انسان نہیں وہ خدا کے حق میں بھی نیک انسان نہیں ہو سکتا، گویا قرآن تقوی وصلاح کا معیار ظاہری رسوم دین نہیں قرار دیتا، بلکہ اس کے نزدیک فلاح و نجات موقوف ہے حسن معاملت اور حقوق شناسی پر وہ کہتا ہے تم لوگوں کو محراب ومنبر میں نہ دیکھو کہ بدترین لوگ بھی زہد و ورع کے مقدس مقامات میں زینت افروز ہو سکتے ہیں ۔"[2]

والدین کی خدمت و اطاعت والدین ہونے کی حیثیت سے کسی زمانے اور کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں ہر حال اور ہر عمر میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک واجب ہے لیکن واجبات و فرائض کی ادائیگی میں جو حالات عادۃ رکاوٹ بنا کرتے ہیں ان حالات میں قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ احکام پر عمل کو آسان کرنے کے لیے مختلف پہلوؤں سے ذہنوں کی تربیت بھی کرتا اور ایسے حالات میں تعمیل احکام کی پابندی کی مزید تاکید بھی۔ والدین کے بڑھاپے کا زمانہ جبکہ وہ اولاد کی خدمت کے محتاج ہو جائیں ان کی زندگی اولاد کے رحم و کرم پر رہ جائے اس وقت اگر اولاد کی طرف سے ذرا سی بے رخی بھی محسوس ہو تو وہ ان کے دل کا زخم بن جاتی دوسری طرف بڑھاپے کے عوارض طبعی طور پر انسان کو چڑ چڑا بنا دیتے ہیں تیسرے بڑھاپے کے آخری دور میں جب عقل و فہم بھی جواب دینے لگتے ہیں تو ان کی خواہشات و مطالبات کچھ ایسے بھی ہو جاتے ہیں جن کا پورا کرنا اولاد کے لیے مشکل ہوتا ہے قرآن حکیم نے ان حالات میں والدین کی دل جوئی اور راحت رسانی کے احکام دینے کے ساتھ انسان کو اس کا زمانہ طفولیت یاد دلایا کہ کسی وقت تم اپنے والدین کے اس سے زیادہ محتاج تھے جس قدر آج وہ تمہارے محتاج ہیں تو جس طرح انہوں نے اپنی راحت و خواہشات کو اس وقت تم پر قربان کیا اور تمہاری بے عقلی کی باتوں کو پیار کے ساتھ برداشت کیا اب جبکہ ان پر محتاجی کا یہ وقت آیا تو عقل و شرافت کا تقاضا ہے کہ ان کے اس سابق احسان کا بدلہ اداء کرو[3]

قطب شہید لکھتے ہیں:

"وهنا يجيء الأمر بالإحسان إلى الوالدين في صورة قضاء من الله يحمل معنى الأمر المؤكد ،بعد الأمر المؤكد بعبادة الله"[4]

۱۔ الاحقاف: ۱۵/۴۶

۲۔ الندوی، سراج البیان، ۴۲/۳

۳۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۹۵/۵

۴۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۱۴/۵

والدین کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کا حکم اللہ نے قضااور فیصلہ کی شکل میں دیا۔ یعنی یہ اللہ کا فیصلہ ہے، اور ہر حاکم اپنے فیصلہ کو نافذ کراتا ہے

یعنی یہ ہے کہ یہ حکم نہایت ہی تاکیدی ہے جو ڈگری کی شکل میں ہے۔ جس طرح اس سے قبل یہ کہا گیا تھا کہ اللہ نے فیصلہ دیا ہے کہ صرف اس کی بندگی کرو۔ والد اور والدہ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کا خیال رکھیں بلکہ اولاد کو اس تلقین کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ضعیف والدین کا خیال رکھیں اور اس سلسلے میں ان کے شعور و وجدان کو جگانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اس نسل کی بہبود کا بھی خیال رکھیں جس نے اپنے خون کا آخری قطرہ خشک کرے ان کو پروان چڑھایا۔ یہاں تک کہ وہ خود خشک اور ضعیف ہو گئے۔

نکاح میں حکمت

نکاح کی اہمیت اور اس کی حکمت قرآن کریم اس طرح بیان ہوئی کہ عزت و عصمت کی حفاظت اور نسل اور خاندان کی ترقی اور اضافے کے لیے اس کو مشروع قرار دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾[1]

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ بنادیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی، البتہ اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کیلئے جو دھیان کرتے ہیں

امام خازنؒ اس آیت کی تفسیر میں نکاح کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''أي جعل بين الزوجين المودة والرحمة فهما يتوادان ويتراحمان من غير سابقة معرفة ولا قرابة ولا سبب يوجب التعاطف وما شيء أحب إلى أحدهما من الآخر من غير تراحم بينهما إلا الزوجان''[2]

اس نے میاں بیوی کے درمیان پیار اور شفقت پیدا کر دی، اس لیے وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور بغیر کسی علم، قرابت داری، یا بغیر کسی اور وجہ کے ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں جس سے ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے۔

رنگوں اور زبانوں کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کی نشاندہی کرتا ہے، ہر قوم اور نسل کی اپنی زبان ہے۔ ایسی لاتعداد قومیں ہیں جو مختلف زبانیں بولتی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والے آخری شخص کے اعضا میں یکسانیت ہے لیکن اس کے باوجود ایک شخص دنیا میں اور کسی شخص سے مشابہت اور مماثلت نہیں رکھتا بلکہ طرز کلام، ہیت اور صورت میں دوسرے سے مختلف ہے۔ چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

۱۔ الروم: ۲۱/۳۰

۲۔ الخازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، ۳۹۰/۳

"أَيْ: خَلَقَ لَكُمْ مِنْ جِنْسِكُمْ إِنَاثًا يَكُنَّ لَكُمْ أَزْوَاجًا، يَعْنِي بِذَلِكَ: حَوَّاءَ، خَلَقَهَا اللَّهُ مِنْ آدَمَ مِنْ ضِلَعِه الْأَقْصَرِ الْأَيْسَرِ. وَلَوْ أَنَّهُ جَعَلَ بَنِي آدَمَ كُلَّهُمْ ذُكُورًا وَجَعَلَ إِنَاثَهُمْ مَنْ جِنْسٍ آخَرَ إِمَّا مِنْ جَانٍّ أَوْ حَيَوَانٍ"[1]

اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیویاں پیدا کی تاکہ وہ اس کی طرف راحت حاصل کرے۔ حضرت حوا حضرت آدم کی بائیں پسلی سے جو سب سے زیادہ چھوٹی ہے پیدا ہوئی ہیں پس اگر انسان کا جوڑا انسان سے نہ ملتا اور کسی اور جنس سے ان کا جوڑا بندھتا تو موجودہ الفت و رحمت ان میں نہ ہو سکتی۔

یہ پیار اخلاص یک جنسی کی وجہ سے ہے۔ان میں آپس میں محبت مودت رحمت الفت پیار اخلاص رحم اور مہربانی ڈال دی پس مرد یا تو محبت کی وجہ سے عورت کی خبر گیری کرتا ہے یا غم کھا کر اس کا خیال رکھتا ہے۔اس لیے کہ اس سے اولاد ہو چکی ہے اس کی پرورش ان دونوں کے میل ملاپ پر موقوف ہے الغرض بہت سی وجوہات رب العلمین نے رکھ دی ہیں۔ جن کے باعث انسان با آرام اپنے جوڑے کے ساتھ زندگی گذارتا ہے۔ یہ بھی رب کی مہربانی اور اس کی قدرت کاملہ کی ایک زبردست نشانی ہے۔ادنی غور سے انسان کا ذہن اس تک پہنچ جاتا ہے۔ابن عاشور لکھتے ہیں:

"فإن الله تعالى أمر كل من تعلق به الأمر بالإنكاح بأن يلازموا العفاف في مدة انتظارهم تيسرالنكاح لهم بأنفسهم أو بإذن أوليائهم ومواليهم "[2]

ہر وہ شخص جو نکاح کرنے کی خواہش اور اُمید پر ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انتظار کی مدت میں عفت و عصمت کی پابندی کرے تاکہ ان کے لیے از خود یا ان کے سرپرستوں اور سرپرستوں کی اجازت سے ان کے لیے نکاح میں آسانی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک اور حسن اخلاق والی زوجہ کے لیے مرد کو اپنی عزت و عصمت کی بھی حفاظت کرنی ہو گی، اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کے بدلے میں اس کو پاک اور نیک خصلت زوجہ نصیب ہو گی۔

مضبوط اور مستحکم معاشرہ کی بنیاد

ایک منظّم، مستحکم اور قرآنی اصول تربیت کے مطابق معاشرے کے لیے مستحکم خاندان کا ہونا ضروری ہے، قرآن کریم نے اسی لیے نکاح کے مقاصد مودت اور رحمت، اولاد کا حصول اور سکینت بیان کیے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾[3]

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ بنادیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی، البتہ اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کیلئے جو دھیان کرتے ہیں

۱۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۳۰۹/۶

۲۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۲۹۰۲/۱

۳۔ الروم: ۲۱/۳۰

نکاح کے اندر ایک حکمت یہ بھی ہے کہ معاشرے کے اندر افرادی قوت کی کمزوری اور مختلف ذات پات میں تقسیم اور فرقہ کی تقسیم سے بچنے کے لیے نکاح کو مشروع کیا گیا ہے تاکہ معاشرہ ایک مضبوط اکائی بن جائے اور اس کی افرادی قوت مزید مستحکم اور مضبوط ہو جائے، ہر جگہ مسلمانوں پر ہونے والے شدید حملوں کی روشنی میں، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ثقافت اور تہذیب و تمدن کو محفوظ بنانے کے لیے نکاح کو پسند کرے اور لازم کرے اس لیے کہ نکاح سے امت مسلمہ کو تقسیم اور کمزوری کے خلاف تقویت ملتی ہے جو غیر مسلم کی مسلم فرد پر فتح کا باعث بنتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾[1]

اے آدمیو! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبلے تاکہ آپس کی پہچان ہو تحقیق عزت اللہ کے یہاں اسی کو بڑی جس کو ادب بڑا اللہ سب کچھ جانتا ہے خبر دار۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ مختلف نسل اور مختلف رنگ کے سارے لوگ جو مختلف قبائل اور قوموں میں تقسیم ہو گئے ہیں، حقیقت میں سب ایک ہی ہیں۔ نکاح کے اہم اور عظیم حکمت یہ بھی ہے کہ اختلاف کرنا، الگ تھلگ ہو جانا، جھگڑا کرنا یا جھگڑے کی بنیاد بننا اور معاشرے اور خاندان کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے، زبان اور رنگ، کردار اور اخلاق کے فرق اور انسان کی ذاتی صلاحیتوں کے فرق کو بنیاد بنا کر جھگڑا کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب اور نکاح کی حکمتوں کے خلاف ہے۔[2]

انسان کی پیدائش اس طرح نہیں ہے جس طرح مختلف نباتات اور جڑی بوٹیاں جو خود بخود بغیر کسی صنف کے زمین سے پیدا ہو جاتی ہیں بلکہ انسان ایک پیدائش ایک خاص صنف کے ساتھ ہوئی ہے جس صنف کے تعلق اس جیسی صنف والے کے ساتھ ہے اور اسی وجہ سے انسان کے درمیان انس اور محبت بڑھتا ہے۔ اگر یہ پیدائش کا مرحلہ کسی اور صنف کے ساتھ ہوتا تو انسانوں کے درمیان محبت کا جذبہ بیدار نہ ہوتا۔ میاں اور بیوی کے درمیان بھی انس اور محبت کی بنیادی وجہ بھی ایک ہی صنف سے پیدا ہونے کے ساتھ ہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک بھی مخالف صنف کے ساتھ پیدا ہوتا تو محبت نہ ہوتی، یہی وجہ ہے کہ شادی سے پہلے یہی دونون ایک دوسرے کے لیے انجان اور بعد میں ایک دوسرے کی محبت میں وارفتہ ہوتے ہیں۔ یہ حکمت بیان کرتے ہوئے ابن عاشور نے مزید وضاحت کے لیے لکھا ہے:

۱۔ الحجرات: ۴۹/۱۳

۲۔ دیکھیے: قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۶/۳۳۴۸، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۷/۲۵۸، قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۸/۶۰۴

"وأن جعل بينهما رحمة فهما قبل التزاوج لا عاطفة بينهما فيصبحان بعد التزاوج متحابين، وأن جعل بينهما رحمة فهما قبل التزاوج لا عاطفة بينهما فيصبحان بعده متراحمين كرحمة الأبوة والأمومة"[1]

اور اس نے ان کے درمیان رحمت (پیار اور محبت) کو پیدا کر دیا۔ تو انھوں نے آپس میں ملاپ سے پہلے سمجھ لیا کہ ان کے درمیان اس سے پہلے کوئی الفت نہیں تھی۔ اس لیے ملاپ کے بعد وہ محبت کرنے لگے، اور اگر اس نے ان کے درمیان رحم کر دیا تو ان کے درمیان ہم آہنگی سے پہلے کوئی الفت نہیں رہی، پھر اس کے بعد وہ ایک اور اس طرح رحم دل ہو گئے جیسے باپ اور ماں کی رحمت کے طور پر مہربان ہوتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ عورت کی طرف مرد کی میلان ایک فطری عمل ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عین حکمت پر مبنی ہے، اس لیے علامہ تھانوی لکھتے ہیں:

"بیویوں کی طرف میلان والتفات ہونا منافی کمال نہیں جیسا کہ بعض زاہدان خشک سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہاں اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر کیا ہے۔"[2]

نکاح میں مہر کی حیثیت

اللہ تعالیٰ نے نکاح کے صحیح اور درست ہونے کے لیے مرد کی طرف سے عورت کو مہر دینے کی شرط رکھی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ کوئی مہر تھوڑا ادا کرے یا زیادہ، شریعت اسلامیہ نے مہر کے اندر بہت بڑی اور عظیم حکمت رکھی ہے جو عورت کی نئی زندگی اور شوہر کی طرف سے ایک خاص تحفہ کے طور پر مقرر کیا گیا ہے۔

﴿وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَإِن طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا﴾[3]

دے ڈالو عورتوں کو مہر ان کے خوشی سے پھر اگر وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تم کو اپنی خوشی سے تو اس کو کھاؤ رچتا پچتا۔

اس سے واضح ہوا کہ مہر عورت کا خالص حق ہے، اور اس کے والدین کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کی اجازت کے بغیر اس سے مہر میں سے کچھ لے، اسی طرح شوہر کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ مہر میں سے کچھ واپس لے سوائے اس کے کہ اس کی بیوی خود اس کو کچھ واپس دے یا اس میں سے کچھ عطا کرے، مفسرین نے واضح کیا ہے کہ مہر خوشی کا بدلہ ہے اور اس کا ذکر قرآن کریم میں ایک سے زیادہ مقامات پر لفظ (أجر)[4] کے ساتھ آیا ہے۔

امام قرطبیؒ مہر کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۱۷/۲۱

۲۔ التھانوی، بیان القرآن، ص ۳۸۹

۳۔ النسآء: ۴/۴

۴۔ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (النسآء: ۴/۲۴)

"الاستمتاع التلذذ والأجور المهور وسمى أجراً لأنه أجر الاستمتاع وهذا نص على أن المهر يسمى أجرا"[1]

اس سے مراد یہ ہے کہ فائدہ حاصل کرنا اور اجرت ادا کرنا مہر ہے اور اسے اجرت کہا جاتا ہے کیونکہ یہ فائدہ حاصل کرنے کا بدل اور اس کی اجرت ہے اور قرآن کریم نے اسی مہر کو اجرت کہا ہے۔

اسی طرح امام آلوسی بھی مہر کی حکمت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"إی مهورهن وهی عوض الاستمتاع بهن"[2]

کہ مہر کو لازم کرنے کی مصلحت اور حکمت یہ ہے کہ مرد اس سے فائدہ اور استمتاع حاصل کرتا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا مہر عورت سے تمتع حاصل کرنے کے عوض ہے؟ اگر ایسا تو تو فائدہ تو دونوں حاصل کرتے ہیں پھر مرد ہی پر مہر کیوں واجب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں مہر کا حکم مردوں کو ہی دیا گیا ہے اور پھر امام جصاص مہر کی حکمت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"إِنَّمَا سُمِّيَ الْمَهْرُ نِحْلَةً وَالنِّحْلَةُ فِي الْأَصْلِ الْعَطِيَّةُ وَالْهِبَةُ فِي بَعْضِ الْوُجُوهِ; لِأَنَّ الزَّوْجَ لَا يَمْلِكُ بَدَلَهُ شَيْئًا; لِأَنَّ الْبُضْعَ فِي مِلْكِ الْمَرْأَةِ بَعْدَ النِّكَاحِ هُوَ قَبْلَهُ, أَلَا تَرَى أَنَّهَا لَوْ وُطِئَتْ بِشُبْهَةٍ كَانَ الْمَهْرُ لَهَا دُونَ الزَّوْجِ؟ فَإِنَّمَا سُمِّيَ الْمَهْرُ نِحْلَةً; لِأَنَّهُ لَمْ يَعْتَضْ مِنْ قِبَلِهَا عِوَضًا يَمْلِكُهُ, فَكَانَ فِي مَعْنَى النِّحْلَةِ الَّتِي لَيْسَ بِإِزَائِهَا بَدَلٌ; وَإِنَّمَا الَّذِي يَسْتَحِقُّهُ الزَّوْجُ مِنْهَا بِعَقْدِ النِّكَاحِ هُوَ الِاسْتِبَاحَةُ لَا الْمِلْكُ"[3]

(بعض اہل علم کا قول ہے کہ) مہر کو نحلة کا نام دیا گیا جبکہ یہ لفظ اصل میں بعض صورتوں کے اندر ہبہ اور عطیہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شوہر، مہر کے بدل کے طور پر کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا اس لیے کہ نکاح کے بعد بھی عورت کے اعضائے جنسی نکاح سے پہلے کی طرح عورت ہی کے قبضے میں رہتے ہیں۔ آپ نہیں دیکھتے؟ کہ اگر عورت کے ساتھ شبہ کی بناپر وطی کرجائے تو مہر کی رقم عورت کو ملے گی شوہر کو نہیں، اب مہر کو اس لیے، نحلة، کا نام دیا گیا کہ عورت کی طرف سے اس کے بدلے میں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس کا شوہر مالک ہو جائے اس لیے مہر اس ہبہ اور عطیہ کی طرح ہو گیا جس کے مقابلے میں کوئی بدل نہیں ہوتا۔ عقد نکاح کی بناپر عورت کی طرف سے شوہر جس چیز کا مستحق ہوتا ہے وہ اسباحت ہے نہ کہ ملکیت یعنی وہ عورت کو جسمانی طور پر اپنے طور پر مباح کرلیتا وہ عورت کا مالک قرار نہیں پاتا۔

یعنی ایک تو مہر نکاح کا بدل ہے دوسرا عورت سے تمتع شریعت اسلامیہ کے حکم کے مطابق جائز اور حلال ہو گیا۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ عورت کے کسی عضو کا شوہر مالک ہو جاتا ہے اس لیے کہ نکاح کے بعد بھی ہر عضو

۱۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۵۵/۵

۲۔ الآلوسی، روح المعانی، ۶۶/۶

۳۔ الجصاص، احکام القرآن، ۷۳/۲

عورت ہی کے پاس رہتا ہے جیسا کہ امام جصاص نے تفصیل بیان کی ہے۔اسی کی مزید تفصیل احمد رشید رضا لکھتے ہیں:

"مہر مقرر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہ مہر بیوی کے استعمال کا عوض نہیں ہوتا جیسا کہ اکثر سمجھا گیا ہے بلکہ یہ شریک حیات ہونے کی ایک علامت ہے کہ عورت کی پہلی کفالت کی جگہ اب دوسری کفالت نے لے لی ہے جو عورت کی فطرت کے مطابق ہے اور اس کا حق ہے۔"[1]

علامہ مراغی نحلة سے مراد ایسا ہدیہ اور تحفہ اور عوض مراد لیتے ہیں کہ عورت مرد کے گھر اور چار دیواری کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہے،آپ مہر کی حکمت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وأعطوا النساء اللواتى تعقدون عليهن المهور عطاء هبة يكون رمزا للمودة التي ينبغى أن تكون بينكما ، وآية من آيات المحبة ، ودليلا على وثيق الصلة والرابطة"[2]

ان عورتوں کو مہر ادا کرو جن سے تم عقد کرتے ہو، اس لیے کہ یہ مہر بطور ایک تحفہ کے ہے جو تمہارے درمیان ہونے والی مودت کی علامت اور محبت کی نشانی ہے اور قریبی تعلق اور بندھن کا ثبوت ہو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ مہر کی حکمت عورت سے حصول لذت اور تسکین نہیں بلکہ ایک تو شریعت اسلامیہ کا حکم ہے جس کے اندر سب سے بڑی حکمت ہے۔اور پھر ظاہرا جس حکمت کی طرف عقل مائل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مہر حلال اور جائز طریقے سے نکاح،اور شریعت اسلامیہ کے مطابق حلال طریقے سے حاصل کیا گیا تمتع ہے جو نہ صرف بیوی کے لیے بلکہ مرد کے لیے بھی آنے والے وقت میں تسکین کے لیے اور عزت وعصمت کی حفاظت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔لہٰذا اگر عورت لینے کی حق دار ہے تو مرد پر دینا لازم ہے جو کہ اس کے اپنے لیے بھی فائدہ مند اور شریعت اسلامیہ کے حکم کی پاسداری کے لیے ہے۔

زوج کے حقوق میں حکمت

انسانوں کے مابین ہونے والے مختلف قسم کے معاہدات میں نکاح سب سے اہم اور خاص قسم کا معاہدہ ہے، اس لیے کہ یہ معاہدہ صرف دو افراد کے مابین نہیں بلکہ ان سے جڑے باقی رشتہ داروں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور نکاح کے مثبت یا منفی اثرات دونوں افراد اور ان کے خاندانوں پر پڑتے ہیں جو بہت حساس اور پیچیدہ ہوتے ہیں،اس لیے شریعت اسلامیہ نے نکاح کی مشروعیت اور اس کی حکمت کے ساتھ ساتھ زوج اور زوجہ کے حقوق ایک دوسرے پر لازم قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کی حکمتیں بھی بیان فرمائی ہیں تاکہ دونوں میں سے کسی کے دل میں کوئی قدغن پیدا نہ ہو۔اور یہ معاہدہ نکاح دیرپا اور مضبوط ہو۔ظاہری مادی معاملات میں بھی حق وفرض کی مقدار کا تعین کرنا انتہائی مشکل اُمور میں سے ہے، لہٰذا شریعت اسلامیہ کے تعین اور اس کی بیان کردہ حکمتوں کے بغیر کوئی شوہر یہ اندازہ اور تعین نہیں کر سکتا کہ اس کو اپنی بیوی کے کون سے حقوق کب اور کیسے ادا کرنے چاہیے؟، یا بیوی کو اس کے نان نفقہ کی

۱۔ رشید رضا، تفسیر المنار، ۲۶۴/۴

۲۔ المراغی، احمد مصطفیٰ، تفسیر المراغی، ۸۹۵/۱

صحیح مقدار بتانا مشکل اُمر ہے، اسی طرح شریعت اسلامیہ یہ بتاتی ہے کہ شوہر اگر ان ظاہری اور مادی معاملات میں ایسا ہے تو اخلاقی معاملات میں کیسے ہونا چاہیے؟ اور میاں بیوی کے درمیان خفیہ اور نجی معاملات کے بارے میں کیسا رویہ ہونا چاہیے، لہذا علم تدبیر منزل کے تحت دونوں کو اپنی ذمہ داری اور حقوق کا علم ہونا چاہیے نیز اس حکمت اور حکمت عملی کا بھی علم ہونا چاہیے کہ ذمہ داری اور حقوق کیسے ادا کرنے چاہیے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ ۚ وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ۖ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا﴾[1]

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کیے انھوں نے اپنے مال پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابعدار ہیں نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم کو تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں اور مار وان کو پھر اگر کہا مانیں تمہارا تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی بیشک اللہ ہے سب سے اوپر بڑا۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

"یقومون علیهن آمرین ناهین کما یقوم الولاة علی الرعایا"[2]

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر نگہبانی حاصل ہے اور یہ اس لیے کہ وہ ان کے لیے دو کام کرتے ہیں جیسا کہ حاکم رعایا پر کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا نام ولی رکھا گیا ہے۔

یعنی جس طرح حاکم امر اور نہی کے دو کام اپنی رعایا پر کرتے ہیں اسی طرح مرد اپنی زوجہ پر دو طرح سے نگرانی کرتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ مردان عورتوں پر غلبہ رکھتے ہیں جس کی وجوہات عقل، عزم، حزم، تیر اندازی، قوت، غزوہ و حرب، کمال صوم و صلوۃ اور نبوت و خلافت و امامت و اذان اور خطبہ و جماعت و جمعہ کی نمازیں ہیں۔ بلکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تکبیرات تشریق کی وجہ سے بھی فضیلت والے ہیں۔ اور شہادت فی الحدود والقصاص، دوگنا حصہ وراثت اور میراث میں عصبہ بننے کی وجہ سے افضل ہیں۔ اسی طرح نکاح و طلاق کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں رکھی ہے اور اولاد کی نسبت نسبی بھی انہی کی طرف ہوتی ہے۔ اور مرد ہی داڑھیوں اور پگڑیوں سے مزین کیے گئے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد اپنا مال ان عورتوں پر صرف کرتے ہیں یعنی عورتوں کے نفقہ و نان کی ذمہ داری ان مردوں پر ہے۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل پائی جاتی ہے کہ عورتوں کا نفقہ مردوں پر لازم ہے۔[3]

۱۔ النسآء: ۳۴/۴

۲۔ الزمخشری، الکشاف، ۳۵۴/۱

۳۔ المراغی، تفسیر المراغی، ۳۰۶۶/۱، ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۲۳۳/۴

اگر مرد خاندان میں اپنا کردار شریعت کے مطابق ادا کرے تو بلا شبہ خاندان خوش حال ہوگا۔ مرد کا اپنی بیوی کے لیے ایک خاص قسم کا کردار اور تعلق ہوتا ہے جس کا خلاصہ اور نتیجہ شادی کے بعد اس عورت کے حقوق کی ادائیگی میں ہوتا ہے۔ علامہ سمر قندی بھی مرد کو عورت پر حکمران بنائے جانے کی حکمت یوں لکھتے ہیں:

''مسلطون في أمور النساء وتأديبهن''[1]

عورتوں پر حکمران اور قوام بنانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بیوی کی اخلاق اور آداب سکھائے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بحیثیت زوج قوام اور حاکم بنانے کے اندر مختلف حکمتیں پوشیدہ ہیں، جن میں بطور حاکم کے کردار، اور اخلاق حسنہ کی تعلیم و تربیت، امور خانہ کے انتظام و انصرام کی ذمہ داریاں جیسے اُمور شامل ہیں۔

زوجہ کے حقوق میں حکمت

عورت کا اصل دائرہ عمل اس کا گھر ہے۔ اسے اسی دائرے میں رہ کر اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے چاہئیں۔ اور گھر سے باہر شدید ضرورت کے بغیر نہیں نکلنا چاہیے۔ گھروں میں بیٹھنے اور سکون سے رہنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بے ضرورت گھر سے نہ نکلا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ازواجِ مطہرات سے بلاواسطہ اور امت کی عورتوں سے بالواسطہ یہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کا اصل مقام گھر ہے۔ شدید ضرورت کے بغیر گھر سے نکلنا شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع دینا ہے اور منافقین اور بد چلن لوگوں کو کھل کر کھیلنے کی ہمت دلانا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ لیکن اگر باہر جانے کی شدید ضرورت پیش آجائے تو پھر باہر نکلنے کے لیے جو اسلامی حدود وضع کی گئی ہیں، ان کا خیال رکھا جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ ۖ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾[2]

اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں اور دکھلاتی نہ پھرو جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں اور قائم رکھو نماز اور دیتی رہو زکوۃ اور اطاعت میں رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو! اور ستھرا کر دے تم کو ایک ستھرائی سے

علامہ مراغی لکھتے ہیں:

''الزمن بيوتكن ، فلا تخرجن لغير حاجة ، وهو أمر لهن ولسائر النساء''[3]

گھر میں رہنا آپ پر لازم ہے اور بغیر ضرورت کے گھر سے نہ نکلیں۔ یہ حکم ازواج مطہرات کے ساتھ ساتھ تمام خواتین کے لیے ہے۔

۱۔ السمر قندی، بحر العلوم، ۳۹/۴

۲۔ الاحزاب: ۳۳/۳۳

۳۔ المراغی، تفسیر المراغی، ۴۰۶۱/۱

اس سے واضح ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے عورت کا غیر ضروری ظہور فتنہ کا باعث ہے۔اور زندگی میں اس کا کردار حمل، ولادت، اور گھر کی دیکھ بھال وغیرہ اور خصوصاً گھر کے فیصلوں کے لیے اس کا گھر میں عزت اور سکون سے رہنا ضروری ہے۔

بیوی کے حقوق میں مہر کی تعین اور اس کی ادائیگی سر فہرست ہے جس کو سابقہ سطور میں بیان ہو چکا ہے، اس کے بعد نفقات اہم ترین امر ہے یعنی مرد کے ذمہ جو بیوی کے اخراجات ہیں ان کی ادائیگی قرآن وسنت کی روشنی میں لازم ہے، مرد پر بیوی کا نفقہ کیوں ضروری ہے، اس کی اندر حکمت جو بدیہی ہے وہ یہی ہے کہ چونکہ بیوی اب نکاح اور مہر کے بدلے اپنے آپ کو مرد کے سپرد کر دیتی ہے تو عقلا اور شرعا اس کے شوہر ہی کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس کے اخراجات کا بھی بندوبست کرے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾[1]

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں یہ (حکم) اس شخص کے لیے ہے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمے ہوگا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی (تو یاد رکھو کہ) نہ تو ماں کو اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے اور اسی طرح (نان نفقہ) بچے کے وارث کے ذمے ہے اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضامندی اور صلاح سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ تم دودھ پلانے والیوں کو دستور کے مطابق ان کا حق جو تم نے دینا کیا تھا دے دو اور خدا سے ڈرتے رہو اور جان رکھو جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو دیکھ رہا ہے

بچہ جس کی طرف منسوب ہے نفقہ کی ذمہ داری بھی اسی کی ہوگی، اور یقینا بچہ کا حقیقی وارث باپ ہی ہے تو اس طرح بچہ کی کفالت اور اس مرد کی بیوی جو اس بچہ کو دودھ بھی پلاتی ہے، ان دونوں کی اخراجات کی ذمہ داری باپ پر ہی ہوتی ہے۔ مفسرین کرام نے اس بارے میں مختلف اقوال نقل کیے ہیں: امام ماوردی لکھتے ہیں:

”أن ذلك في الأم المطلقة إذا أرضعت ولدها فلها رزقها من الغذاء ، وكسوتها من اللباس . ومعنى بالمعروف أجرة المثل ، والثاني : أنه يعني به الأم ذات النكاح ، لها نفقتها وكسوتها بالمعروف في مثلها ، على مثله من يسار ، وإعسار“[2]

۱۔ البقرہ: ۲/۲۳۳

۲۔ الماروری، النکت والعیون، ۱/۱۷۱

۱۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب شوہر بیوی کو طلاق دے لیکن پھر بھی وہ عورت اس بچہ کو دودھ پلاتی رہے تو اس صورت میں یہ بیوی کے حقوق میں شامل ہے کہ اس کے اخراجات پورے کرے۔

۲۔ یہ صرف اس میں ہے جب وہ عورت اس کے نکاح میں ہو اور پھر اس بچے اور اس بیوی کی کفالت تنگی ہو یا آسانی ہر دو حالات میں ان کی حقوق میں شامل ہو گی۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں:

وَعَلَى وَالِدِ الطِّفْلِ نَفَقَةُ الْوَالِدَاتِ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ، أَيْ: بِمَا جَرَتْ بِهِ عَادَةُ أَمْثَالِهِنَّ فِي بَلَدِهِنَّ مِنْ غَيْرِ إِسْرَافٍ وَلَا إِقْتَارٍ، بِحَسَبِ قُدْرَتِهِ فِي يَسَارِهِ وَتَوَسُّطِهِ وَإِقْتَارِهِ،[۱] كَمَا قَالَ تَعَالَى: ﴿لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلا مَا آتَاهَا سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا﴾[۲]

بچوں کی ماں کا نان نفقہ بچوں کے والد پر ہے۔ اپنے اپنے شہروں کی عادت اور دستور کے مطابق ادا کریں، نہ تو زیادہ ہو نہ کم بلکہ حسب طاقت و وسعت درمیانی خرچ دے دیا کرو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کشادگی والے اپنی کشادگی کے مطابق اور تنگی والے اپنی طاقت کے مطابق دیں، اللہ تعالیٰ طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، عنقریب اللہ تعالیٰ سختی کے بعد آسانی کر دے گا۔

ابن کثیر کے نزدیک اگر مرد کو طلاق بھی دے تو عدت کے دوران بھی تمام تر اخراجات اسی مرد کے ذمہ ہوں گے جس نے طلاق دی ہے اس لیے کہ پہلے یہ عورت اسی مرد کے ساتھ متعلق تھی اور اسی کے ساتھ اس کی نسبت تھی اس وجہ سے اس میں حکمت یہی ہے کہ یہی مرد دوران عدت اس عورت کی نفقہ کا بھی مکمل خیال رکھے۔[۳]

علوم شرعیہ کی تعلیم

مرد پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ نکاح کے بعد اپنی بیوی کے لیے شریعت اسلامیہ کے ایسے علوم کا بندوبست کرے جو امور خانہ داری کے ساتھ اس کی اور بچوں کی اخلاقی تعلیم وتربیت کے لیے ضروری ہوں۔ اس لیے کہ ازواج مطہرات کے بارے میں بھی ارشاد ربانی ہے:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴾[۴]

اور یاد کرو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں اللہ کی باتیں اور عقلمندی کی مقرر اللہ ہے بھید جاننے والا خبردار۔

۱۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۶۳۴/۱

۲۔ الطلاق: ۷/۶۵

۳۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱۴۳/۸

۴۔ الاحزاب: ۳۴/۳۳

یعنی ازواج مطہرات کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کی تمام عورتوں کو یہ پیغام ہے کہ گھروں میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت، تعلیم اور ایسے علوم جو کتاب اللہ کے احکام سمجھنے کے ساتھ ساتھ علم الاخلاق سے مزین ہوں، ان تمام علوم کی ترویج واشاعت اور ان کے لیے ضروری ماحول فراہم کرنا خاوند کی ذمہ داری اور زوجہ کے حقوق میں شامل ہے۔جس کو پورا کرنا زوج کے لیے ضروری ہے،علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

''یستفاد من ذلك أنه يجب على الزوج تعليم زوجته العلم الشرعي حتى تستطيع أن تحفظ نفسها وزوجها وبيتها وأبناءها''[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کے لیے علوم شرعی کا بندوبست کرے تاکہ ان علوم کو سیکھنے کے بعد وہ ان حکمتوں کو جان سکے کہ اس پر شوہر کو کون کون سے حقوق لازم ہیں اور اس کی اپنی ذمہ داریاں کیا ہیں،اسی طرح امور خانہ داری کے امور اور بچوں کی تعلیم وتربیت کے بھی وہ قابل ہو سکے گی۔

اختلاف کا حل

مرد کی ذمہ داریوں اور بیوی کی حقوق میں ایک یہ بھی ہے کہ اگر شوہر اور بیوی کے درمیان کسی معاملے پر اختلاف ہو جائے تو شوہر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وعظ ونصیحت سے،بستر سے علیحدہ کرکے یا مارنے سے تادیب سکھانا مراد ہو نہ کہ عورت کو تکلیف دینا مقصود ہو،اس لیے کہ قرآن کریم میں (اصلاح) کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور تفریق کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی۔

﴿وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِن بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِن تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا﴾[2]

پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا﴾[3]

وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''وَالصُّلْحُ خَيْرٌ على أن أنواع الصّلح كلها مباحة في هذه المسألة بإعطاء أحدهما للآخر مالا''[4]

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صلح کی تمام صورتیں مباح ہیں،اگر صلح کے لیے مال بھی دینا پڑ جائے تو مباح ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل صلح یہ ہے کہ نفس مطمئن ہو جائے ،اور اختلاف ختم ہو جائے یہی مطلقا خیر کا پہلو ہے، زوجین آپس میں رضامندی کے ساتھ جو طے کرلیں وہی بہتر ہے۔

۱۔ الزمخشری، الکشاف، ۲۸۸/۴، مزید دیکھیں: ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۵۲/۳

۲۔ النساء: ۱۲۸/۴

۳۔ النساء: ۱۳۰/۴

۴۔ الزحیلی، التفسیر المنیر، ۶۴/۳

طلاق اور عدت سے متعلق اُمور میں حکمت کے اطلاقات

عدت کی حکمت یہ ہے کہ عورت کے رحم کا استبراء ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ وہ حاملہ ہے یا نہیں' کیونکہ اگر اس کو حیض آ گیا تو وہ حاملہ نہیں ہو گی اور اس کی عدت تین حیض ہو گی' ورنہ وضع حمل تک اس کی عدت ہو گی' دوسری حکمت یہ ہے کہ اگر عورت دوسرا نکاح کرتی ہے تو اس نکاح اور دوسرے نکاح کے درمیان واقع ہونا چاہیے تاکہ اس وقفہ میں عورت کے دل و دماغ پر پہلے شوہر کے جو اثرات نقش ہو چکے تھے وہ محو ہو جائیں اور وہ خالی الذہن ہو کر دوسرے شوہر کے نکاح میں جائے' تیسری حکمت یہ ہے کہ عدت کے دوران عورت طلاق کے عواقب اور نتائج پر غور کرے کہ اس کی کس خطا یا زیادتی کی وجہ سے طلاق واقع ہوئی تاکہ دوسرے نکاح میں وہ ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرے اور اگر شوہر کی کسی بد سلوکی یا زیادتی کے نتیجے میں طلاق واقع ہوئی ہے تو اب دوسرے نکاح میں زیادہ غور و فکر اور تامل سے کام لے اور احتیاط سے نکاح کرے تاکہ پھر اسی کے شوہر کے پلے نہ بندھ جائے'[1]۔ چوتھی حکمت یہ ہے کہ اگر ایک طلاق' یا دو طلاقوں کی عدت گزار رہی ہے تو شوہر کے لیے اس طلاق سے رجوع کرنے کا موقع باقی رہے اور جس جھگڑے یا فساد کی بناء پر یہ طلاق واقع ہوئی تھی بعد میں جب فریقین کا جوش غضب ٹھنڈا ہو جائے تو اس جھگڑے کے عوامل پر غور کریں اور شوہر حسن سلوک کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے رجوع کر لے' جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے: اور ان کے خاوند اس مدت میں (طلاق رجعی کو) واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں بشرطیکہ ان کا ارادہ حسن سلوک کے ساتھ رہنے کا ہو۔ علامہ سعیدی لکھتے ہیں:

> ''ضروری ہے کہ صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو طلاقیں دی جائیں تاکہ رجوع کا موقع باقی رہے اور تین طلاقیں دے کر بعد میں پچھتانا نہ پڑے اور بچوں کی زندگی ویران نہ ہو' ہمارے زمانہ میں یہ وباعام ہے کہ لوگ جب طلاق دیتے ہیں تو تین طلاقوں سے کم نہیں دیتے یا وثیقہ نویس سے طلاق لکھواتے ہیں اور وہ تین طلاقیں لکھ کر دستخط کرا لیتا ہے اور جب جھگڑے کا جوش ختم ہو جاتا ہے تو میاں بیوی دونوں دربدر مارے مارے پھرتے ہیں۔''[۲]

اُولاد کے حقوق میں حکمت کے اطلاقات

مدت رضاعت کی تکمیل میں حکمت

شریعت اسلامیہ نے جو رضاعت کی مدت[۳] مقرر کی ہے اس کو پورا کیا جائے اسی میں حکمت ہے۔ قطب شہید لکھتے ہیں:

۱ ۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۲۹۰/۲،۷

۲ ۔ السعیدی، تبیان القرآن، ۱۸۸/۲

۳ ۔ ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ البقرہ: ۲۳۳/۲

"إن على الوالدة المطلقة واجباً تجاه طفلها الرضيع.واجباً يفرضه الله عليها ولا يتركها فيه لفطرتها وعاطفتها التي قد تفسدها الخلافات الزوجية، فيقع الغرم على هذا الصغير.إذن يكفله الله ويفرض له في عنق أمه"[۱]

مطلقہ والدہ، اپنے بچوں کے بارے میں بالخصوص دودھ پینے والے بچوں کے بارے میں بری الذمہ نہیں ہے۔ اس پر اس سلسلے میں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ فرائض اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو آزاد نہیں چھوڑ دیا کیونکہ ایسے حالات میں، اگر عورت کو۔۔ اپنی فطرت کے مطابق آزاد چھوڑ دیا جائے تو کشیدہ تعلقات کی وجہ سے کوئی غلط فیصلہ بھی کر سکتی ہے اور اس غلط فیصلے کے نتیجے میں بچہ ضائع ہو سکتا ہے، اسے نقصان پہنچ سکتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہاں بچوں کے لیے ضابطہ مقرر فرمایا گیا ہے۔ اور والدہ پر فرض کر دیتے ہیں کہ وہ ایسے حالات میں کوئی ایسا رویہ اختیار نہ کرے جس سے بچے کو نقصان پہنچے۔

قطب شہید کے بقول رضاعت میں بھی اولاد کے حقوق کو لازم رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی اس پیچیدہ حکمت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ عورت کسی غلط فیصلے کی طرف نہ جائے۔ ورنہ اس سے گھریلو اور خاندانی نظام بگڑ سکتا ہے۔

اُولاد کے درمیان عدل وانصاف میں حکمت

خاندان کی بہترین اصلاح کا تعلق اُولاد کے درمیان عدل اور انصاف کے ساتھ بھی ہے۔ شریعت اسلامیہ اُولاد کے حقوق میں مساوات اور برابری کا حکم دیتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے متعلق حقوق جن میں بچے کی کان میں اذان، اقامت، گھٹی، نسب میں احتیاط اور انصاف اور اس کی حفاظت، اچھا نام رکھنے میں، ختنہ کرنے اور عقیقہ کرنے میں، تربیت دینے میں اور شریعت اسلامیہ اور عصر حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق تعلیم دلوانے میں، عطیات چاہے مادی ہوں چاہے معنوی[2] چاہے ہر طرح کے حقوق میں مساوات ضروری قرار دی گئی ہے۔

سورۃ الانعام میں بھی والدین کو تاکید کی گئی ہے کہ اولاد کے درمیان اور خصوصی طور پر یتیم اولاد کے درمیان انصاف اور عدل کی فضا قائم کریں۔ حکم الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾[۳]

اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طرح سے کہ بہتر ہو، یہاں تک کہ پہنچ جاوے اپنی جوانی کو اور پورا کرو ناپ اور تول کو انصاف سے ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں جس

۱۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۲۳۵/۱

۲۔ مادی عطیات سے مراد مال، جائیداد، وراثت وغیرہ کی منتقلی ہے۔ اور معنوی عطیات سے مراد اچھے اخلاق سکھانا، اچھے خصائل منتقل کرنے، بوسہ دینا، محبت کرنا، بچوں کا حوصلہ بڑھانا، اچھے اور برے کام سے منع کرنے میں مساوات جیسے پہلو شامل ہیں۔

۳۔ الانعام: ۱۵۲/۶

کی اس کو طاقت ہو اور جب بات کہو تو حق کی کہو اگرچہ وہ اپنا قریب ہی ہو اور اللہ کا عہد پورا کرو
تم کو یہ حکم کر دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو

اسلام کا یہ نظام کہ یتیم کا مال اس وقت تک اپنی حفاظت میں رکھو کہ جب تک وہ خود اس مال کی حفاظت کرنے پر صحیح طور پر قادر نہ ہو، تدبیر منزل کی ایک ایسی جامع حکمت عملی ہے کہ جس میں ایک مسلمان قرآن کریم کے بتلائے گئے اِصول کے مطابق مال کے صحیح مصرف کو بروئے کار لا سکتا ہے، عبدالماجد دریا بادی اس نظام اور اس اُصول کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شریعت میں مستحسن صورت صرف وہی ہے جس سے خود یتیم کا نفع متصور ہو۔ اسلام کے معاند فرنگیوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یتیموں کے حقوق کی محافظت اسلام کا ایک خاص اور روشن کارنامہ ہے۔''[1]

انصاف کا تقاضا ہے کہ نسب کی حفاظت کی جائے، بچوں کو ان کے اصل ورثاء کی جانب لوٹایا جائے، عصر حاضر میں مادی فوائد حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے اور ہر طریقے سے مال ہتھیانے کی غرض سے نسب و حسب میں تبدیلیاں اور ترمیم کی جاتی ہے۔

سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ﴾

پکارو لے پالکوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے یہی پورا انصاف ہے اللہ کے یہاں

عبدالکریم اثری لکھتے ہیں:

> ''افسوس کہ آج بھی بڑے بڑے دیندار گھرانوں میں جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی اور اپنے عزیز اور قریبی رشتہ داروں سے اولاد کو لے لیتے ہیں ان کو اپنی اولاد کے طور پر کاغذات میں درج کراتے ہیں مثلاً کمیٹی میں، یونین کونسل میں، سکول اور کالج میں اور اس متبنّی کو اپنا وارث قرار دے کر اپنی جائیداد اس کو دے دیتے ہیں جو کسی حال میں بھی جائز اور صحیح نہیں ہے۔''[2]

خودکشی، غربت، معاش کے بڑھتے ہوئے مسائل اِولاد کے عطیہ مادی اور معنوی نہ دینے کا نتیجہ ہے۔اور بہترین معاشرے اور خاندان کی اصلاح کے لیے بچے اور بچیوں کے حقوق میں انصاف اور مساوات نہایت ضروری ہے۔

تعلیم وتربیت کا اہتمام

روزمرہ کے ایسے احکام اور حکمت عملیہ کے ایسے اصول وضوابط جو جو معاشرے کی تعلیم وتربیت میں بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کی بھی تربیت کا اہتمام کرتا ہے، اور یہی حکمت عملیہ کے رکن تدبیر منزل کا اصول ہے کہ اپنی

۱۔ دریاآبادی، تفسیر ماجدی، ۱۵۴/۴

۲۔ اثری، عبدالکریم، تفسیر عروۃ الوثقی، ۲۱۹/۲

تربیت کے ساتھ ساتھ اپنے سے وابستہ قریبی رشتہ داروں کی تربیت کا بھرپور اہتمام قرآن کریم کے بتائے گئے اصولوں کے مطابق کیا جائے، قرآن کریم تمام انسانوں کی تربیت کے اہتمام کے لیے ارشاد فرماتا ہے:

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰي وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾[1]

اس میں امید ہے کہ ادا کریں شہادت کو ٹھیک طرح پر اور ڈریں کہ الٹی پڑے گی قسم ہماری ان کی قسم کے بعد اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سن رکھو اور اللہ نہیں چلاتا سیدھی راہ پر نافرمانوں کو۔

شریعت میں ایک مصلحت یہ ملحوظ رکھی گئی ہے کہ روزمرہ کے معاملات میں ایسے احکام دیے جائیں جو آدمی کی وسیع تر زندگی کے لیے سبق ہوں۔ کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کے مال کا حق داروں تک پہنچنا ایک خاندانی اور معاشی معاملہ ہے۔ مگر اس کو دو اہم باتوں کی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ ایک یہ کہ لوگوں میں یہ مزاج ہے کہ معاملات میں وہ تعلق اور رشتہ داری کا لحاظ نہ کریں بلکہ صرف حق کا لحاظ کریں۔ وہ یہ دیکھیں کہ حق کیا ہے نہ یہ کہ بات کس کے موافق جارہی ہے اور کس کے خلاف۔ دوسرے یہ کہ ہر بات کو خدا کی گواہی سمجھنا۔ کوئی بات جو آدمی کے پاس ہے وہ خدا کی ایک امانت ہے۔ کیونکہ آدمی نے اس کو خدا کی دی ہوئی آنکھ سے دیکھا اور خدا کے دیے ہوئے حافظہ میں اس کو محفوظ رکھا۔ اور اب خدا کی دی ہوئی زبان سے وہ اس کے متعلق اعلان کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں یہ امانت خیانت ہوگی کہ آدمی بات کو اس طرح نہ بیان کرے جیسا کہ اس نے دیکھا اور جس طرح اس کے حافظہ نے اس کو محفوظ رکھا۔[2]

امین اصلاحی قرآن کریم کی آیت کریمہ[3] کے تحت اولاد کے بہتر تربیت کی رغبت ان الفاظ میں دلاتے ہیں:

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان جس طرح اپنی اولاد کے ذریعہ سے نسل انسانی کے اندر اپنا ایک مقام محفوظ کرتا ہے اسی طرح ان کے ذریعہ سے اگر وہ ان کی اچھی تربیت کر سکے، آخرت میں بھی اپنے سرمائے میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے اس لیے کہ اولاد صالح کی نیکی ایک خیر جاری ہے جس کا سلسلہ آدمی کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ احادیث میں اس کی دلیل موجود ہے۔ آیت کریمہ کے قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ میں یہ دونوں ہی پہلو موجود ہیں۔[4]

رزق کی تنگی کا ڈر

خاندان اور معاشرے کے اندر ایک جگہ اور اکٹھے رہتے ہوئے بے مروتی اور بے حسی کا یہ بھی سبب ہے کہ ہر ایک اپنے مال کو جمع کرنے اور آنے والے وقت میں رزق کے کم ہونے، حالات کے تنگ ہونے اور مہنگائی کے ڈر کی وجہ سے اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی پاؤں تلے روند رہا ہے۔ والدین رزق کی تنگی کا خوف کرتے ہوئے اولاد سے

۱۔ المائدہ: ۱۰۸/۲

۲۔ وحید الدین، تفسیر تذکیر القرآن، ۲۰۷/۳

۳۔ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (البقرہ: ۲۲۳/۲)

۴۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۵۷۷/۱

بے مروتی، بے حسی اور ان کی زندگی سے بھی تنگ ہیں۔ جب کہ قرآن کریم میں اس کا حل موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴾[1]

اور نہ مار ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو بیشک ان کا مارنا بڑی خطا ہے

آج بھی جب انسانی حقوق کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اولاد کو کم کرنے کی کوشش تیز تر ہوتی جارہی ہیں اور اس کام نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی ہے۔ جس کی پشت پناہی کے لیے حکومتوں نے اپنے خزانوں کے دروازے کھول دیئے ہیں اور اس تحریک کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ وسائل معاش پر اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ جس کے وہ متحمل نہ ہوں۔ نسل کشی کی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے فرمایا کہ فقر وافلاس کے اندیشہ سے اولاد کو قتل نہ کرو۔ یورپی ممالک جن میں فرانس سرفہرست ہے انہوں نے مصنوعی ذرائع سے ضبط تولید کرکے اپنی تعداد کو گھٹادیا اور جب جرمن فوجیں ان پر حملہ آور ہوئیں توان کے پاس ایسے جوانوں کی شدید قلت تھی جو مادر وطن کی حفاظت کے لیے میدان جنگ میں سینہ سپر ہوسکیں۔ ایسا اقدام جس سے قوم اور وطن کی آزادی خطرہ میں پڑ جائے۔ اس کو اگر بڑی غلطی نہ کہا جائے تو کیا اسے دانشمندی کہا جائے۔[2]

۱۔ الاسراء: ۳۱/۱۷

۲۔ پیر کرم شاہ، ضیاء القرآن، ۲۱۴/۳

مبحث سوم

زوجین کے حقوق میں توازن کی حکمت کے تفسیری اطلاقات

خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز بھی رشتوں کے درمیان توازن قائم کر لینے اور اس توازن کو باقی رکھنے میں ہے۔گھر کے افراد، ماں باپ، بھائی بہن اور دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ بیوی کے حقوق کی ادائیگی کچھ اس طرح کرنا کہ ان میں سے کسی کی بھی حق تلفی نہ ہو اور کسی کو بھی شکایت کا موقع نہ ملے، کامیاب ازدواجی زندگی کی سب سے اہم خوبی ہے۔

موجودہ معاشرے کے نوجوانوں میں خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، حقوق کے اس توازن کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کی فکر مفقود ہوتی جارہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ازدواجی رشتوں میں ایک تناؤ اور ایک بکھراؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی ہے۔ معاشرے میں خواہ مسلم معاشرہ ہو یا غیر مسلم، مشرق کا ہو یا مغرب کا، وہاں طلاق کا تناسب بڑھ رہا ہے۔رشتوں میں عدم توازن، باہمی ایثار و قربانی اور جذباتی محبت کی کمی رشتوں کو متاثر کر رہی ہے۔میاں بیوی کا رشتہ اعتماد اور بھروسے پر قائم رہتا ہے جب کبھی دونوں میں اعتماد اور بھروسے کی بنیادیں ہلتی ہیں تو اس رشتے کی بنیادیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں اور یہ رشتہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔اگر دونوں میں اعتماد اور بھروسے کی بنیادیں مضبوط رہیں گی تو یہ رشتہ بھی مضبوط تر ہوتا جائے گا۔

شوہر اور بیوی میں سے ہر ایک کو جب نکاح، اولاد اور ان دونوں کے علاوہ ان کے ساتھ جڑے ہر ایک فرد کے حقوق کی حکمتیں اور اس کی ادائیگی کی حکمتیں معلوم نہیں ہوں گی تب تک حقوق کی ادائیگی محض رسم و رواج اور ریا اور نمود و نمائش کی حد تک تو قائم رہے گی مگر اس کی اصل روح کی معرفت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے خاندان نظام بگاڑ اور فساد کا شکار رہے گا۔

عائلی زندگی میں حکمت کی قرآنی تعلیمات

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِـيْمًا﴾[1]

اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر مردوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور مانگو اللہ سے اس کا فضل بیشک اللہ کو ہر چیز معلوم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مردوں کو کچھ اوصاف میں عورتوں پر فضیلت دی ہے، اگر غور اور تدبر و تفکر کیا جائے تو انسان کے سامنے کچھ حیثیتیں واضح ہو جائیں گی جن سے عورت اور مرد کے فرق کو سمجھا جا سکے گا، اسی طرح رنگ و نسل،

۱۔ النسآء: ۳۲/۴

آواز، طاقت، اعضا کی سلامتی اور معذوری کا فرق اور اسی طرح جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے فرق کے اندر خاص حکمت رکھی گئی ہے، علامہ مودودی لکھتے ہیں:

"کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں سے کوئی قوت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی دوسری قوت۔ کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں۔ کسی کو زیادہ ذرائع دیے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی فرق و امتیاز پر انسانی تمدن کی ساری گوناگونی قائم ہے اور یہ عین مقتضائے حکمت ہے۔"[1]

یعنی اپنی حالت سے اور اپنی چادر سے نکل کر دوسروں جیسا بننے کی کوشش میں شریعت اسلامیہ کی حدود سے نکل جانا عین حکمت نہیں ہے بلکہ عین حکمت یہ ہے کہ اپنے ذرائع اور وسائل کو حلال وحرام کی قیود کے اندر رہ کر اپنی حالت بہتر بنائی جائے اور جسمانی اور ذہنی قوتوں کے تفاوت میں حرص اور طمع سے پرہیز کیا جائے۔

حقوق زوجین میں توازن

ابو حیان اندلسی زوجین کے حقوق کے درمیان توازن واعتدال کے اصول اور حکمت بیان کرتے ہوئے سورۃ النساء کی آیت کریمہ[2] کے تحت لکھتے ہیں:

"الظاهر أنها منشأة من آدم نفسه، ويحتمل أن يكون المعنى في قوله منها: من جنسه لا من نفسه حقيقة،بل اشتركا في الإنسانية، فهما متساويان فيها، وهو السر في ذكر لفظ زوجهاليشعر بالمشاكلة والمجانسة والاقتران"[3]

الفاظ کے ظاہری مفہوم سے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ زوجہ (عورت) بھی نفس آدم سے ہی پیدا ہوئی اور الفاظ کے ظاہر سے یہی احتمال ہے کہ من جنس کے لیے ہے نہ کہ من کا مفہوم یہ ہو کہ اس کے ذات سے، بلکہ اصل معنی یہ ہے کہ انسانیت میں مرد اور عورت مشترک ہیں اور اس شرکت میں کسی دوسرے کو بھی پہلے پر فضیلت اور فوقیت حاصل نہیں ہے، اور لفظ (زوجھا) ذکر کرنے کا مقصد اور حکمت یہ ہے کہ تاکہ مرد اور عورت کی آپس میں مشاکلت، مجانست اور قریبی تعلق واضح ہو جائے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیوی اور شوہر کے درمیان حقوق میں توازن اور اعتدال کا اصول خود قرآن کریم نے دیا ہے تاکہ حقوق کی ادائیگی کے وقت کوئی اپنے آپ کو دوسرے پر برتر اور اعلیٰ نہ سمجھے۔ اسی طرح قرآن کریم کی ایک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾[4]

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ بنا دیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی، البتہ اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کیلئے جو دھیان کرتے ہیں

۱۔ المودودی، تفہیم القرآن، ۲۵/۳

۲۔ وَّخَلَقَ مِنْها زَوْجَهَا (النساء: ۱/۴)

۳۔ الاندلسی، البحر المحیط، ۱۵۳/۳، اسی بات کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: ابن قیم: التفسیر القیم، ۱۳۲/۳

۴۔ الروم: ۲۱/۳۰

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ خازن لکھتے ہیں:

"أي جعل من جنسكم من بني آدم أزواجاً لتميلوا إليهن وتألفوهن، وجعل بين الزوجين مودة ورحمة فهما يتوادان ويتراحمان من غير سابقة معرفة ولا قرابة ولا سبب يوجب التعاطف وما من شيء أحب من أحدهما للآخر"

اللہ تعالیٰ نے ایک ہی جنس سے مرد اور عورت کو بنایا تاکہ دونوں کے مابین میلان اور انس اور محبت کا رشتہ قائم اور مستحکم رہے، اللہ تعالیٰ نے مرد اور بیوی کے درمیان محبت اور شفقت رکھی ہے، اسی حکمت کے تحت وہ ایک دوسرے سے گہری محبت کرتے ہیں حالانکہ نکاح سے پہلے ان کے درمیان کسی بھی قسم کا تعلق معرفت نہیں ہوتی اور دونوں بغیر کسی قرابت داری وغیرہ کا کیے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ خلوص دل سے محبت کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ نے دونوں کے مابین حقوق کی ادائیگی میں دونوں کو ایک جیسا کردار ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی نکتہ کو معاشرے کے ہر فرد (مرد و عورت) کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ نکاح سے پہلے عدم معرفت اور نکاح کے بعد مکمل قرابت داری اور معرفت کے طریقے پر حقوق لازم ہیں اور اس کے اندر جتنا خلوص ہو گا اسی قدر ان حقوق کے اندر پوشیدہ حکمتوں کے سمجھنے میں مدد ملے گی، یہی علامہ خازن کا مدعا ہے۔

سورۃ النحل میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُونَ﴾[1]

اور اللہ ہی نے بنائیں تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں اور اس نے بنائے تمہارے لیے تمہاری بیویوں میں سے بیٹے اور پوتے اور اس نے روزی دی تم کو پاک چیزوں سے پس کیا باطل پر تو یقین کرتے اور نعمت الٰہی کا انکار کرتے ہیں؟

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی تخلیق میں سب سے پہلے زوجین کی تخلیق فرمائی، اس میں حکمت یہ ہے کہ زوجین کے درمیان انس و محبت میں اضافہ ہو، انسانی نسل کا اضافہ انہی کے توسط سے ممکن بنایا گیا اور ان دونوں میں سے کسی ایک کے بغیر بھی انسان کی تخلیق عادتاً نہیں ہوتی، اسی طرح انسان کی نسل کو اپنے اصول یعنی ماں اور باپ کی طرف منسوب کیا گیا تاکہ نسب کی حفاظت کو ممکن بنایا جا سکے، جیسا کہ سورۃ الروم[2] میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک نفس سے تخلیق کی حکمت زوجین کے درمیان محبت و مودت اور رحمت کو قرار دیا ہے۔ اور اسی سے توازن اور اعتدال کی صورت پیدا ہوتی ہے کہ دونوں اپنے اپنے حقوق اور ذمہ داری کی ادائیگی میں ذمہ داری کا مظاہرہ کریں۔[3]

اگر مرد کی طرف سے معاشرے میں یہ خیال کیا جائے کہ اس کے حقوق زیادہ اور اس پر ذمہ داریاں کم ہیں تو قرآن کریم کا ارشاد ہے:

۱۔ النحل: ۱۶/۷۲

۲۔ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (الروم: ۳۰/۲۱)

۳۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۲/۲۱۱

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾[1]

اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے مواقع

علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

"بالوجه الذي لا ينكر في الشرع وعادات الناس فلا يكلفنهم ما ليس لهنّ ولا يكلفونهنّ ما ليس لهم ولا يعنف أحد الزوجين صاحبه"[2]

معروف طریقے سے مراد یہ ہے کہ جو عادات اور شریعت اسلامیہ میں ناجائز اور نامناسب نہ ہو اور نہ ہی عورت اور نہ ہی مرد دونوں پر تکلیف دہ ہو اس طرح دونوں ایک دوسرے کو سزوار یا تکلیف نہ پہنچائیں۔

یعنی عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں، قرآن کریم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے عورت کو بھی اسی طریقے سے حقوق دیئے ہیں جیسا کہ مرد کو عطا کیے ہیں۔ قرآن کریم نے مرد کو قوام بمعنی حکمران کا منصب اور وصف عطا فرمایا ہے تو اس کا ایک مقصد، مصلحت اور حکمت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوت عملیہ میں علم تدبیر منزل اور علم سیاست مدنیہ میں امور خانہ داری سے لے کر ملکی اور معاشرے کے نظم و نسق کو چلانے کی صحیح تدبیر اور حکمت مرد کو عطا کی گئی ہے، ابن العربی لکھتے ہیں:

"فإن قوامية الرجل على المرأة ضرورة تضبطها القواعد الشرعية التي تعزز معاني الرأفة والمودة والرحمة، وتوزيع المهام بين أفراد الأسرة بما يحفظ الأسرة ويضمن استقرارها. فالقوامة تنطوي على معنى الشراكة بين الزوجين في الحقوق"[3]

عورت پر مرد کی بالادستی ایک ایسی ضرورت ہے جو شرعی احکام کے ذریعے منضبط کی گئی ہے جو ہمدردی، پیار اور رحم کے معنی کو بڑھاتی ہے اور خاندان کے افراد کے درمیان کاموں کی اس طرح تقسیم کرتی ہے جس سے خاندان کا تحفظ ہو اور استحکام کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔ سرپرستی سے مراد میاں بیوی کے درمیان حقوق میں شراکت داری ہے۔

آپ کے نزدیک مرد کی بالادستی کے اندر خاص حکمت رکھی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مرد خاندان اور گھر کا اور خصوصاً بیوی پر قوام اور حاکم ہونا پیار اور ہمدردی اور رحم کو لازم کرتا ہے، مرد خاندان سے جُڑے ہر فرد کی ذمہ داریوں کو ذہنی صلاحیتوں کی بناء پر عورت سے زیادہ سمجھتا اور ان کی ادائیگی کے لیے کوشش کر سکتا ہے، نیز قوام کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ دونوں اپنے اپنے حقوق میں برابر کے شریک ہیں۔

۱۔ النحل: ۱۶/۷۲

۲۔ الزمخشری، الکشاف، ۱/۲۷۲

۳۔ ابن العربی، احکام القرآن، ۱/۴۱۶

فصل سوم

معاشرتی زندگی میں حکمت کی قرآنی تعلیمات اور حکمت کے تفسیری اطلاقات

مبحث اول

ذوی القربی کے حقوق اور صلہ رحمی میں حکمت کے تفسیری اطلاقات

باہمی معاملات کی اصلاح اور درستگی اور صالح معاشرہ کے لیے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک حکمت عملیہ کا لازمی جزو ہے، انسان کی زندگی میں اکثر اوقات جھگڑے اور نزاع کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان قریبی رشتہ داروں یعنی ذوی القربی کے حقوق کا صحیح طور پر خیال نہیں رکھتا، قرآن کریم نے اس پہلو کو بھی جامع انداز میں بیان فرمایا ہے:

﴿وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى﴾[1]

اور اپنے مال اس کی محبت کے باوجود قرابت مندوں پر خرچ کریں

اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک، ان کے مسائل اور ان کے حقوق کو خوش اسلوبی سے ادا کرنا اوصاف نبوت میں شامل ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ ﷺ گھر تشریف لائے اور آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو تسلی دیتے وقت جہاں آپ ﷺ کے اور اوصاف حمیدہ بیان فرمائے وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا:

(فَقَالَتْ خَدِيجَةُ كَلَّا وَاللَّهِ مَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ)[2]

(اُم المؤمنین حضرت عائشہ سے مروی حدیث) پس حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہر گز اللہ تعالیٰ آپ کو غمگین نہیں کرے گا آپ تو صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رشہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی انبیاء علیہم السلام کے کمالات میں سے ایک کمال ہے اور ایک خاص وصف ہے۔

قریبی رشہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ایک انسان خصوصا مسلمان کو قوم اور قبیلہ میں قابل احترام بنا دیتا ہے اور وہ شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مکرم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ایک اور مقام[3] پر قرابت داروں کے حقوق

۱۔ البقرہ: ۲/۱۷۷

۲۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، (بیروت: دار الطوق النجاۃ)، باب كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ۱/۷، رقم الحدیث ۳۔

۳۔ وَالَّذِينَ يَصِلُونَ ما أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخافُونَ سُوءَ الْحِسابِ (اور جو اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور سخت حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔) (الرعد: ۲۱/۱۳)

کی رعایت کرنے والوں کی خوبی بیان فرمائی ہے اور ان کے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر وثواب کو متعین فرمایا ہے۔امام رازی لکھتے ہیں:

"فیدخل فیه صلة الرحم وصلة القرابة الثابتةبسبب أخوة الإيمان"[1]

صلہ رحمی اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ یہ عمل ایمان میں اخوت کو بڑھانے کا سبب ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کے اندر حکمت یہ ہے کہ اخوت اور بھائی چارہ کی ترقی ہو اور اس عمل کی وجہ سے معاشرے میں جھگڑے اور فساد کی جگہ امن اور بھائی چارے کو فروغ ملے۔

آپ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پاسداری کے لیے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں، اگر ایک مسلماں اپنے حسن سلوک کی ابتداء اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ کرے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو گی ،آپ کے نزدیک رشتہ داروں کے حقوق میں صدقات وخیرات ، ان پر آنے والے مصائب اور مشکلات کے خاتمے کے لیے حتی الوسع اور حتی الامکان کوشش کرنا، بیماروں کی عیادت ، رشتہ داروں میں سے فوت ہونے والوں کی نماز جنازہ پر شرکت کو لازمی جاننا، سلام کو عام کرنا اور رشتہ داروں کے لیے نفع بخشش بننا اور ان کو تکلیف اور ایذاء دینے سے اجتناب کرنا شامل ہے۔

علامہ اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

"صلہ رحمی کی تاکید والدین سے لے کر غلاموں اور باندیوں ، غرض معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کے ساتھ ہو رہی ہے اور اس کی حکمت یہ بھی ہے کہ اس حکم کا عطف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ہو رہا ہے ، دنیا کی کسی کتاب میں صلہ رحمی کی اتنی تاکید نہیں ملے گی ،اہل حقوق اگر کافر ہوں تب بھی ان کے ساتھ احسان کرے البتہ مسلمان کا حق اسلام کی وجہ سے ان سے زیادہ ہو گا۔"[2]

علامہ تھانوی کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی کی کچھ حکمتیں عیاں ہیں اور کچھ پوشیدہ، لیکن اس کی اتنی زیادہ تاکید ہونے کی وجہ سے اس عمل کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

قرآن کریم میں مستعمل (الْأَرْحَامَ) کا اطلاق نہایت ہی وسیع ہے ، تمام اعزہ اور اقربا اور اہل خاندان کے تمام افراد اس کے اندر آتے ہیں اور انسان کے ذاتی ، خانگی اور اجتماعی معاملات کا خود اللہ تعالیٰ نگران ہے اگر یہی بات صلہ رحمی کے وقت پیش نظر رہے تو امت مسلمہ کے خاندانی نظام بہت خوشگوار ہو سکتا ہے۔[3]، اس طور پر صلہ رحمی

۱۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۳۴/۱۹

۲۔ التھانوی، بیان القرآن، ص۲۷۷

۳۔ الماجدی، تفسیر ماجدی، ۹۱/۳

کرنے والے کے سامنے ماں اور باپ کی طرف سے اور سسرالی خاندان کی طرف سے بھی تمام رشتہ دار ہوتے ہیں، اسی وجہ سے علامہ قرطبیؒ نے بھی لکھا ہے کہ

"اتفقت الملة على ان صلة الرحم واجبة وان قطعيتها محرمة" [1]

ملت اسلامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی قطع رحمی کرے پھر بھی اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنا واجب ہے۔

صلہ رحمی جیسا کہ نام سے ظاہر اور واضح ہے کہ دوسروں پر حد درجہ رحم اور مہربانی کا معاملہ کرنا، اسی وجہ سے اس کا نام ارحام اور رحم رکھا گیا ہے، رحم یعنی قرابت داری کو اپنے نام رحمٰن سے نکالا گیا ہے اور رحمٰن کا معنی بے حد مہربان ہے لہٰذا ہر انسان کو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نہایت مہربانی کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ [2]

اکثر اوقات رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی وجوہات میں خود نمائی، دکھاوا وغیرہ جیسے عناصر شامل ہوتے ہیں لیکن قرآن کریم جن لوگوں کے اوصاف بیان فرمارہا ہے اور جن کو اس عظیم عمل پر اجر وثواب کا وعدہ کررہا ہے وہ ایسے ہیں کہ ان کے دلوں میں خلوص ہوتا ہے جیسا کہ امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"ایسے لوگ کسی نمود و نمائش یا غرض کے لیے نہیں بلکہ خدا کے ڈر سے اور اس کی رضاجوئی کے لیے کرتے ہیں۔" [3]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضا کے حصول کا ذریعہ اور شرط یہ ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک میں کسی قسم کا دکھلاوا وغیرہ نہ کیا جائے۔

جس مسلمان کے دل میں جتنا زیادہ خوف خدا اور اللہ تعالیٰ کی خشیت ہوگی، اس کا کردار اتنا ہی زیادہ پاکیزہ اور حسین ہوگا۔ [4]، رشتہ داروں سے حسن سلوک شعائر اسلام میں سے ہے [5]، جس سے واضح ہوتا ہے کہ حکمت عملیہ کی یہ جز جس کو ذوی القربی کے حقوق سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ بھی تدبیر منزل کے تحت آتی ہے اس کو حکمت عملیہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

سورۃ الرعد کی اس آیت کریمہ

﴿وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۙ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ﴾ [6]

۱۔ القرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۲۱۹/۴

۲۔ السواتی، معالم العرفان، ۱۴۶/۲

۳۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۱۸۳/۴

۴۔ الماجدی، تفسیر ماجدی، ۱۷۷/۳

۵۔ الندوی، سراج البیان، ۹۷/۳

۶۔ الرعد: ۲۵/۱۳

میں اللہ تعالیٰ نے گویا ایک کلی قاعدہ بیان فرمایا ہے، ایسے لوگو کہ جن کو جس قسم کے حقوق اور جن روابط کو جوڑنے کا حکم دیا گیا ان کو اسی طرح جوڑے رکھتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور وہ اطاعت سے منہ نہیں موڑتے، اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت کریمہ میں تمام احکامات کو ایک جملے کے تحت بیان فرمادیا ہے۔ اگرچہ ہر ایک رشتہ دار کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق کو الگ الگ بیان کرنا بھی ممکن تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت کریمہ میں ایک قانون بیان فرمادیا ہے، رشہ داروں کے ساتھ حسن سلوک انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور ایک مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا ہے اس کو ہر لمحہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا احساس ہوتا ہے۔[1]

صلہ رحمی کے اندر تقویٰ کی حکمت

انسان کے اندر برائی پر ابھارنے والی قوتیں جب سر گرم ہوتی ہیں تو انسان نیک اعمال کو بری نیت کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ بظاہر یہ کام معاشرے کی نظروں میں اچھا اور بھلا معلوم ہو، اس طرح صلہ رحمی کے اندر تقویٰ اور پرہیزگاری کا ہونا ضروری ہے اس لیے قرآن مجید

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾[2]

میں ارحام کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کے ساتھ تقوی کی تاکید کی گئی اور ساتھ ہی فرمایا گیا:

﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾[3]

قرابت والوں سے بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے۔

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ صلہ رحمی کے اعمال میں بھی تم پر نگران ہے اگر رسمی طور پر شرم محسوس کرتے ہوئے اور بے دلی سے تم نے صلہ رحمی کا کوئی حق ادا بھی کر دیا مگر دل میں ایثار کا جذبہ نہ تھا تو یہ عمل قبول نہیں ہوگا۔"[4]

ثابت ہوتا ہے کہ صلہ رحمی احسان کا فرد کامل ہے، اس لیے قرآن کریم میں خاص طور پر اس کو الگ سے ذکر کیا گیا کیونکہ قریبی رشتہ داروں کو مال و دولت دینا اور ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا عظیم عبادت ہے، جس شخص میں یہ تین صفات یعنی عدل، احسان اور صلہ رحمی جمع ہو گئیں اس کی قوت عقلیہ اور ملکیہ مکمل اور مہذب ہو گئی۔[5]

۱۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۹۴/۴

۲۔ النساء: ۱/۴

۳۔ النساء: ۱/۴

۴۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۲۸۱/۲

۵۔ الکاندھلوی، معارف القرآن، ۷۱/۲

تقویٰ کی اہمیت صلہ رحمی کے اندر نہایت اہمیت کی حامل ہے، مفسرین کے نزدیک اس کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ حقوق کی ادائیگی کے وقت یہ خیال رہے کہ ایک ذات ہمہ وقت اور ہمہ جہت ہم پر نگران ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں کتنے مخلص اور فرمانبردار ہو اور حقوق میں کسی قسم کی کمی بیشی اور کوتاہی اللہ تعالیٰ سے کبھی بھی چھپ نہیں سکتی، لہذا حکم کے عین مطابق حقوق کی ادائیگی کرنا ضروری ہے۔

مبحث دوم

ہمسایہ کے حقوق میں قرآنی حکمت کے تفسیری اطلاقات

کسی بھی نظام زندگی کی اصل آزمائش اس کے معاشرتی نظام میں ہوتی ہے جس سے کسی نظام کے مقام اور مرتبہ کا تعین کیا جاتا ہے۔ معاشرتی نظام کے ایک اہم پہلو کا تعلق پڑوس کے حقوق کے ساتھ ہے۔ دراصل پوری انسانی سوسائٹی پڑوسیوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسی زنجیر ہے جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوست ہوتی ہے ۔اس طرح دنیا کا ہر شخص ایک دوسرے کا پڑوسی ہے۔اس سلسلہ میں پڑوسی ایک وسیع ہمہ گیر اور مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ اسلام کے پیش نظر ایک اعلیٰ اور پاکیزہ انسانی معاشرہ کی تشکیل ضروری ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے پڑوسیوں کے مرتبہ کو بہت ہی اہمیت دی گئی ہے۔اسلامی معاشرے میں ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے باہمی تعلق اور محبت ایک جسم کی مانند ہوتی ہے کہ اگر ایک عضو بیمار پڑتا ہے تو پورا جسم اسکی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ مسلمانوں کا باہمی تعلق اسطرح ہے جس طرح ایک اینٹ دوسری اینٹ پر لگنے سے عمارت مضبوط ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں گھروں یا بالفاظ دیگر پڑوسیوں کا مقام بھی بلڈنگ میں لگی ہوئی اینٹوں کی طرح ہے جو ہمسائیگی کے رشتوں کو مستحکم کرتی ہے۔

علم تدبیر منزل کے ارکان میں سے ایک اہم رکن پڑوسیوں کے حقوق کی پہچان اور ان حقوق کے اندر رکھی گئی حکمتوں کو سمجھنا ہے۔ معاشرے کے اندر بسنے والے افراد کے ایک دوسرے پر حقوق لازم ہیں لیکن ان میں اپنی قریبی اور دور کے رشتہ داروں کے علاوہ ایسے افراد بھی شامل ہیں جن سے خاندانی طور پر تعلق تو نہیں لیکن چار دیواری کے ساتھ جڑے گھر اور افراد کے بھی حقوق رکھے گئے ہیں اور ان کی حکمتیں بھی بیان کی گئیں ہیں۔ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ﴾[1]

اور بندگی کرو اللہ کی اور شریک نہ کرو اس کا کسی کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور قرابت والوں کے ساتھ اور یتیموں اور فقیروں اور ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے

۱۔ النساء: ۳۶/۴

اور مسافر کے ساتھ اور اپنے ہاتھ کے مال یعنی غلام باندیوں کے ساتھ بیشک اللہ کو پسند نہیں آتا اترانے والا بڑائی کرنے والا جو کہ بخل کرتے ہیں

جار جنب سے مراد ایسا قریبی گھر جس پر پڑوسی ہونے کا اطلاق ہوتا ہو اگرچہ اس کا گھر دور ہو لیکن اگر اس کو پڑوسی کہا جاتا ہو تو وہ جار جنب اور اس کے حقوق میں شامل ہو گا۔امام طبری، قرطبیؒ اور ابن کثیر کی یہی رائے ہے۔[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات وہدایات میں ہمسائیگی اور پڑوس کے اس تعلق کو بڑی عظمت بخشی ہے اور اس کے احترام ورعایت کی بڑی تاکید فرمائی ہے کہ اس کو جزو ایمان اور جنت میں داخلہ کی شرط قرار دیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا معیار قرار دیا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مَازَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِى بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّه سَيُوَرِّثُه'' [2]

جبریل امین ہمیشہ مجھے پڑوسی کی رعایت وامداد کی اس قدر تاکید کرتے رہے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسیوں کو بھی رشتہ داروں کی طرح وراثت میں شریک کر دیا جائے گا۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنا اور اچھا رویہ پیش کرنا اللہ اور اس کے رسول کی محبت کی شرط اور اس کا معیار قرار دیا گیا ہے۔

ایک ملک اور ایک شہر اور گاؤں کے اندر مختلف افراد اکھٹے رہتے ہیں جن کے مکان اور گھر آپس میں جڑے ہوتے ہیں اس طرح چاروں اطراف میں ہمسائے اور پڑوسی کا اطلاق ہوتا ہے، امام قرطبیؒ نے حضرت عائشہ، اوزاعی، حسن بصری کے قول نقل کیے ہیں جن میں یہ بات ہر جگہ ملتی ہے کہ چاروں طرف سے جو گھر بھی قریب ہیں ان پر جار جنب کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح چاروں طرف چالیس چالیس گھر جار جنب اور اس کے حقوق میں شامل ہوں گے[3]،جب کہ امام آلوسی لکھتے ہیں:

''والراجح أن حد الجوار يرجع فيه إلى العرف'' [4]

راجح قول کے مطابق عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔

عرف سے مراد یہ ہے کہ ایک گلی اور محلے میں ایک گھر کو دوسرے گھر کا پڑوسی مانا اور کہا جائے تو اس طرح اس شخص اور اس گھر پر اس دوسرے گھر کے وہ حقوق جو ہمسائے کے ہیں، لازم اور ضروری ہوں گے۔

۱۔ ملاحظہ فرمائیں: طبری، جامع البیان، ۱۸۰/۵، قرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۱۸۱/۵، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۴۹۵/۱

۲۔ البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الادب، باب الوصاۃ بالجار، ۱۰/۸۔ رقم ۶۰۱۴

۳۔ القرطبیؒ، الجامع لاحکام القرآن، ۱۸۱/۵

۴۔ الآلوسی، روح المعانی، ۲۹/۵

ایک مسلمان پر تین طرح کے پڑوسیوں کے حقوق لازم ہیں، ایسے گھرانے جو قریب ہیں اور ان کے ساتھ تعلق بھی ہے اور دوسرے ایسے گھرانے جو پڑوسی ہونے کے اعتبار سے گھر کے قریب ہیں مگر ان کے ساتھ خاندانی تعلق نہیں ہے ، اسی طرح جو آدمی عارضی طور پر کسی دوسرے شخص سے کسی مجلس، حلقہ ، گاڑی یا کسی دوکان وغیرہ میں ملا ہو یا اس کے ساتھ سفر کیا ہو وہ بھی قریبی پڑوسی کے زمرے میں آتا ہے، لہٰذا ان تین قسم کے پڑوسیوں کے حقوق لازم ہیں۔[1]

ثناء اللہ امر تسری ہر طرح کے پڑوسیوں کے حقوق کو لازم کرنے اور ان کے حق دینے کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''اس کے اندر حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہمت اور طاقت عطا کی ہے کہ آپ اس کو مال میں سے کچھ عطا کریں یا اس کو نقصان پہنچانے سے گریز کریں تو اس طرح توفیق ہوتے مخلوق سے احسان نہ کرنا ایک طرح سے تکبر ہے اور اللہ تعالیٰ متکبروں اترانے والوں سے محبت نہیں کیا کرتا۔''[2]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان کے مال و دولت کے اندر رشتہ داروں کے علاوہ دور اور قریب کے پڑوسیوں کا بھی حق ہے۔ اور اسی حکمت کی وجہ سے جار جنب اور صاحب جنب کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں تاکہ ہر طرح کا پڑوسی اس حق میں شامل ہو سکے۔ اور ابو بکر الجصاص نے بھی یہی لکھا ہے کہ جب لفظ تمام معانی کو شامل ہے تو ہر طرح کا پڑوسی شامل ہو گا۔[3]

ایک شخص اپنے قریبی پڑوسی کے ساتھ رشتہ دار کے مقابلے میں زیادہ ملنسار ہو سکتا ہے، اس لیے دونوں پڑوسیوں کے لیے بہتر ہے کہ آپس میں تعاون کریں، اس طرح سے دونوں کے درمیان رحم اور احسان والا معاملہ جاری رہے گا،علامہ ابن عاشور بھی پڑوسی کے حقوق ادا کرنے اور اس کی تاکید کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''والعرب معروفون بحفظ الجوار والإحسان إلى الجار، وأقوالهم في ذلك كثيرة، فأكد ذلك في الإسلام لأنه من محامد العرب التي جاء الإسلام لتكميلها من مكارم الأخلاق، ومن ذلك الإحسان إلى الجار''[4]
>
> عرب ہمسایہ کے پڑوس اور خیرات کے تحفظ کے لیے جانے جاتے ہیں اور ہمسائیوں کے حقوق کے بارے میں ان کو اقوال بہت زیادہ ہیں، پس اسلام میں اس کی تاکید اس لئے کی جاتی ہے کہ یہ

۱۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۵۱/۳، قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۷۸/۴

۲۔ امر تسری، ثناء اللہ، تفسیر ثنائی، ۹۹/۲

۳۔ الجصاص، احکام القرآن، ۲۳۳/۲

۴۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۵۰/۵

عرب کی روایات میں سے ایک ہے اس لیے کہ دین اسلام اخلاقیات کی تکمیل کے لیے آیا ہے اور ان اخلاقیات میں پڑوسی کا حصہ اور اس کا حق بھی شامل ہے۔

علامہ مراغی لکھتے ہیں:

''فإذا لم يحسن أحدهما إلى الآخر فلا خير فيهما لسائر الناس ، وقد حث الدين على الإحسان فى معاملة الجار ولو غير مسلم''[1]

اگر ان میں سے ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تو باقی لوگوں کے لیے ان میں کوئی خیر نہیں ہو سکتی، دین اسلام نے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔

قرآن کریم نے خاص طور پر ''صاحب بالجنب'' کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید بظاہر اس حکمت کے پیش نظر فرمائی ہے کہ انسان کی شرافت وخوش اخلاقی کا اصل مظاہرہ ایسے ہی موقعوں پر ہوتا ہے، اچھے اچھے بظاہر مہذب، بااخلاق، شائستہ ہوتے ہیں لیکن کبھی کسی انجانے اور اجنبی سے واسطہ اور سابقہ پڑا یا سفر وغیرہ کی نوبت پیش آئی تو وہ تہذیب وتمدن سے عاری اور خوش اخلاقی کے بجائے بداخلاقی کا مظاہرہ اور وہ بھی ایسی کہ انھوں نے اپنے ہم سفروں کے ساتھ پرلے درجے کی خود غرضی کا برتاؤ اور سنگدلی کرتے نظر آتے ہیں۔انسان کی خوش خلقی اور بد خلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، حدیث مبارکہ میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ رَجُلٌ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَيْفَ لِي أَنْ أَعْلَمَ إِذَا أَحْسَنْتُ وَإِذَا أَسَأْتُ؟ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " إِذَا سَمِعْتَ جِيرَانَكَ يَقُولُونَ: أَنْ قَدْ أَحْسَنْتَ فَقَدْ أَحْسَنْتَ , وَإِذَا سَمِعْتَهُمْ يَقُولُونَ قَدْ أَسَأْتَ فَقَدْ أَسَأْتَ).[2]

حضرت عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: جب میں کوئی اچھا کام کروں تو کیسے سمجھوں کہ میں نے اچھا کام کیا ہے؟اور جب برا کام کروں تو کیسے جانوں کہ میں نے برا کام کیا ہے؟آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جب تم اپنے پڑوسیوں کو کہتے ہوئے سنو کہ تم نے اچھا کام کیا ہے، تو سمجھ لو کہ تم نے اچھا کام کیا ہے،اور جب تمہارے پڑوسی کہیں کہ تم نے برا کام کیا ہے، تو سمجھ لو کہ تم نے برا کام کیا ہے''۔

۱۔ المراغی، تفسیر المراغی، ۴/۳۳۷

۲۔ ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب: الثَّناءِ الْحَسَنِ، 4223(تفرد بہ ابن ماجہ، (تحفۃ الأشراف: 9310، ومصباح الزجاجۃ: 1510)، وقد أخرجہ: مسند احمد (402/1) (صحیح)» قال الشیخ الألبانی: صحیح

اس سے واضح ہوا کہ ہمسایہ کے حقوق کی تاکید کے اندر ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اسلامی روایات اور تشخص کو مضبوط اور مستحکم کیا جاسکے نیز یہ حکمت بھی ہے کہ انسان اور اس کی تمدنی زندگی کی بنیاد باہمی اشتراک اور آپس میں تعاون کے ساتھ قائم ہے، ہر انسان دوسرے انسان کا کسی نہ کسی اعتبار سے محتاج ہے اور ہر ایک کی محتاجی کا مداوا دوسرے انسان کے ساتھ جڑا ہے لہٰذا اسی حکمت کے پیش نظر یہ تاکید کی گئی ہے، تاکہ ضروریات زندگی کی بھی تکمیل ہو سکے اور معاشرے میں امن وسکون کے ساتھ ساتھ اخوت اور بھائی چارہ بھی قائم ہو سکے۔

خلاصہ

قرآنی کریم کی اصطلاح الحکمۃ کا تعلق دین کی دعوت کے اندر خاص اہمیت کا حامل ہے، دین کی دعوت کے لیے خاص قسم کے داعی کی ضرورت نہیں کہ جس میں خاص شرائط وضوابط ہوں بلکہ ہر فرد جو دین اسلام کا ماننے والا ہے، اس کے لیے اہل ہے کیونکہ قرآن کریم کا حکم تقاضا کرتا ہے کہ ہر بہتر کام جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی شامل ہو اس کی طرف دعوت دی جائے اور ہر بُرے کام سے منع کیا جائے۔ حکمت کا دوسرا رکن داعی کے لیے حکمت کو مد نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ قرآن کریم کے مطابق کردار کی اصلاح، باطن کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اخلاق حسنہ کے تمام عوامل پر داعی کو نظر رکھنی ہو گی۔ اسی طرح حکمت کا تیسرا رکن مدعو جس کو دین کی دعوت دی جارہی ہے، اس کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ داعی کتنی خوش اسلوبی سے اور کتنی محنت سے دین کی دعوت دے رہا ہے۔ تو اگر ایمان کی بات اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی بات ہے تو ضروری داعی کی دعوت پر لبیک کہنا چاہیے اور مدعو کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرے میں پھیلی برائیوں جیسے فسق وفجور وغیرہ سے اجتناب کرے تاکہ دین کی صحیح راہ اور صحیح دعوت اس تک پہنچ سکے۔

قرآن کریم میں تہذیب نفس کے اصلاحی پہلو بیان کیے ہیں اور ان کے اندر مختلف طریقے سے ان کی حکمت بھی بیان کی ہیں۔ مفسرین کرام نے ان آیات کی تفسیر میں انسانی کے ظاہر اور باطن کی اصلاح کے لیے اپنے اپنے مؤقف کے مطابق حکمت کے مظاہر اور اطلاقات بیان کیے ہیں۔ ایک انسان کس طرح اپنے ظاہر اور باطن کو سنوار سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی اصلاح کے لیے کس طرح اور کس قسم کی تعلیم اور حکمت کے پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ معاشرے میں بہتر زندگی گزارنے، وقت کے تقاضے کے مطابق اپنی ذات کو ڈھالنے اور اپنی اصلاح کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

حکمت عملیہ کی دوسری قسم میں تدبیر منزل شامل ہے، جس کے اندر ایک خاندان کی اصلاحی پہلو اور ان کے بہترین نظم ونسق کے لیے تدبیر کی جاتی ہے، خاندان کو ایسے منظم اور مربوط انداز میں چلانے کی حکمت عملی اپنائی جاتی ہے کہ دین اور دنیا دونوں پہلوؤں سے خاندان ایک مثالی ہو اور اس خاندان کے ساتھ تعلق رکھنے والے تمام افراد کی دین اور دنیا بہتر ہو سکے۔ بیوی، شوہر، بچوں اور پڑوسیوں نیز رشتہ داروں کے حقوق کس طرح بہتر

طریقے سے ادا کیے جا سکتے ہیں۔ بیوی کے حقوق میں نان ونفقہ کے ساتھ بیوی کی غلطیوں کی اصلاح ضروری ہے اور قرآن کریم نے ان حقوق کے اندر جو حکمتیں اور مقاصد بیان کیے ہیں ان کو مد نظر رکھنا ضروری ہے، ساتھ ہی بیوی پر شوہر کے حقوق اور ان کے اندر پوشیدہ حکمتیں سمجھنی کی ضرورت ہے۔ خاندان کی اصلاح کے لیے اولاد کے حقوق میں قرآنی حکمتوں کے مظاہر بھی مد نظر رکھنے ضروری ہیں جن میں عدل وانصاف، حسب ونسب کی حفاظت اور تعلیم وتربیت جیسے حقوق شامل ہیں۔

باب چہارم

سیاست مدن و معاش و معیشت میں حکمت کے تصورات اور تفسیری اطلاقات

فصل اول: سیاست مدن میں حکمت کے تفسیری اطلاقات

مبحث اول: سیاست مدن کا مفہوم، خلافت کی ضرورت اور حاکم کی ذمہ داریاں

مبحث دوم: قانون و عدالت کا نفاذ اور اس کی حکمت کے تفسیری اطلاقات

مبحث سوم: تدریج و تنفیذ کی حکمت عملی اور اس کے تفسیری اطلاقات

فصل دوم: معیشت میں حکمت قرآنی کے اطلاقات

مبحث اول: اکتساب مال میں حدود و قیود کی حکمت کے تفسیری اطلاقات

مبحث دوم: صَرف مال میں حدود و قیود کی حکمت کے تفسیری اطلاقات

فصل اول

سیاست مدن میں حکمت کے تفسیری اطلاقات

مبحث اول

سیاست مدن کا مفہوم، خلافت کی ضرورت اور حاکم کی ذمہ داریاں

سیاست مدن کا مفہوم

سیاست مدن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ انسان اپنی شہری، دیہاتی اور آس پاس کی طرز زندگی اور اس میں رہنے والوں کو کس طرح بہترین طریقے سے سنوار سکتا ہے۔ اسلام کے بتائے ہوئے قوانین کو استعمال کر کے ان میں موجود خرابیوں کو کیسا دور کیا جاسکتا ہے۔ مدنی سیاست میں اس جیسے اور اسی قسم کے امور اور قوانین زیر بحث لائے جاتے ہیں اور ان کی اطلاقات کی طریقے اور حکمتیں بتائی جاتی ہیں۔ علامہ سیوطی (۱۴۴۵ء-۱۵۰۵ء) نے حکمت کی اقسام میں تہذیب نفس، تدبیر منزل کے بعد سیاست مدنیہ کو رکھا ہے، آپ لکھتے ہیں:

"الحِكْمَةُ المدنيةُ : هي العلم بأحوال تكون بينه وبين عامة الناس ، ويسمى العلم السياسي "[1].

لوگوں کے زندگی کو بہتر بنانے کے متعلق علوم کے جاننے کا نام حکمت مدنیہ ہے اور اس کو علم سیاسی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) کے نزدیک قرآن کریم میں عبادات کے ساتھ ساتھ دنیا کے معاملات اور سیاست کے احکامات کے اصول بھی بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن کریم جن علوم خمسہ کی بات کرتا ہے ان میں سیاسی علوم بھی داخل ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سلسلے میں بھی واضح تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔[2]

علامہ سعیدی (۱۹۳۷-۲۰۱۶ء) لکھتے ہیں:

"ایک شہر یا ملک کی اندرونی خرابیوں مثلاً چوری کی وارداتوں، ڈاکوں، بھتوں، لسانی اور مذہبی فسادات، سمگلنگ، چور بازاری، نقلی اور ملاوٹ والی اشیاء، نشہ آور چیزوں اور مخرب اخلاق کاموں کو روکنا اور شہر یا ملک کی خوش حالی، روزگاری کے مواقع اور عام ضروری اشیاء کو فراہم کرنا اسی طرح ملک کے خارجی اور بیرونی معاملات کو صحیح طور پر چلانا، تجارت اور دفاع کے شعبوں کو مضبوط اور منظم کرنا یہ سیاست مدنیہ ہے۔"[3]

۱۔ السیوطی، جلال الدین، معجم مقالید العلوم فی الحدود والرسوم (قاہرہ، مکتبہ الآداب، ۲۰۰۴ء)، ۱/۱۳۱

۲۔ شاہ ولی اللہ، قطب الدین، الفوز الکبیر، (کراچی، مکتبہ بنوریہ، ۲۰۰۹ء)، ص ۳۰

۳۔ السعیدی، تبیان القرآن، ۸/۳۰۳

یعنی آپ کے نزدیک قرآن کریم میں ایسے اُصول وضوابط بیان ہوئے ہیں جن کا تعلق سیاست مدنیہ سے ہے۔اور ان اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم حکمت عملی کے تحت گاؤں، شہر اور ملکی نظام وانصرام کو شریعت اسلامیہ کے قائم کردہ اصولوں اور حکمت کے تحت چلا سکتے ہیں۔اس فصل میں قرآن کریم میں بیان کردہ ان اصولوں کے بارے میں مفسرین کی آراء کا جائزہ لیا گیا ہے:

سیاست مدنیہ میں قوت عملیہ کا کردار

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دو قوتیں عطا کی ہیں قوت نظریہ اور قوت عملیہ قوت نظریہ ہی سے انسان توحید اور رسالت کے دلائل میں غور وفکر کر کے اللہ اور رسول پر ایمان لاتا ہے اور قوت عملیہ سے اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے حقوق ادا کرتا ہے اور سیاست مدنیہ میں قوت عملی کا یہی کردار ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی قوت عملیہ کا صحیح استعمال کر کے شہر اور ملک میں بسنے والے لوگوں کے حقوق کا صحیح تحفظ کر سکتا ہے اور ان کی اسلامی قوانین کے مطابق ادائیگی کر سکتا ہے۔[1]

ارشاد ربانی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾[2]

تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے

آیت کریمہ میں ولتکن میں لام تاکیدی ہے۔اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کار خیر کے لیے کسی جماعت کا ہونا کوئی عام قسم کی نصیحت نہیں ہے کہ جس پر عمل کر لیا جائے یا نہ کیا جائے، ایک ہی بات ہو۔ بلکہ تاکیداً فرمایا کہ ایسی جماعت لازمی ہونی چاہیئے۔ جو لوگوں کو خیر کی دعوت دے۔اس آیت کریمہ میں سیاست مدنیہ کی اصلاح کے تین اُصول بیان کی گئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہر وقت خیر کی اور نیکی کی دعوت دیتے رہیں۔ دوسرا اُصول یہ ہے کہ نیکیوں کا حکم کرتے رہیں اور تیسرا اُصول یہ کہ برائی سے منع کرتے رہیں۔ ظاہر ہے قرآن میں تدریجی طور پر صرف یہی تین اُصول ہیں۔مزید وضاحت صوفی عبدالحمید سواتی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ پہلے ہی حکم دے چکے ہیں۔کہ تقوی اختیار کرو۔قرآن پاک کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔آپس میں اتفاق واتحاد قائم رکھو۔اور بھائی بھائی بن کر زندگی بسر کرو اور اپنے قول اور عمل سے کتاب اللہ اور سنت رسول پر عمل پیرا ہو جاؤ۔اور اب یہاں دعوت الی الخیر، امر

۱۔ ایضاً، ۲۰۷/۶

۲۔ آل عمران: ۱۱۰/۳

بالمعروف اور نہی عن المنکر کا درس دے کر قوم و ملت کو بیدار رہنے اور اپنی خصوصیات کو باقی رکھنے کا اہتمام فرمایا ہے۔"[1]

لیکن یہاں ایک اور قابل غور نکتہ یہ بھی ہے کہ معاشرے اور ملک و قوم کی اصلاح نہایت پیچیدہ اور حکمت والا کام ہے۔ جو لوگ ان امور کی انجام دہی پر مامور کر دیئے گئے ہیں یا ہونا چاہتے ہیں ان کے لیے نہایت باریک بینی سے حالات اور ماحول اور وقت اور زمانہ کی رعایت کرنی انتہائی ضروری ہے۔ علامہ اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثمانی کی متفقہ رائے یہی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لیے انسان کا صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ذی ہوش اور موقع شناس ہونا بھی ضروری ہے۔[2] ممکن ہے کہ ایک جاہل آدمی معروف کو منکر اور منکر کو معروف بنادے۔ یا منکرات کی اصلاح کے لیے ایسے وسائل استعمال کرے جن سے مزید منکرات پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ بعض اوقات نرمی کی بجائے سختی اور سختی کی بجائے نرمی اختیار کرنے سے بھی اصلاح کی بجائے بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وسیع تر معنوں میں ایک آدمی کا کام نہیں ہے۔[3]

اس کے ساتھ ساتھ ایسے لوگ جن کی اصلاح اور جن کا تزکیہ کرنا مقصود ہے ان کے لیے بھی ایک قابل توجہ وہ بات جو وحید الدین خان (۱۹۲۵ء-۲۰۲۱ء) نے یہاں کی ہے وہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں سیاست مدنیہ کے قوانین رائج کیے جا رہے ہیں اس معاشرے میں اطاعت کا بھی جذبہ ہونا چاہیے۔ ایسی عوام جن کو دین کی دعوت پہنچائی جا رہی ہے ان کو چاہیے کہ داعی کا اور ان جیسے خاص لوگوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کا ادب واحترام کریں، ان کے کہنے پر چلیں اور ان کی باتیں تہہ دل سے قبول کریں، عوام کو چاہیے کہ وہ ان ذمہ دار بندوں کے آگے اپنے آپ کو حوالے کر دیں۔ اگر یہ شرائط پائی گئیں تو ایسا مسلم معاشرہ ہی کامیاب ہو گا، اب توجہ سے سننا اور پھر اطاعت قبول کرنے سے ایسا معاشرہ حقیقی معنی میں دنیا میں طاقتور اور آخرت میں نجات یافتہ ہو گا۔ ملک و قوم کی اصلاح چاہنے والے کی نظر اور توجہ اگر خیر اور دین کی بنیادی چیزوں پر رہے گی تب ایسے نتائج ملیں گے۔ عوام معاشرے اور ملک و ملت کی اصلاح کے لیے اگر حقیقی کامیابی چاہتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ

"وہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹنے سے بچ جاتے ہیں۔ ایک حکم کے تحت چلنے کے نتیجہ میں سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اتحاد واتفاق ان کی عام صفت بن جاتی ہے اور بلاشبہ اتحاد واتفاق سے زیادہ بڑی طاقت اس دنیا میں کوئی نہیں۔"[4]

۱۔ السواتی، معالم العرفان، ۱۳۴/۲

۲۔ التھانوی، بیان القرآن، ۳۸۸

۳۔ دیکھیے: عثمانی، تفسیر عثمانی، ۴۱۷

۴۔ وحید الدین، تذکیر القرآن، ۳۹۷/۱

اسی وجہ سے حکمت عملیہ کے تیسرے رکن سیاست مدن میں قوت عملیہ کے اتحاد و یگانت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اسی بنیاد پر مدنی زندگی کے استحکام کا عمل شروع ہوتا ہے۔

سیاست مدن میں خلافت کی ضرورت اور اس کی حکمت

انسان مدنی زندگی میں اپنوں اور ارد گرد رہنے والوں کی اصلاح اور ان کو نیکی کی دعوت ایک حد تک دے سکتا ہے اس لیے کہ عوام کی جذبات اور نفس امارہ کی غلاظتوں سے بھرپور لوگ نہ داعی کی قدر کرتے ہیں اور نہ ہی اصلاح کو اصلاح اور برائی کو برائی ماننے یا کہنے کی ہمت گوارہ کرتے ہیں۔ اس تناظر میں بااختیار لوگ اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں، سیاست مدنیہ میں حکمت کے عملی اطلاق میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ معاشرے اور ملکی سطح پر اصلاح کے امور کو احسن طریقے سے چلانے کے لیے وقت کے حاکم کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اس کے لیے خلافت اسلامیہ بھی نہایت ضروری ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾[1]

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام کا۔

قرآنی اصطلاحات (معروف اور منکر) سے مراد شریعت اور سوسائٹی دونوں کے معروفات و منکرات ہیں اور ان کے لیے امر و نہی کے جو الفاظ و استعمال ہوئے ان کا غالب قرینہ یہی ہے کہ یہ کام مجرد وعظ و تلقین ہی سے نہیں بلکہ اختیار اور قوت سے اس کو نافذ کرنا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ گروہ امت کی طرف سے سیاسی اقتدار و اختیار کا حامل ہو۔ امین اصلاحی (۱۹۰۴-۱۹۹۷ء) لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک اس آیت (جس میں نیکی کے حکم اور برائی سے روکنے کا حکم کیا جا رہا ہے) اس سے اس امت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔[2]

اسی طرح ایک اور پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ معاشرے میں پھیلی برائیوں کا تدارک اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب خود اپنی آنکھوں سے منکرات دیکھیں نہ کہ دوسرے کے کہنے پر اندھادھند زبان اور ہاتھ سے فائرنگ شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں حاکم وقت کے اس موقع پر کردار کو شامل کرنا ضروری سمجھتے ہیں ہر شخص پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس وقت عائد ہو گا جبکہ وہ اپنے سامنے کسی منکر کو ہوتے ہوئے دیکھے۔ مثلاً ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ کوئی مسلمان شراب پی رہا ہے یا چوری کر رہا ہے یا کسی غیر عورت سے مجرمانہ اختلاط کر رہا ہے۔ تو اس کے ذمہ واجب ہو گا کہ اپنی استطاعت و قدرت کے مطابق اس کو روکے، اور اگر

۱۔ الحج، ۲۲/۴۱

۲۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۲/۱۱۲

اس کے سامنے یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہے تو یہ فریضہ اس کے ذمہ نہیں، بلکہ اب یہ فریضہ اسلامی حکومت کا ہے کہ مجرم کے جرم کی تفتیش و تحقیق کر کے اس کو سزا دے۔[1]

قطب شہید کے نزدیک دعوت کا کام ہر شخص کر سکتا ہے لیکن بنیادی ذمہ داری حکومت کی ہے۔آپ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فلا بد من جماعة تدعو إلى الخير ، وتأمر بالمعروف وتنهى عن المنكر. لا بد من سلطة في الأرض تدعو إلى الخير وتأمر بالمعروف وتنهى عن المنكر. ---.فهناك «دعوة» إلى الخير. ولكن هناك كذلك «أمر» بالمعروف. وهناك «نهي» عن المنكر. وإذا أمكن أن يقوم بالدعوة غير ذي سلطان ، فإن «الأمر والنهي» لا يقوم بهما إلا ذو سلطان ."[2]

دعوت الی الخیر ہر وقت ہو اور یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے' لیکن یہاں تو ساتھ ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ بھی وارد ہیں۔ اگر دعوت اسلامی بغیر اقتدار اعلیٰ کے ممکن العمل بھی ہے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بغیر اقتدار اعلیٰ کے حصول کے ممکن نہیں ہے۔

ایسا اقتدار اعلیٰ ضروری ہے جو قرآن کریم کے اس حکم یعنی (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) پر عمل کرا سکے۔ شرط یہ ہے کہ ایسا اقتدار خیر کی دعوت کے جذبے پر قائم ہو اور اس کا اصل مقصد فساد اور برائیوں کا خاتمہ کرنا ہو، مگر ایسا اقتدار اور ایسی حکومت عوام کے مکمل اتحاد اور اتفاق کے ساتھ قائم ہو گی مگر سب سے پہلے خود عوام کو بھی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے اور بھائی چارہ کے فروغ کی کوشش کرنی ہو گی۔ خلافت کے قیام اور حکماء کو وقت سے پہلے عوام کو یہ بتانا چاہیے کہ اسلامی نظام کس طرح قائم ہونا ممکن ہو گا اور اس کا عملی اطلاق کیسے ہو تاکہ عوام کے دلوں کے اندر خلافت اسلامیہ اور قرآن وسنت کے قوانین کو تخت پر لانے کا جذبہ پیدا ہو سکے۔[3]

داعی کے سر پر ایک خاص قسم کی ذمہ داری ہے کہ سیاست مدنیہ میں حکمت اور حکمت عملی کے اطلاقات کو جائزہ لیتا رہے اگر وقت، زمانہ اور حالات کا خیال نہ کیا گیا تو معاشرے کا بگاڑ اور فساد ناقص دعوت کے ذریعے پیدا ہو گا اور ہر شخص جو دعوت دین والا اور معروف اور نہی عن المنکر پر عمل پیرا ہے اس کو روز قیامت جواب دینا پڑے گا۔علامہ مودودی یہاں لکھتے ہیں:

"ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں، ان سب کے لیے ائمہء شر اور شیاطین انس و جنّ کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔"[4]

۱۔ شفیع، مفتی محمد، معارف القرآن، ۲۱۱/۳

۲۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۲۳۳/۴

۳۔ ایضاً، ۲۳۵/۴

۴۔ المودودی، تفہیم القرآن، ۲۸۹/۲

اس سے واضح ہوتا ہے کہ خاندانی زندگی، پھر معاشرتی اور شہری زندگی سے لے کر حکومتی سطح تک امن وامان کے لیے حاکم وقت کا ہونا اور پھر اسلامی اصولوں کا نفاذ اشد ضروری ہے تاکہ انصاف، مساوات اور اجتماعی عدل قائم ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ جس کو حاکم بناتا ہے اور اس کو عوام میں اور اطراف عالم میں غلبہ اور قوت دیتا ہے اس کے اندر حکمت کو بھی رکھ دیتا ہے، عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں:

"کسی قوم میں حکومت سنبھالنے کی طاقت اتنی ہی ہو گی جتنی اس میں حکمت ہو گی"[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حکمت کا سیاست اور خلافت کے ساتھ گہرا ربط اور تعلق ہے۔

سیاست مدن میں حاکم کی ذمہ داریاں

حکمت عملیہ کے تیسرے رکن سیاست مدن کا تعلق ملک و قوم اور شہری اور دیہاتی زندگی کے قوانین کے ساتھ ہے اور ملک و قوم میں امن عامہ کے تحفظ اور بگاڑ اور فساد کے خاتمے کے ساتھ ہے۔ اس لیے اس میں عمومی طور پر وہ قوانین اور احکام شامل ہوتے ہیں جن کا تعلق خلیفہ وقت، حاکم، سلطان اور بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے، لہٰذا خصوصی طور پر انہی امور کو زیر بحث لایا جائے گا، تاہم عوام کی ذمہ داریوں پر بھی مختصراً بحث کی جائے گی۔

اتحاد اور اتفاق کی فضا کا قیام

اسلامی ریاست کے حاکم کی ذمہ داری ہے کہ وہ امور سلطنت کے انتظام وانصرام کے ساتھ ساتھ عوام کی آپس میں اور عوام کی حکمران اور وزراء کے ساتھ اتفاق اور اتحاد کی فضا قائم کرنے میں ہر ممکن کوشش کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام کے اندر فضا اور انتشار کی اسباب اور وجوہات کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾[2]

اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو۔

امام ابن جریر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"تمسَّكوا بدين الله الذي أمركم به، وعهده الذي عَهده إليكم في كتابه إليكم، من الألفة والاجتماع على كلمة الحق، والتسليم لأمر الله"[3]

اور اللہ کے اس دین کو مضبوطی سے پکڑے رہو جس کا اس نے تمہیں حکم دیا ہے اور اس کے عہد کو جو اس نے اپنی کتاب میں تمہارے سپرد کیا ہے، کلمہ حق پر واقفیت اور اتحاد اور خدا کے حکم کے تابع رہو۔

اتحاد اور یگانگت کی فضا قائم کرنے کے ساتھ ساتھ حاکم وقت اختلاف کو کم کرنے اور فرقہ کی مختلف صورتوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے جیسا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

۱۔ سندھی، عبید اللہ، تفسیر المقام المحمود، ص ۲۲۱

۲۔ آل عمران: ۳/۱۰۳

۳۔ سندھی، عبید اللہ، تفسیر المقام المحمود، ص ۲۲۱

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾[1]

اور مت ہو ان کی طرح کو متفرق ہو گئے اور اختلاف کرنے لگے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کو حکم صاف اور ان کو بڑا عذاب ہے۔

علامہ شنقیطی (۱۹۰۵ء-۱۹۷۴ء) لکھتے ہیں

نهى الله جل وعلا المؤمنين في هذه الآية الكريمة عن التنازع، مبينا أنه سبب الفشل، وذهاب القوة[2]

خدا تعالیٰ نے اس عظیم آیت میں اہل ایمان کو آپس میں تصادم سے منع کیا ہے، اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ یہ ناکامی اور طاقت کے نقصان کا سبب ہے۔

شریعت اسلامیہ کے احکام کے نفاذ

وقت کے حاکم کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی احکامات کے نفوذ کی ہر طرح سے تدبیر اور حکمت عملی اختیار کرے۔ اس کا فائدہ اور منفعت آخرت میں تو یقینی ہے لیکن دنیا میں بھی اس کے فوائد کثیرہ ہیں[3]۔

اگر فرد واحد بھی اس بات میں کوشش اور تگ ودو کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے اور اپنے دل ودماغ کے اندر کسی دوسرے شخص کے بارے میں بغض وفساد پیدا نہ کرے اور آپ ﷺ کی سنت مطہرہ پر مضبوطی سے کاربند رہے تو اس ایک شخص کو بھی اللہ تعالیٰ خوبیوں اور کمالات سے نوازتا ہے اور حکمت کو اس کی دل اور زبان پر جاری کر دیتا ہے۔ تو اگر وقت کا حاکم لوگوں کے درمیان اتفاق اور سلوک کی فضا پیدا کرے گا تو اس کے لیے بھی دنیا میں یہی اجر ہوگا، امام آلوسی لکھتے ہیں:

"أي وفوا حقهما بتنفيذ ما فيهما من الأحكام لأعطتهم السماء مطرها وبركتها والأرض نباتها وخيرها"[4]

یعنی جو احکام قرآن اور سنت میں ہیں ان پر عمل کر کے ان کا حق ادا کرو تو آسمان سے ضرور ان کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی بارش اور برکت عطا فرمائے گا اور زمین سے اس کے لیے باعث برکت ومنفعت ہوگی۔

یعنی اسلامی احکام کو انفرادی اعتبار سے اپنی ذات پر نافذ کرنے اور اجتماعی اعتبار سے حاکم کا اپنے آپ پر اور پھر عوام پر نافذ کرنے کے دینی اور دنیوی فوائد ہیں اور حکمت کے عطا ہونے کا موجب بھی ہیں۔

اسلامی نظام کے نفاذ میں حکومت اسلامیہ کی ذمہ داری

۱۔ آل عمران: ۱۰۵/۳

۲۔ الشنقیطی، اِضواء البیان فی اِیضاح القرآن بالقرآن، ۱۰۲/۲

۳۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ (المائدہ: ۶۶/۵)

۴۔ الآلوسی، روح المعانی، ۱۸۷/۳

اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول اکرم ﷺ کے احکام کو صرف تسلیم کی حد تک نہیں بلکہ دل وجان سے اس پر عمل پیرا ہونا ایک سچے مسلمان ہونے کی نشانی ہے، یہ تو کام ایک مسلمان کا ہے لیکن ایک مسلمان حاکم ہونے کی حیثیت سے جو ملک کے ہر حصے تک ان اسلامی قوانین کی تنفیذ کرتا ہے اور لوگوں کو یہ باور کرواتا ہے کہ سب سے اچھا اور عظیم نظام اسلام کا ہے ایسے نظام اور ایسی سلطنت عوام پر اسلامی حاکم اور اسلامی حکومت کی اطاعت واجب ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے حاکموں کو بڑے عہدے اور اختیارات دیئے جاتے ہیں۔ارشادربانی ہے:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴾[1]

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام کا۔

اسلامی حکمران کے بغیر اسلامی قوانین اور اسلام کے آئین کا تصور ادھورا ہے یہ اسی وقت کامیاب ہے جب ان کو نافذ کرنے والا خود سچے دل سے اسلامی نظام کی قدر و منزلت کو جانتا اور مانتا ہو۔اگر صرف قوانین اسلامی اور ہوں اور تنفیذ احکام کا نظام مفقود ہو تو رعایا کے اندر نہ ہی ہمدردی کا جذبہ قائم رہتا ہے اور نہ ملک کے اندر معاشی نظام مستحکم ہو سکتا ہے۔لہذا اسلامی حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ خود ایسے نظام میں مداخلت کریں تاکہ اسلامی قوانین کے نفاذ کا برکات حاصل ہو سکیں۔[2]

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کی ذمہ داری اسلامی قوانین کی ترویج نو کرنا تھا اور اس قانون اور نظام کو زمانہ اور وقت کی رعایت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مضبوط اور مستحکم کرنا تھا جب اسلامی حکومت کے خلیفہ کی ذمہ داری یہ کہ ہے ان نازل شدہ احکام پر خود بھی عمل پیرا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے عملی نفاذ کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرے۔اور یہ کوشش قرآن کریم کے حکم کے مطابق[3] نظام عدل کے ساتھ قائم ہو گی،ابن عاشور لکھتے ہیں:

"فَطَاعَةُ الرَّسُولِ تَشْتَمِلُ عَلَى احترام الْعدْل المشرّع لَهُمْ وَعَلَى تَنْفِيذِهِ، وَطَاعَةُ وُلَاةِ الْأُمُورِ تَنْفِيذٌ لِلْعَدْلِ"[4]

۱۔ الحج: ۴۱/۲۲

۲۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۲۰۸/۴

۳۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً ((النسآء: ۵۹/۴)

۴۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۹۶/۵

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں ان کے لیے عدل کا احترام جو کہ ان کے لیے شارع کے طرف سے لازم کیا گیا اور اس عدل کا نفاذ شامل ہے اور حکمرانوں کی اطاعت میں عدل کا نفاذ ہے۔

یعنی اولی الامر کا کام عدل کو قائم کرنا ہے اور اسی عدل کے بدولت معاشرے اور ملک وملت کے اندر نظام الٰہی قائم ہو گا۔آپ نے مزید ایک اور مقام پر لکھا[1] ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شریعت اسلامیہ کی طبائع کے مابین ایک خاص قسم کا تناسب رکھا گیا ہے جس میں حکمت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی اس شریعت کو آسانی سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں نافذ کر سکیں۔

عدل وانصاف کا قیام

عوام الناس کے جان ومال کی تحفظ اور ان کے حقوق کے خیال کے ساتھ ساتھ عوام کو دی جانی والی سہولتوں اور ان کے دی جانے والے حقوق میں عدل کا قیام بھی ضروری ہے، جیسا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴾[2]

بیشک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچادو امانتیں امانت والوں کو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو بیشک اللہ ہے سننے والا دیکھنے والا

امام ابن کثیر کے نزدیک اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کریمہ میں صرف سلطنت کے حکام کو مخاطب کیا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان عدل وانصاف کے لیے ضروری اقدامات کریں۔[3]

امام رازی لکھتے ہیں:

"أجمعوا على أن من كان حاكما وجب عليه أن يحكم بالعدل"[4]

اس بات پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ حاکم وقت کے لیے عوام کے لیے عدل کو قیام کرنا انتہائی ضروری ہے۔

لہٰذا سیاست مدنیہ کا اہم اصول یہ ہے کہ عدل وانصاف کے قیام میں کسی کی رائے یا کسی قوت کو آڑے نہ آنے دیا جائے۔ جیسا کہ علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

"لا يحملنكم بغضكم للمشركين على أن تتركوا العدل فتعتدوا عليهم"[5]

مشرکین کے غیض وغضب کی وجہ سے تم عدل نہ چھوڑو

---

۱ ۔ هَذَا اسْتِرْوَاحٌ مَبْنِيٌّ عَلَى أَنَّ مِنْ حِكْمَةِ اللَّهِ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَ طبع الرَّسُول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيْنَ رَوْحِ شَرِيعَتِهِ تَنَاسُبًا لِيَكُونَ إِقْبَالُهُ عَلَى تَنْفِيذِ شَرْعِهِ بِشَرَاشِرِهِ لِأَنَّ ذَلِكَ أَنْفَى لِلْحَرَجِ عَنْهُ فِي الْقِيَامِ بِتَنْفِيذِ مَا أُمِرَ بِهِ.(ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۳۰۹/۲۳)

۲ ۔ النساء: ۵۸/۴

۳ ۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۲۰۶/۲

۴ ۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ۱۱۰/۱۰

۵ ۔ الزمخشری، الکشاف، ۶۱۲/۱

یعنی غیر مسلموں سے مرعوب ہو کر یا ان کے دباؤ میں آکر اسلامی نظام کے نفاذ کو روکنا یا معطل کرنا یہ بھی اسلامی روایات اور مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہے۔اسی طرح عدل وانصاف کے قیام کے لیے پارلیمنٹ کو مزید فعال اور مضبوط بنانا ہو گا اور قرآن اور سنت کے قوانین کو لاگو کرنا ہو گا۔اسی لیے جمہوریت میں عدل اور انصاف کے قیام کے لیے جو ادارہ سب سے مضبوط ہے وہ پارلیمنٹ کو ہی ہونا چاہیے۔ قانون کو حتمی شکل دینے کی منظوری کا اختیار بھی اسی ادارہ کے پاس ہونا ضروری ہے لیکن یہ بات بھی مد نظر رہے کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے ﴿ان الحکم الا للہ﴾۔ لہذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن اور سنت کی شکل میں قانون دیئے جانے کے بعد اس کے ردوبدل کرنے یا اس میں ترمیم کرنے کا مطلب صراحتاً شرک کے مترادف ہے۔[1]۔ پارلیمنٹ کے اراکین جتنا بھی علوم میں مہارت حاصل کر لیں وہ اللہ تعالیٰ کے قوانین جیسا یا اس کے متبادل نہیں لا سکتے۔اسی طرح غیر مسلموں کے قوانین جن میں فرانس، امریکہ، برطانیہ اور جرمنی کے قوانین بھی شامل ہیں یہ سب سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم اور کمیونزم کو معاونت فراہم کرنے والے ہیں۔قرآن کا نظام ہمیشہ کے لیے اٹل ہے۔جب کہ حکومتی قانون جب وضع ہوتے ہیں تو ساتھ ہی ترامیم بھی شروع ہو جاتی ہے اور کبھی تو ایک قانون کی جگہ دوسرا قانون لانا پڑتا ہے۔جب کہ قرآن کا قانون غیر متبدل ہے۔[۲]

عوام کی عزت اور تکریم کا تحفظ

لوگوں کی عزت نفس اور تکریم کا ماحول مہیا کرنا بھی حاکم وقت کے لیے ضروری ہے، اور قرآن کریم نے اس بات کا حکم بھی دیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾[۳]

اور ہم نے عزت دی ہے آدم کی اولاد کو اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں اور روزی دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر۔

علامہ السعدی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وهذا من كرمه عليهم وإحسانه الذي لا يقادر قدره حيث كرم بني آدم بجميع وجوه الإكرام، فكرمهم بالعلم والعقل وإرسال الرسل وإنزال الكتب، وجعل منهم الأولياء والأصفياء وأنعم عليهم بالنعم الظاهرة والباطنة"[۴]

۱۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، بیان القرآن، ۳/۷۱

۲۔ السواتی، عبدالحمید خان، معالم العرفان، ۱۰/۳۴۰

۳۔ الاسراء: ۱۷/۷۰

۴۔ السعدی، تیسیر الکریم الرحمٰن، ۱/۴۶۳

یہ اس کا بے پناہ کرم واحسان ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے بنی آدم کو ہر لحاظ سے عزت و تکریم سے نوازا۔ انہیں علم و عقل عطا کر کے 'انبیاء و رسل بھیج کر اور ان پر کتابیں نازل کر کے اکرام بخشا' ان میں سے اپنے اولیاء اور دیگر چنے ہوئے بندے پیدا کیے اور ان کو اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے نوازا۔

لہٰذا نفاذ کے نظام میں انسانیت کی عزت اور توقیر مقدم ہے اور یہ حکمت عملیہ کا ایسا شعبہ ہے جس سے محبت اور امن کو فروغ ملتا ہے۔

نقل مکانی اور ہجرت کے حقوق کا تحفظ

اگر ایک مقام پر کچھ انسانوں کو تجارت یا مالی اعتبار سے معیشت میں نقصان دہ پہلو نظر آ رہے ہیں تو تجارت وغیرہ کی غرض سے ایک ملک کے جس حصے میں چاہیں رہ سکتے ہیں، عوام کے حقوق اور حاکم کی ذمہ داریوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ عوام کے نقل وحرکت پر پابندی نہ لگائی جائے کیونکہ قرآن کریم کی رو سے ہجرت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔[1]

ابن کثیر لکھتے ہیں:

"أَيْ فَسَافِرُوا حَيْثُ شِئْتُمْ مِنْ أَقْطَارِهَا وَتَرَدَّدُوا فِي أَقَالِيمِهَا وَأَرْجَائِهَا فِي أَنْوَاعِ الْمَكَاسِبِ وَالتِّجَارَاتِ"[2]

یعنی مخلوق خدا کو سفر کرنے کا حق ہے کہ وہ زمین کے جس طرف چاہے، جس علاقے اور جس رخ کی طرف چاہے تجارت کسب اور معاش کی غرض سے سفر کر سکتی ہے۔

یعنی حاکم وقت عوام کو نقل مکانی سے روک بھی نہیں سکتے اور جہاں ان کے لیے رزق کے وسائل اور اسباب ہوں ان کے لیے قانونی تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

طلب علم کا حق

جس طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے علم کی ترغیب دی ہے اور پذیرائی فرمائی ہے اسی طرح حاکم وقت کو چاہیے کہ وہ دنیا کے ضروری علوم اور خاص طور پر دینی علوم کی ترویج واشاعت کے لیے اہتمام کرے، اس لیے کہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم نعمت ہے اور لوگوں کے درمیان افہام و تفہیم کے لیے علم ایک اہم وسیلہ ہے، جیسے زبان سے اظہار اور تحریر کے بغیر علوم ناپید ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح علم کے بغیر دینی احکامات کی وضاحت او جھل ہو جاتی ہے۔ افراد کی معاشی، معاشرتی، اور سیاسی پہلوؤں سے اصلاح نہیں ہوتی اور نہ ہی معاشرے اور ملک و قوم کا نظام مستحکم ہو سکتا ہے۔ پھر اسی کے ذریعے انسان کی زندگی اور اس کے کردار کی تعمیر ہوتی ہے اور علم کی اشاعت سے ہی علم اگلی نسلوں تک پہنچانے میں مدد ہو سکتی ہے۔

علامہ وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

۱۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (الانعام: ۱۱/۶)، اس کے علاوہ سورۃ الملک میں ارشاد ربانی ہے: هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ (الملک: ۱۵/۶۷)

۲۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۷۵/۱۴

"وقد بدأت دعوة الإسلام بالترغيب في القراءة والكتابة وواسطة للتفاهم بين الناس فتمنو الحضارات، وتسمو الأفكار، وتحفظ الأديان، وتنشر الهداية." [1]

اسلام کی دعوت کا آغاز پڑھنے لکھنے کی ترغیب سے ہوا جو لوگوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ تھا، چنانچہ تہذیبیں ترقی کرتی گئیں، اور لوگ نظریات میں ترقی کرتے رہے۔ مذاہب محفوظ ہوئے اور رہنمائی پھیلتی گئی۔

لہٰذا عوام کی خوش حالی اس میں ہے کہ لوگوں کو دینی اور عصری علوم کی طرف راغب کیا جائے۔

مشاورت کا نظام اور عوام کا حق

اسلامی سلطنت کے نظام کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے اور مستحکم کرنے کے لیے شوری کے نظام کو بہتر اور بہترین کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے ، جس طرح نماز اور زکوۃ کی اہمیت انفرادی اور اجتماعی ہے اسی طرح علم سیاست مدنی میں میں مشاورت کے اہمیت ہے، شوٰری کے نظام کی افادیت کے بارے میں ابن عطیہ لکھتے ہیں:

"لأن في ذلك اجتماع الكلمة والتحاب واتصال الأيدي والتعاضد على الخير" [2]

شوری کے نظام سے معاشرے میں اجتماعیت ، محبت، لوگوں کے میل جول میں اتصال ہوتا اور خیر و بھلائی کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا جذبہ بڑھتا ہے۔

شوری کا نظام شریعت اسلامیہ کے قواعد اور احکام کی تنفیذ میں سے ہے۔ جب کہ آپ کے نزدیک یہ بات بھی اہم ہے کہ جو خلیفہ یا حاکم اپنے وقت کے علماء دین اور سے مشاورت نہیں کرتا اس کو معزول کرنا واجب ہے۔ [3]
اسی طرح امام آلوسی (۱۸۰۲ء-۱۸۵۴ء) کے مطابق سلطنت کے قیام وانصرام اور اس کے مختلف امور میں مشاورت کی اہمیت مسلم ہے کہ مشاورت اسلام سے پہلے بھی اہمیت کی حامل تھی ،اسلام کے بعد زیادہ ہو گئی ہے، لہٰذا اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہے۔ [4] علامہ قطب شہید (۱۹۰۶ء-۱۹۶۶ء) کا بھی یہی نقطہ نظر ہے کہ اس آیت کریمہ کے انداز بیان ایسا ہے کہ ان کے تمام امور مشورے کے نتیجے میں ہوتے ہیں گویا ان کی پوری زندگی مشورے کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہ ایک مکی آیت ہے اور یہ حکم اسلامی حکومت کے قیام سے بھی پہلے کا ہے۔ یہ رنگ گویا صرف حکومتی امور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک اسلامی سوسائٹی کا عمومی طرز عمل ہے۔ اگرچہ حکومت اس وقت قائم ہی نہ ہوئی تھی۔ [5]

لیکن یہ بات بھی بادشاہ اور حاکم کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ وہ امور سلطنت میں مشاورت فاسقین اور فاجرین سے کرنے کے بجائے مجلس مشاورت میں اہل علم کو مدعو کرے، کیونکہ ابن عطیہ لکھتے ہیں:

---

۱ ۔ الزحیلی، التفسیر المنیر، ۳۱۸/۳۰

۲ ۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۳۹/۹

۳ ۔ والشورى من قواعد الشريعة وعزائم الأحكام، ومن لا يستشير أهل العلم والدين فعزله واجب(ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۵۳۴/۱)

۴ ۔ الآلوسی، روح المعانی، ۳۹/۵

۵ ۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۴۰۹/۸

"ومن لا يستشير أهل العلم والدين فعزله واجب"[1]

جو حاکم بھی اہل علم اور دین میں سمجھ بوجھ رکھنے والوں سے مشاورت نہ کرے اس کو عہدے سے معزول کر دینا ضروری ہے۔

مزید وضاحت میں مفتی شفیع (۱۸۹۷ء-۱۹۷۶ء) لکھتے ہیں:

"اسمبلی یا مجلس شوریٰ کے ممبران کے لیے بھی کچھ شرائط ہیں اور جس شخص کو یہ منتخب کریں اس کے لیے بھی کچھ حدود اور قیود ہیں پھر ان کی قانون سازی بھی قرآن اور سنت کے بیان کردہ اصول کے دائرہ میں ہو سکتی ہے اس کے خلاف کوئی قانون بنانے کا ان کو اختیار نہیں۔"[2]

شوریٰ کے نظام میں تعداد کے وہم وگمان میں بھی نہیں رہنا چاہیے کہ عموما یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جس طرف عوام کی تعداد زیادہ ہے وہی موٴقف برحق ہے یا وہی لوگ حق پر ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے اس لیے کہ عدد کی کثرت کو اسلام نے بعض موقع پر فیصلہ کن قرار دیا ہے۔ اس سے مراد ہو جگہ جہاں ذاتی خوبیوں کے ساتھ ساتھ قوت دلیل بھی ہو اور موازنہ کرنے والا کوئی صاحب اقتدار حاکم نہ ہو۔ ایسے مواقع پر عوام کا جھگڑا چکانے کے لیے عددی اکثریت کو ترجیح دی جاتی ہے جیسا کہ امام کو نصب کرنے کا معاملہ ہے جہاں کوئی امام یا امیر فیصلہ کرنے والا نہ ہو۔ اس لیے کثرت رائے کو بعض اوقات نزاع ختم کرانے کے لیے ترجیح دی گئی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ جس چیز کو زیادہ تعداد کے لوگوں نے اختیار کر لیا وہی چیز حلال اور جائز اور حق ہو۔"[3]

عوام کے لیے ملکیت کا حق

ہر ذی عقل بالغ اور باشعور انسان یہ کوشش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ معاشرے میں کچھ چیزیں اور کچھ امور میں اس کی ہی ملکیت ہو۔ اور یہ ایک فطری عمل بھی ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ جس چیز کا میں مالک ہوں اس کے اندر اختیار بھی میرا ہو تاکہ میں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق اس کو استعمال کر سکوں۔ قرآن کریم کے ارشاد

﴿وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾[4]

اور پیار کرتے ہو مال کی جی بھر کر

کی تفسیر میں امام طبری لکھتے ہیں:

"وتحبون جمع المال واقتناءه حبا كثيرا شديدا"[5]

۱۔ ابن عطیہ، المحرر الوجیز، ۵۳۴/۱

۲۔ محمد شفیع، مفتی، معارف القرآن (کراچی، ادارہ معارف، ۱۹۹۳ء) ۱۸۸/۱

۳۔ ایضاً، ۲۴۲/۳

۴۔ الفجر: ۲۰/۸۹

۵۔ الطبری، جامع البیان، ۸۶۲۹/۱۰

اس آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان پیسے اور مال جمع کرنے اور مال کی خرید وفروخت کو بہت پسند کرتا ہے۔

اس ملکیت اور حفاظت کو توڑ کر ایک انسان جب دوسرے انسان کی کوئی قیمتی چیز چراتا ہے تو شریعت اسلامیہ میں واضح طور پر اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔[1] علامہ السعدی لکھتے ہیں:

"الحكمة في قطع اليد في السرقة، هى حفظ أموال الناس وصيهانتها وعدم الاعتداء عليها"[2]

چور کے ہاتھ کاٹنے میں حکمت یہ ہے کہ اس کا مال بچایا جائے، اس کے پیسے کی حفاظت کی جائے اور اس پر حملہ نہ کیا جائے۔

اسی حکم کے تحت حاکم وقت کی ذمہ داری اور عوام کے حقوق میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کی جان کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان کے اموال کی بھی حفاظت کیا جائے۔

قرآن کریم میں امانت[3] کو ان کے اہل تک پہنچانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے مراد رعایا اور عوام کی جان ومال کی حفاظت بھی ہے اور ہر وہ امانت جس کا تعلق حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ساتھ ہو، بھی اس میں داخل ہے لہٰذا حاکم کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان امانتوں کی حفاظت کرے۔ امام خازن اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"إن الله يأمركم يا ولا ة الأمور أن تؤدوا ما ائتمنتم عليه من أمور رعيتكم وأن توفوهم حقوقهم وأن تعدلوا بينهم"[4]

اے حاکموں اللہ تعالیٰ تم کو حکم دے رہا ہے کہ رعایا کے تمام امور کی حفاظت کرو اور ان کو احسن طریقے سے انجام دو اور ان کے حقوق کو پورا کرو ان ساری رعایا کے درمیان عدل کا معاملہ کرو۔

امانت اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اسی لیے ابو زہرہ مصری[5] ایک کامیاب قائد کی یہ پہچان لکھتے ہیں کہ کہ وہ امانتوں کی حفاظت کرتا ہے اور ان کو ضائع نہیں کرتا اس لیے کہ امانت کی حفاظت پر اجر وثواب[6] اور اس کو ضائع کرنے پر وعید[7] آئی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"الأمانة هي السائدة بين الحكام والسائدة بين الشعب، والسائدة في العلاقات بين الشعب والحكومة. فإذا لم تكن الأمانة فسد أمر الحاكم والمحكوم، وضاعت الأمة"[8]

---

۱ ۔ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (المائدہ:۳۸/۵)

۲ ۔ السعدی، تیسیر الکریم الرحمٰن، ۲۳۰/۱

۳ ۔ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء ۵۸/۴)

۴ ۔ الخازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، ۵۴۹/۱

۵ ۔ محمد ابو زہرہ مصری (ولادت: ۱۸۹۸ء — وفات: ۱۹۷۴ء) مصری مفکر، محقق اور مصنف تھے، جو بیسویں صدی میں اسلامی قانون کے ممتاز عالم میں سے ایک ہیں، ابو زہرہ نے امام ابو حنیفہ، امام ملک، امام احمد بن حنبل، امام شافعی اور امام ابن تیمیہ پر کتابیں لکھیں۔

۶ ۔ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (المؤمنون:۸/۲۳)

۷ ۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (الانفال:۲۷/۸)

۸ ۔ ابو زہرہ، مصری، زہرۃ التفاسیر، ۱۷۵۵/۴

امانت کو صحیح طور پر ادا کرنا حکمرانوں اور عوام میں رائج ہونی چاہیے، اسی وجہ سے حکومت اور عوام کے درمیان تعلقات بہتر ہوتے ہیں، اگر امانت ضائع کر دی جائے تو حاکم اور محکوم میں دوریاں، جھگڑے اور فسادات شروع ہو جائیں گے اور امت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

جن علاقوں یا جن ممالک میں ناانصافی اور عدل وانصاف سے روگردانی کا دور دورہ ہے وہاں بدامنی، فسادات اور معیشت میں کمزوری اور تنگی جیسے معاملات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مناسب نہیں ہے کہ قوی کو ضعیف پر ترجیح دی جائے، لہٰذا عدل کے قیام میں حاکم بھرپور کردار ادا کرے۔[1]

اعتقاد کی آزادی کا تحفظ

زمین پر انسانی زندگی کی ابتداء ہی سے انسان کی اعتقادی اور فکری آزادی کا اہتمام کر دیا گیا تھا اور یہ صرف سامی مذاہب کا ہی خاصا رہا ہے کہ ان مذاہب میں انسان کو معاشی، معاشرتی، علم تدبیر منزل اور علم سیاست مدنیہ کے اندر فکری، اعتقادی طور پر آزادی دی گئی۔

حاکم کی ذمہ داری ہے اور عوام کا حق ہے کہ وہ عقائد کے اعتبار سے آزاد رہیں اور وقت کا حاکم بھی اس کے لیے ممکنہ اقدام کرے

انسان کو عقیدے کے معاملے میں کسی بھی قسم کی راہ اختیار کرنے میں اسے آزادی دی گئی ہے۔ جتنی بھی آزدی اور خودمختاری شریعت اسلامیہ کی طرف سے ملی ہے ان میں سب سے اہم اور خاص یہی آزادی ہے جو اسلام نے انسان کو عطا کی۔ لیکن ملکی اور ملی سطح پر نظر دوڑانے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اس بیسویں صدی میں بھی محروم ہے۔ علامہ قطب شہید لکھتے ہیں:

"وهذه هي أخص خصائص التحرر الإنساني الذي كرمه الله --- وما تمليه عليه بعد ذلك بقوانينها وأوضاعها؛ فإما أن يعتنق مذهب الدولة هذا وهو يحرمه من الإيمان باله للكون يصرف هذا الكون – وإما أن يتعرض للموت بشتى الوسائل والأسباب"[2]

متعصب نظریات اور ظالمانہ نظامہائے زندگی آج بھی انسان کو یہ آزادی نہیں دیتے۔ ذات انسانی جسے اللہ نے مکرم بنایا ہے آج اسے اپنے عقائد کے معاملے میں مجبور ومقہور بنادیا گیا ہے۔ اسے مجبور کیا جارہا ہے کہ یا توان نظریات کو اپنائے جسے حکومت وقت اپنے تمام وسائل اور میڈیا کے ذریعہ پھیلاتی ہے اور جو ایسے نظریات ہیں جو انکار خدا کے تصورات پر مبنی ہیں اور یا وہ موت کے لئے تیار ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی آزادی وہ پہلا حق ہے جو انسان کو بحیثیت ملنا چاہیئے۔ جو شخص یا نظام انسان سے نظریاتی آزادی چھین لیتا ہے، وہ درحقیقت انسان سے اس کی انسانیت سلب کرلیتا ہے۔ نظریاتی آزادی کا پھر فطری تقاضا ہے کہ انسان کو اپنے عقیدہ کی تبلیغ کی بھی اجازت ہو۔ اور ایسا کرنے میں وہ محفوظ ومامون بھی ہو۔ اگر حریت عقیدہ کے ساتھ اظہار رائے کی آزادی نہ ہو تو آزادی رائے بے معنی ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی واقعیت نہیں رہتی۔

اسلام زندگی کے تحفظ کا ایک بہترین تصور ہے اور وہ بلاشک وشبہ ایک بہترین اور مستحکم نظام زندگی ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جو ببانگ دہل پکار رہا ہے کہ اختیار کردہ دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔ وہ اپنے قبول کرنے والوں کو

۱۔ الزحیلی، وھبہ، التفسیر المنیر، ۵/۱۲۴

۲۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۱/۲۷۰

سب سے پہلے یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو دین اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ جب اسلام جیسا دین فطرت لوگوں کو مسلمان بنانے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا تو اس کے دوسرے مروجہ ادیان باطلہ کو یہ اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ وہ محض حکومت کے بل بوتے پر ان ادیان کے نہ ماننے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیں۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾[1]

اور کہہ سچی بات ہے تمہارے رب کی طرف سے، پھر جو کوئی چاہے مانے اور جو کوئی چاہے نہ مانے۔

علامہ زمخشری آیت کریمہ کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں:

"فأمر الدين قائم على التمكين والاختيار، لا على القسر والإجبار"[2]

مذہب کے معاملے میں کسی پر سختی اور جبر وغیرہ نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ معاملہ اپنے پسند اور اختیار پر مبنی رہنے دیا جائے۔

نبی کریم ﷺ کا طرز عمل اس بارے میں یہ ہے کہ آپ نے کسی شخص کی حالت ارتداد پر قتل کا حکم نہیں دیا۔ صرف اسی صورت میں قتل کا حکم دیا گیا کہ وہ لوگ باقی لوگوں کو اسلام سے دور رہنے کے لیے کوششیں کر رہے تھے، اگرچہ اس قسم کی سازشیں ان عظیم صحابہ کرام کے دلوں پر اثر نہ کر سکیں جو حق کو عین الیقین کی طرح پا چکے تھے، تو اس قسم کے قتل کے احکام اس لیے دیے گئے تاکہ اسلام کے اندر کمزور اور نئے آنے والوں لوگ کے دلوں میں اسلام کی معرفت اور اس کی حقانیت صحیح اور مضبوطی سے راسخ ہو سکے، اس طرح احادیث میں بھی اس بات پر تائید ملتی ہے کہ دین میں کوئی سختی اور جبر نہیں ہونا چاہیے۔[3]

مسلمان حاکم پر انسانی حقوق اور اس میں حکمت

اللہ تعالیٰ نے اسلامی ریاست کے باشندوں کے حقوق صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں رکھے بلکہ اسلامی ریاست میں مسلمان حاکم کی ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلموں کے حقوق کا بھی تحفظ کرے، اس لیے کہ غیر مسلم جو اسلامی ممالک میں رہائش پذیر ہیں وہ اس ملک کی ترقی، خوشحالی اور اس ملک کے امن واستحکام کے لیے بھی اس طرح کوشش اور کام کرتے ہیں جس طرح مسلمان اکثریت میں رہ کر کرتے ہیں۔

غیر مسلم کی عزت وتکریم کا حق

قرآن کریم میں ہے

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾[4]

۱۔ الکہف: ۲۹/۱۸

۲۔ الزمخشری، الکشاف، ۷۱۹/۲

۳۔ دیکھیے: محمد رشید رضا، تفسیر المنار، ۲۷۵/۳

۴۔ الاسراء: ۷۰/۱۷

اس آیت کے مطابق غیر مسلم بھی عزت اور تکریم کے حق دار ہیں۔اسلامی ریاست میں غیر مسلم عقیدے کے اعتبار سے اگرچہ ناپاک ہے مگر از روئے آدمیت اور انسانیت کے لحاظ سے محترم ہیں۔ سورۃ الحجرات کی آیت کریمہ

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾[1]

بھی اسی حکم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔اسی آیت مبارکہ کے ضمن میں ابن عطیہ کا موقف یہ ہے کہ (التسویة بین الناس)[2] (کہ انسان انسانیت کے اعتبار سے سب برابر ہیں)۔ لہٰذا سیاست مدن میں اخوت اور عدل وانصاف اور اتحاد ویگانگت کے لیے حاکم کو چاہیے کہ وہ انسانیت کے اعتبار سے سب کو عزت واحترام فراہم کرے۔

امن عامہ کے لیے غیر مسلموں کی جان ومال کا تحفظ

غیر مسلم جو اسلامی ملک میں سکونت پذیر ہیں، ان کے ساتھ ناانصافی اور عدم مساوات کا سلوک اسلام اور ایمان کے منافی عمل ہے،علامہ قرطبی نے سورۃ المائدہ کی آیت مبارکہ

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا﴾[3]

اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جاوے کہ تم (ان کے معاملات میں) عدل نہ کرو (ضرور ہر معاملہ میں) عدل کیا کرو وہ (یعنی عدل کرنا)

کے تحت مفسرین کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ :

"دلت الآية على ان كفرا لكافر لا يمنع من العدل عليه"[4]

عدل کرنے سے ایک مسلمان کو یہ بات منع نہ کرے کہ ایک آدمی کافر ہے تو وہ اس کے کفر کی وجہ سے اس سے عدل کرنا چھوڑ دے۔

اسی طرح انسان کا نفس کبھی اس کو غصہ کرنے اور انتقامی کاروائی پر ابھارتا ہے اس طرح اس مرحلہ میں انسان خصوصا مسلمان کو شیطان اس کو ورغلاتا ہے۔قرآن کریم میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ یہ غصہ تمہیں ان کے ساتھ ناانصافی کرنا، ظلم کرنے اور عدل وانصاف چھوڑنے پر نہ اکسائے۔امام بیضاوی لکھتے ہیں :

"والمعنى لا يحملنكم شدة بغضكم للمشركين على ترك العدل فيهم فتعتدوا عليهم بارتكاب ما لا يحل، كمثلة وقذف وقتل نساء وصبية ونقض عهد تشفياً مما في قلوبكم"[5]

تمہارے غصہ کی شدت تم کو ان کے معاملات میں عدل وانصاف نہ کرنے پر آمادہ نہ کرے کہ اس کے باعث تم ایک ناجائز چیز کا ارتکاب کر کے ان کے ساتھ ناانصافی کرنے لگو گے جو کہ ناجائز حرکت ہے کہ تم ان کو مثلہ کر دو، ان پر تہمت لگا دو، ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرو اور ان سے کیے گئے

۱۔ الحجرات:۱۳/۴۹

۲۔ ابن عطیہ،المحرر الوجیز،۱۵۲/۱۵

۳۔ المائدہ:۸/۵

۴۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن،۷۳/۶

۵۔ البیضاوی،انوار التنزیل،۱۱۷/۲

وعدے پورے نہ کرو۔

اگرچہ قرآن کریم میں کافروں کے ساتھ دوستی اور موالات سے بچنے کا کہا گیا ہے۔اس کے متعلق عمومی رجحان یہی ہے کہ ان کے کفر کے باعث منع کیا گیا ہے،جب کہ سورت الممتحنہ کی آیت [1] میں بیان کیا گیا ہے کہ دوستی نہ رکھنے کی اصل وجہ کافروں کا مسلمانوں کے ساتھ بغض اور عداوت رکھنا ہے۔جب کہ جو کفار مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کا رویہ نہیں رکھتے ان کے ساتھ انصاف اور احسان کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ [۲]

اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان سے جو لڑے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے، کہ ان سے کرو بھلائی اور انصاف کا سلوک۔اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو۔

قرآن کریم میں عدل وانصاف کا معاملہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا یعنی (إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ) کی خوشخبری سنائی گئ ہے حالانکہ اس آیت کے آغاز میں بر اور قسط دو قسم کے معاملات کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اللہ کی محبت کو قسط کے ساتھ جوڑا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ صلہ رحمی کے شعبے کی قسم کی جتنی بھی نیکیاں ہیں ان میں عدل کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''صلہ رحمی وغیرہ کے قسم کی نیکیاں نفس پر اتنی بھاری نہیں ہیں جتنی عدل وانصاف کے قسم کی نیکیاں ہیں بالخصوص جب کہ ان کا تعلق کفار کے ساتھ ہو۔'' [۳]

اس طرح صلہ رحمی کے ارکان میں کمزوروں، بے کسوں اور ضعفاء وغیرہ سے نیک سلوک اور احسان کا برتاؤ کرنا اگرچہ قرآن کریم کے مطابق بہت نیکی اور اجر کا عمل ہے لیکن انسانی نفس کے اندر جو محرکات ہیں ان کے مطابق اپنے دشمنوں خاص کر دین اور مذہب کے دشمن کے ساتھ عدل کا معاملہ کرنا نہایت مشکل کام ہے لہٰذا اسی پر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾ [۴]

اور نہ مارو اس جان کو جس کو منع کر دیا ہے اللہ نے مگر حق پر

امام آلوسیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''والمراد حرم قتلها بأن عصمها بالإسلام أو بالعهد'' [۵]

قتل کرنا حرام اس وجہ سے ہے کہ اسلام نے اس کی عصمت کی حفاظت کا حکم دیا ہے یا اس وجہ سے کہ حکومت نے ان سے ان کی جان ومال کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ (الممتحنہ:۱/۶۰)

۲۔ الممتحنہ:۱/۶۰

۳۔ اصلاحی،تدبر قرآن،۲۳۴/۸

۴۔ الاسراء:۳۳/۱۷

۵۔ الآلوسی،روح المعانی،۶۹/۱۵

غیر مسلموں کا اعتقادی تحفظ

قرآن کریم کی ہدایت اور اس کا پیغام تمام انسانیت کے لیے ہے اور قرآن کریم کے مطابق تمام ادیان اور مذاہب کے ماننے والوں اور ان کے ادیان کے عقائد کا احترام لازم ہے۔ ایک اسلام ہی ایسا دین ہے جس نے تمام انسانوں کو ان کی اعتقادی آزادی دی ہے لہذا مسلم ریاست کا بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مسلمین کے اعتقاد کا تحفظ ان کے حقوق کے اندر لازم جانیں، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا﴾ [1]

اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے تو ڈھائے جاتے تکیئے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت اور اللہ مقرر مدد کرے گا اس کی جو مدد کرے گا اس کی بیشک اللہ زبردست ہے زور والا

اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی سلطنت میں جتنے بھی عبادت خانے ہیں چاہے وہ مسجد ہوں یا اس ملک میں رہنے والے غیر مسلموں کے عبادت خانے، وہ سب احترام اور آداب میں برابر حیثیت کے مانے جائیں گے۔ اور اسلامی ریاست کے حکمران کی یہ ذمہ داری اور غیر مسلموں کے حقوق میں یہ شامل ہے کہ ان کے عقائد کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کی عبادت خانوں کا بھی اسی طرح احترام کیا جائے جس طرح مساجد کا کیا جاتا ہے تاکہ بسنے والے مسلم اور غیر مسلم کے دلوں میں کسی قسم کی تعصب اور تنگ نظری پیدا ہونے کا امکان باقی نہ رہے، علامہ قرطبیؒ نے بھی اسی طرح لکھا ہے:

"تضمنت هذه الآية المنع من هدم كنائس أهل الذمة وبيعهم وبيوت نيرانهم "[2]

یہ آیت اپنے ضمن میں یہ مفہوم بھی رکھتی ہے کہ ذمیوں کی عبادت گاہوں، کلیسوں، گرجوں اور آتشکدوں کو گرانا منع ہے

اگرچہ اس بارے میں مفسرین کا مؤقف بہر حال یہ بھی ہے کہ اسلامی مملکت میں ان عبادت خانوں کی توسیع کرنا اور ان کو بلند و بالا بنانا ممنوع ہوگا لیکن اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کے عبادت خانے ان کے اموال اور ان کے گھر مملکت کے تحفظ اور ان کے حقوق کے زمرے میں داخل ہوں گے۔ [3]

غیر مسلموں کے ساتھ حسن معاملات

ایک معاشرے میں بسنے والے افراد کے درمیان معاملات کی خوش اسلوبی نہایت ضروری ہے، ان افراد میں مختلف طبقات اور مختلف مذاہب کے ماننے والے بھی ہو سکتے ہیں مگر انسان ہونے کے ناطے قرآن کریم کے حکم کے مطابق ان سے اچھے طور پر تعلقات استوار کرنے چاہیے۔ سورۃ العنکبوت میں ہے:

۱۔ الحج: ۲۲/۴۰

۲۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۲/۷۰

۳۔ دیکھیے: قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۱۲/۷۵

﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ﴾ [۱]

اور جھگڑا نہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو، مگر جو ان میں بے انصاف ہیں

آیت کریمہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ ان کے دین کے بارے میں یا اسلام کی دعوت دینے کے معاملے میں احسن طریقے سے بات چیت کریں تاکہ ان کے دل آزاری نہ ہو۔ اس آیت کے ضمن میں مؤقف یہ ہے کہ مؤمنین کو خطاب کیا گیا ہے کہ وہ یہود و نصاری سے اس اعتبار سے کہ وہ اہل کتاب ہیں مجادلہ نہ کریں، لیکن اگر بحث کی ضرورت ہو تو خوبصورت طریقے سے بات کریں اور اگر تنبیہ کرنا بھی مقصود ہو تو دلائل کے ساتھ کریں۔[2]

اہل کتاب کے ساتھ کھانا یا ان کی طرف سے دیا گئے طعام کے بارے میں ابن کثیر کی رائے یہ ہے کہ ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے، اس لیے کہ یہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ غیر اللہ کے لیے کیا گیا ذبح کیا گیا جانور حلال نہیں ہے، اور پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ بھی عند الذبح اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہیں۔[۳] ۔ اسی طرح اہل کتاب کی طرف سے ہدایا اور عطیات کے بارے میں علامہ سیوطی نے بھی جواز کا قول نقل کیا ہے۔[۴]

سیاست مدن میں عوام کی ذمہ داریاں

حاکم کی اطاعت

امام ماوردی لکھتے ہیں:

"وطاعة وَلَاةِ الأمر تلزم في طاعة الله دون معصيته ، وهي طاعة يجوز أن تزول ، لجواز معصيتهم"[۵]

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے امور کے علاوہ ہر امر میں حاکموں کی اطاعت اطاعت ضروری ہے۔ اور یہ ایک ایسی اطاعت ہے جسے صرف اسی صورت میں زائل کیا جاسکتا ہے جب اس کی اطاعت سے معصیت لازم آئے۔

اللہ تعالیٰ نے اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اولوالامر سے مراد لوگوں پر مقرر کردہ حکام، امراء اور اصحاب فتویٰ ہیں کیونکہ لوگوں کے دینی اور دنیاوی معاملات اس وقت تک درست نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اولوالامر کی اطاعت نہیں کرتے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اولوالامر

---

۱ ۔ العنکبوت: ۴۶/۲۹

۲ ۔ دیکھیے: طبری، جامع البیان، ۶۴۸۳/۸

۳ ۔ دیکھیے: ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۲۴/۳

۴ ۔ علامہ سیوطی نے سورۃ الممتحنہ کی آیت نمبر ۸ کے شان نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر کی (کافر) والدہ (صلح حدیبیہ کے بعد) ان سے ملنے کے لیے آئیں تو وہ اپنے سے بہت زیادہ ہدیے وغیرہ لے کے آئیں اور اپنی بیٹی کو پیش کیے اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ اس دوران حضرت عائشہ تشریف لے آئیں تو آپ نے ان سے ان ہدایا کے وصول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں سوال کیا کہ آپ نبی کریم ﷺ سے پوچھ کر بتائیں تو حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ آپ ان کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت بھی دیں اور ان کی طرف سے ہدایا بھی قبول کرلیں۔

۵ ۔ الماوردی، النکت والعیون، ۳۰۸/۱

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم دیں تو خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرمانبرداری ہر گز جائز نہیں۔[1]

حقوق کے تحفظ کی کوشش

عوام اپنے حقوق کے تحفظ کی بھی کوشش کرے۔ اس لیے کہ سیاسی مسائل میں عوام کے حقوق کو بھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ عوام اگر اپنے حقوق کے لیے انصاف کی طلب گار نہ ہوئی اور نہ اس معاملے میں اتحاد اور اتفاق کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی تو نہ تو انصاف سے ان کے حقوق پورے ہوں گے۔ اس سلسلے میں شرط یہ بھی ہے کہ معاشرے کے امیر طبقات شریعت کے مطابق چلیں اور شریعت اسلامیہ کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کریں اور فسق و فجور سے بچیں۔ اس بارے میں قرآن مجید ہے:

﴿وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا﴾ [2]

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

علامہ مودودی لکھتے ہیں:

''اس آیت میں حکم سے مراد حکم طبعی اور قانون فطری ہے۔ یعنی قدرتی طور پر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی شامت آنے والی ہوتی ہے تو اس کے مترفین فاسق ہو جاتے ہیں۔ ہلاک کرنے کے ارادے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ یونہی بے قصور کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسانی آبادی برائی کے راستے پر چل پڑتی ہے اور اللہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے تباہ کرنا ہے تو اس فیصلے کا ظہور اس طریقے سے ہوتا ہے۔''[3]

آپ کے نزدیک دراصل حقیقت پر اس آیت میں متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے، خوشحال لوگوں اور اونچے طبقوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اس کے دولت مند اور صاحب اقتدار لوگ فسق و فجور پر اتر آتے ہیں، ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں، اور آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ لہٰذا جو معاشرہ آپ اپنا دشمن نہ ہو اسے فکر رکھنی چاہیے کہ اس کے ہاں اقتدار کی باگیں اور معاشی دولت کی کنجیاں کم ظرف اور بداخلاق لوگوں کے ہاتھوں میں نہ جانے پائیں۔[4]

۱۔ السعدی، تیسیر الکریم الرحمٰن، ۱/۱۸۳

۲۔ الاسراء: ۱۷/۱۶

۳۔ المودودی، تفہیم القرآن، ۴/۱۹۷

۴۔ ایضاً، ۴/۱۹۷

مبحث دوم

قانون وعدالت کا نفاذ اور اس کی حکمت کے تفسیری اطلاقات

معاشرے میں بڑھتے مسائل کا حل قانون اور عدلیہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اس لیے کہ ہر فرد اپنی مرضی کا فیصلہ اور عدل کا خواہاں ہوتا ہے جس سے معاشرے میں عدل وانصاف کے عدم توازن کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ لہٰذا ایک قانون جو عدل وانصاف کے اسلامی تقاضوں کے عین مطابق ہو صرف ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ ایک خاندان کے اندر بھی اس کی بالادستی قائم ہونے چاہیے۔گھر کے سر براہاں کو اس قانون پر عمل درآمد کے لیے پنچائیت اور برادری کی سطح پر اس قانون کی بالادستی ضروری ہے۔اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ موجودہ دور میں ملکی سطح پر قائم عدلیہ جس میں عدل وانصاف مہیا ہونے میں عرصہ دراز لگ جاتا ہے۔اس کوفت سے بچا جا سکے گا اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ ایک فرد کی سر براہی کے بعد دوسرے فرد تک سر براہی کی تفویض بآسانی ہو سکے گی اور گھر، خاندان اور معاشرے کا ہر فرد اسلام کے بتائے ہوئے قوانین کو انہی روایات کی روشنی میں سمجھ سکے گا۔ اس طرح اسلامی قانون کو سمجھنے میں اور اس کو خاندانی نظام میں لاگو کرنے میں کس قسم کی پیچیدگی نہیں ہو گی اور آنے والی نئی نسلوں تک اسلامی روایات اور قانون کی رسائی باآسانی سے ہو سکے گی۔

قرآن کریم میں کئی مقامات پر اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ معاشرے میں فساد اور بگاڑ سے بچنے کے لیے مشاورت، گھریلو نزاعات کو کم کرنے کے لیے خاندانی سطح پر پنچائیت مفید ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا﴾[1]

اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرادیں تو اللہ موافقت کر دے گا ان دونوں میں، بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ واضح ہدایات ملتی ہیں کہ خاوند اور بیوی میں اگر کبھی ناموافق حالات پیدا ہو جائیں تو عدالت میں جانے سے پہلے ہی گھر میں نزاعی معاملات کے تدارک کی صورتیں اختیار کرنی چاہییں، جس کی تدبیر یہ ہے کہ شوہر اور بیوی میں ہر دو خاندان میں سے ایک ایک فرد چن لیں اور وہ پیدا ہونے اختلاف اور نزاع کی مکمل تحقیقات کر لیں اور آخر میں ہر صورت میں ان اختلافات کو ختم کر کے تصفیہ کی کوئی صورت نکال لیں تاکہ دو خاندان پھر سے بخوشی ورضا آپس میں جڑ جائیں۔اگر معاملہ عدالت پہنچ جائے تو عدالت کو چاہیے کہ وہ

۱۔ النسآء: ۳۵/۴

خود فیصلہ دینے کے بجائے پہلے خاندان کے اندر ایک جماعت مقرر کرے بے شک وہ دو یا زیادہ افراد پر ہی مشتمل ہو تاکہ وہ ہی اس نزاع کا فیصلہ کر لیں۔ عدلیہ اور قانون کے استحکام اور تحفظ کے لیے یہی بڑی حکمت عملی ہے جس سے معاشرے میں اور ملک و قوم میں اصلاح اور امن وآشتی کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔[1]

قرآن کریم میں جہاں مختلف رزائل اخلاق کے صدور کے لیے ظالم کے اصطلاح استعمال کی گئی ہیں وہاں ایک مقام پر انسان کی ناشائستہ حرکات مثلاً برے القابات کے استعمال کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔ فقہاء کرام کے نزدیک ایسا شخص جس کی عزت وآبرو یا جس کو برے القابات سے پکارا گیا وہ ہتک عزت کا دعوی بھی دائر کر سکتا ہے۔ اور حکمت کا تقاضا ہے کہ عدالت اس مسئلہ اور ان جیسے اور مسائل جن میں کسی شخص کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کی قبیح اور مذموم کوشش کی گئی ہے تو اس پر عدالت مکمل کاروئی کرے۔ اسماعیل حقی لکھتے ہیں:

"لو قال رجل لصالح یا فاسق ویا ابن الفاسق ویا فاجر ویا خبیث ویا مخنث ویا مجرم ویا مباحی ویا جیفة ویا بلید ویا ابن الخبیثة ویا ابن الفاجرة ویا سارق ویا لص---یلزم التعزیر"[2]

اگر کوئی شخص نیک آدمی کو فاسق یا فاسق کی اولاد یا فاجر یا خبیث یا مجرم، پلید، یا چور کی اولاد، فاجر کی اولاد وغیرہ جیسے الفاظ کہے تو کہنے والے پر تعزیر لازم ہو گی۔

کوئی شخص کسی پر زنا کی تہمت لگائے تو نص قرآنی کے مطابق اس پر حد قذف لگائی جائے گی۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص کسی کے حق میں برے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس کے خلاف اسلامی عدالت میں ہتک عزت کا دعویٰ دائر کیا جاسکتا ہے اور قاضی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ایسے شخص پر اس کے مناسب حال تعزیر لگائے۔ ان میں خبیث، مخنث اور پلید کے الفاظ بھی ہیں جنہیں ہمارے ہاں بڑی بے پروائی سے استعمال کیا جاتا ہے۔

حکمت عملیہ کا بھی یہی تقاضا ہے کہ عدالت اور مقنّنہ معاشرے میں بنیادی اصلاحی نظام کے رائج ہونے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے کہ کوئی شخص اپنا محاسبہ کرنے کے بجائے ہر وقت دوسرا کا محاسبہ کرتا پھرے جس سے معاشرے کی فضا بے رونق اور بے مروت ہو جائے لہٰذا اخوت اور بھائی چارے کا تقاضا ہے کہ ان بنیادی اِصلاحات کو قانون کا حصہ بنا کر عوام کو اس کے فوائد اور نتائج سے آگاہ کیا جائے۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر عدت کے مسائل بیان کیے ہیں مگر ایک خاص مقام پر عدت کے دنوں کو خصوصی پر گننے اور شمار کرنے میں انتہائی احتیاط کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

۱۔ المودودی، تفہیم القرآن، ۲/۱۳۷

۲۔ الحقی، اسماعیل حقی، روح البیان، ۸۳/۹

﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ [1]

توان کو طلاق دو ان کی عدت پر اور گنتے رہو عدت کو

عدت کے ان ایام کو شمار کرنے میں انتہائی احتیاط لازم ہے اس لیے کہ عورت اگر دوسرا نکاح کرنا چاہتی ہے تو عدت کے دنوں کو صحیح شمار کیا جائے گا ورنہ عدالت سے رجوع کرنے کے بعد بھی غلط فیصلہ مرتب ہو سکتا ہے جس کی گناہ گار عدت کے ایام کو شمار کرنے میں بے احتیاطی کرنے والے ہوں گے، عدلیہ کو بھی چاہیے کہ وہ انتہائی محتاط طریقے سے فیصلہ کرے، جب تک عدت کی ابتداء اور اس کی صحیح انتہاء کا علم نہ ہو اس وقت سے فیصلہ کرنے سے گریز کرے، یہ حکم صرف مردوں کے لیے نہیں بلکہ عورتوں کے لیے بھی ہے اور عدت کے صحیح شمار کرنے میں شریعت اسلامیہ نے بہت زیادہ حکمتیں رکھی ہیں اور مرد اور عورت دونوں کے مفادات کا تعلق بھی اسی سے وابستہ ہے۔[2]

اسلامی ممالک اور اسلامی معاشروں میں قائم عدلیہ اور مقنّنہ کو شریعت اسلامیہ کے قانون کو ہی رائج کرنے اور اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرنے کا پابند بنائے جانے میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، جو عدالتیں اپنی مرضی اور حالات اور ماحول کے دیکھ کر اور اسلامی قوانین کے ماورا فیصلے کرتی ہیں قرآن کریم نے ان کو طاغوت [3] قرار دیا ہے۔

دوسری طرف ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص قسم کی بشارت ملی ہے جو توبہ کرنے والے، عابد اور زاہد ہیں، ان کے یہ اوصاف ذاتی ہیں جو ان کی صرف اپنی ذات کو نفع پہنچا سکتے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر اور ایسے لوگ جو اللہ تعالیٰ کی حدود اور اس کے قوانین کو رائج کرنے والے ہوں تاکہ ان کا نفع معاشرے کے دوسرے افراد تک بھی پہنچے اور زمین پر اللہ کا نظام قائم ہو سکے تو ایسے افراد کے لیے بھی انہی کے ساتھ بشارت [4] کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایک اور مقام پر جس عدل اور جس عادلانہ نظام کی تعریف کی ہے:

۱۔ الطلاق: ۱/۶۵

۲۔ الازہری، ضیاء القرآن، ۱۱۱/۷

۳۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا (کیا نہیں دیکھا آپ نے ان کی طرف جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس (کتاب) کے ساتھ جو اتاری گئی آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے (اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لیے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا اور چاہا ہے شیطان کہ بکادے اھیں بہت دور تک) (النساء: ۶۰/۴)، پیر کرم شاہ نے لکھا ہے کہ طاغوت سے مراد وہ حاکم اور وہ عدالت ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے منافی فیصلے کرتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: ضیاء القرآن، ۳۷۶/۲)

۴۔ التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ((ان لوگوں کے اوصاف و اعمال کا یہ حال ہے کہ) (اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے) توبہ کرنے والے، عبادت میں

اس سے مراد ایسے عادل لوگ ہیں جو عدالت میں اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کریں اور قوانین بنانے والے وہی لوگ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں جو اسلامی قوانین کو معاشرے اور ملک وملت میں رائج کریں۔[۱]

مجرم کی توبہ کے بعد بے جا انسانی مداخلت

مسلم معاشرے میں عدل وانصاف کی فراہمی کے لیے قائم عدالتی نظام ایک حد تک انسان کے جرائم میں مداخلت کر سکتا ہے۔ جب سزا پوری ہو جائے اور عدلیہ کی طرف سے نافذ کی گئی سزا جو اسلامی قوانین کے عین مطابق ہے، دے دی جائے پھر ایک شخص اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے اور اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کر لے تو پھر ماضی کی باتوں کو کریدنا، بداخلاقی کرنا نہ ہی معاشرے میں باقی انسانوں کے لیے جائز ہے اور نہ عدلیہ کے لیے جائز ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴾[۲]

اور جو دو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو ان کو ایذا دو پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان کا خیال چھوڑ دو بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

کوئی مرد یا عورت اگر ایسا فعل کر بیٹھے جو شریعت کے نزدیک گناہ ہو تب بھی اس کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے گا وہ قانون کے مطابق کیا جائے گا نہ کہ قانون سے آزاد ہو کر۔ وحید الدین خان لکھتے ہیں:

"قانون کے تقاضے پورا کیے بغیر کسی کو مجرم قرار دینا درست نہیں۔ کسی کا مجرم ہونا دوسرے کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس کے خلاف ظالمانہ کارروائی کرنے لگے۔ سزا کا مقصد عدل کا قیام ہے اور عدل کا قیام ظلم اور بے انصافی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔"[۳]

یعنی اگر گناہ کرنے والا تائب ہو جائے اور اپنی اصلاح کر لے تو اس کے بعد تو لازم ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ شفقت اور درگزر کا معاملہ کیا جائے۔ کسی کو ماضی کی بنیاد پر اس کو مطعون کرنا درست نہیں۔ جب اللہ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا ہے تو انسان کو کیا حق ہے کہ ایسے کسی شخص کو طنز وملامت کا نشانہ بنائیں۔ ایسے کسی

سرگرم رہنے والے، اللہ کی حمد وثنا کرنے والے، سیر وسیاحت کرنے والے، رکوع وسجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (اے پیغمبر! یہی سچے مومن ہیں) اور مومنوں کو (کامیابی وسعادت کی) خوش خبری دے دو۔) (التوبہ: ۱۱۲/۹) ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف اپنی ذات کی اصلاح پر قانع نہیں ہوتے بلکہ معاشرے کے ہر فرد کی اصلاح کے لیے عدلیہ اور قانون کے بہتر اور اسلامی نظام کے قائم ہونے کو جائز اور مستحسن سمجھ کر اس کی بالادستی کے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں ایسے لوگ بھی بشارت الٰہی کے مستحق ہیں۔ (ملاحظہ ہو: ترجمان القرآن، ۱۳۵/۳)

۱۔ التھانوی، بیان القرآن، ۴/۳۷

۲۔ النساء: ۱۶/۴

۳۔ وحید الدین خان، تذکیر القرآن، ۱۷۴/۳

شخص کو طنز و ملامت کا نشانہ بنا کر آدمی خود اپنے آپ کو مجرم ثابت کر رہا ہوتا ہے نہ کے ماضی میں ایک جرم کرنے والے شخص کو ملامت کر رہا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قطب شہید لکھتے ہیں:

"تعديل أساسي في الشخصية والكينونة والوجهة والطريق والعمل والسلوك . ومن ثم تقف العقوبة وتكف الجماعة عن إيذاء هذين المنحرفين الشاذين . وهذا هو الإعراض عنهما في هذا الموضع : أي الكف عن الإيذاء"[1]

توبہ و اصلاح سے مراد ان کی زندگی میں مکمل تبدیلی ہے۔ ان کے نقطہ نظر اور طرز عمل کی سمت کی مکمل تبدیلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مکمل اور ہمہ جہت اصلاح کے بعد ان کی سزا موقوف ہو جاتی ہے اور سوسائٹی بھی ایسے منحرف اور بے راہ افراد کی سزا کو جاری رکھنے پر اصرار نہیں کرتی۔ یہاں ان کو چھوڑ دینے سے مراد یہی ہے کہ ان کی سزا کو موقوف کر دیا جائے۔

عدالت، تھانہ اور جیل کا اسلامی تصور اور حکمت کے اطلاقات

اسلامی معاشرے میں جرائم کی روک تھام کے لیے جیل اور تھانے کو جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ مجرم قید تنہائی میں اپنا محاسبہ کرنے کے ساتھ ساتھ ماضی میں کیے گئے جرائم سے توبہ کرے اور مستقبل میں ایک وفادار شہری اور اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بندہ بن کر زندگی گزارے۔ تھانے اور جیل کے اس تصور میں مجرم کی ذاتی زندگی کو بھی فائدہ ہو گا اور باقیوں کے لیے عبرت کا موجب بھی گا، قرآن کریم کی آیت کریمہ

﴿وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ ۖ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا﴾[2]

اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ ان پر چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دیویں تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ اٹھا لیوے ان کو موت یا مقرر کر دے اللہ ان کے لیے کوئی راہ

امین احسن اصلاحی کے نزدیک ﴿ فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ ﴾ کے مطابق تعزیرات کے مکمل نفاذ کے لیے جیل اور تھانے کا سسٹم کا جواز موجود ہے[3]۔ ماجد دریاآبادی لکھتے ہیں:

"زنا کی ایک سزا ابتداء اسلام میں عمر قید یا دائم الحبس تھی۔"[4]

۱۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۶۹/۲

۲۔ النساء: ۱۵/۴

۳۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۲۳۱/۲

۴۔ الماجدی، تفسیر ماجدی، ۲۸/۳

اگر جیل اور تھانے کا تصور غیر اسلامی اور برائے نام ہوگا یا امیر اور غریب کے لیے الگ الگ جیل اور کوٹھڑی ہوگی تو کبھی بھی قید ہونے والا شخص کا ضمیر نہیں جاگ سکتا اور نہ وہ سچی توبہ کر سکتا ہے۔ اسی برائے نام کلچر سے بدامنی ختم کبھی نہیں ہوگی بلکہ اور زیادہ بڑھے گی، مولانا ادریس کاندھلوی لکھتے ہیں:

"کتب تاریخ اس پر شاہد ہیں جب سے مغربی تہذیب کا دور دورہ شروع ہوا اور یہ شرعی سزا (چوری پر ہاتھ کاٹنا) موقوف ہوئی اس وقت سے چوری کا بازار گرم ہے بدمعاش لوگ جیل خانہ کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور اس زمانہ میں تو عدالت کی کوئی دقت اور پریشانی اس بات میں نہیں ہے کہ لوگ رشوت اور سفارش سے بری ہو جاتے ہیں۔"[1]

تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور امت کو انتشار اور افتراق سے بچانے کی حکمت عملی یہ تھی کہ قوم اور معاشرے آپس میں متفق رہیں اور جدا جدا نہ ہوں، موجودہ دور میں بھی حکام عوام کے اندر اتفاق اور اتحاد کی فضا قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس سلسلے میں عدالتوں کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے، ادریس کاندھلوی لکھتے ہیں:

"عدالتوں کا قیام اسی لیے ہے کہ اہل حق کا حق دلایا جائے اور ظالموں کو سزا دی جائے۔۔۔ عدالت میں اگر کوئی شخص یہ دعوی کرے کہ فلاں شخص نے میرے مال یا آبرو پر یہ زیادتی کی ہے تو جج کو یہ حق نہیں کہ ظالم اور مظلوم دونوں کو یہ کہہ کر عدالت سے باہر نکال دے کہ تم دونوں ملک میں تفرقہ پھیلاتے ہو یا دونوں کی زبان بندی کا حکم دے ڈالے عدالت اگر ایسا حکم دیدے تو یہ عدل نہ ہوگا۔"[2]

غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دینے والوں میں تیسرا درجہ امراء اور حکام کا ہے، یہ قوت اور اقتدار سے اور ہر دور کے مروج اور موثر ہتھیاروں سے کفار کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور اللہ کے دن کو سربلند کرتے ہیں اور اسلام کی نشر و اشاعت کرتے ہیں، اسلام کی سرحدوں کا دفاع کرتے ہیں اور اپنے ملک میں اسلامی نظام کو قائم کرتے ہیں، اللہ کی حدود کو نافذ کرتے ہیں۔ نمازوں کی ادائیگی اور زکوۃ کی وصولی کا نظام قائم کرتے ہیں۔ فوج کا محکمہ، عدالتیں اور دینی درسگاہیں قائم کرتے ہیں۔"[3]

قانون شریعت کو صحیح نافذ کرنے کا طریقہ کار اور حکمت عملی علماء سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ عصر حاضر میں جن کے ذمہ قانون بنانا اور قوانین میں ترامیم کرنا ہے وہ ایسی تاویلیں کرتے ہیں جو شریعت اسلامیہ کے خلاف ہیں اور ان کی اپنی خواہشات اور غرض اور لالچ کے مطابق ہیں۔ جب علماء شریعت اسلامیہ کے نفاذ اور تنفیذ کی باتیں کرتے ہیں اور یہ حکمت عملی طے کرتے ہیں کہ کس طرح قانون اور عدالت صحیح طور پر اسلام کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کروا سکتی ہیں تو جاہل اور بے عقل عوام ان علماء پر آواز کستے ہیں کہ یہ علماء تفرقہ بازی پھیلاتے ہیں، اور ان لوگوں کے

۱۔ الکاندھلوی، معارف القرآن، ۲/۲۲۷

۲۔ ایضاً، ۲/۲۲۹

۳۔ السعیدی، تبیان القرآن، ۵/۳۳۲

بارے میں کوئی بات نہیں کرتے جو اسلامی قوانین کے غلط اور عجیب وغریب تاویلیں کرتے ہیں۔ گویا ایسے لوگ جو اسلامی قوانین کی غلط تشریحات کریں وہ حکومت اور عوام کی نظر میں چالاک، ہوشیار اور قانون دان ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس علماء کو تفرقہ بازی پھیلانے والے کہا جاتا ہے، تو اس طرح قانون اور عدالت کے ذریعے سیاست مدن میں اسلامی قوانین کے رائج کرنے مشکل ہو گا اور حالات مزید ابتر ہوں گے۔[۱]

اسی طرح فوجی عدالتوں کے قیام اور مارشل لاء کا بھی شریعت اسلامیہ کی نظر میں ایک مقصد اور حکمت ہوتی ہے کہ ملک سے بغاوت، اور فتنہ وفساد کا یقینی خاتمہ ہو سکے اور ایسے قوانین جو غیر اسلامی ہیں ان کا خاتمہ کیا جا سکے اور جن اسلامی قوانین پر مکمل عمل درآمد نہیں ہو رہا ان پر بزور قوت عمل کروایا جا سکے۔ مگر پچھلی کچھ دہائیوں سے طاقت کے زور پر یک لخت حکومت کو ختم کر کے آنے والے حکمرانوں نے مختلف اسلامی قوانین کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو خلاف تہذیب کا نام دیا جو اسلامی حکمت عملی اور اسلامی تدبیر کے سراسر منافی ہے۔ ان قوانین میں ایک قانون ارتداد کا تھا جس پر عمل کروانا لازم تھا مگر اس قانون کی غلط تشریحات کر کے اس کو اسلام کے اصولوں کے مطابق نہ ڈھالا گیا۔ حتیٰ کہ مارشل لاء کے احکام پر تبصرہ کرنے کی بھی کسی کو اجازت نہ دی گئی۔[۲]

عصر حاضر میں کرپشن اور رشوت نے پوری حکومت کو ہی اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ حکمرانوں سے لے کر چھوٹی عدالتوں کے ماتحت افراد سب اپنے اپنے اعتبار اور حساب وکتاب سے کرپشن اور رشوت میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ جتنے بڑے لوگ سمجھے جاتے ہیں اتنی ہی بڑی رشوت لیتے ہیں۔ اسی تناظر کو عبدالکریم اثری نے الفاظ میں لکھا ہے:

> ''قرآن کریم نے جس بات سے مسلمانوں کو روکا ہے آج مسلمان وہی کچھ کر رہے ہیں اور ہم اس لعنت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو مغربی ممالک ان پر مسلط کر دیں۔ آپ اپنے ملک کے حالات پر غور کر کے سب کچھ سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری زندگی کا وہ کونسا شعبہ ہے جو ان کی ہدایات کے مطابق نہیں چل رہا۔ حکومت کے ایوانوں سے لے کر مجسٹریٹوں کی عدالتوں کے چپڑاسیوں تک سب انھیں کے قانون کے پابند ہیں اور رشوت کا کاروبار اس پر اضافہ ہے۔ ہاں! اب رشوت کو رشوت نہیں کہا جاتا بلکہ اس کو حق سمجھا جاتا ہے۔''[۳]

عدالت اور مقننہ کا دائرہ کار شریعت اسلامیہ میں واضح ہیں۔ سیاست مدن میں حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ چونکہ شریعت نے ہر ایک شعبہ کا دائرہ کار متعین کر دیا ہے لہذا ہر ایک کو وہی ذمہ داری دی جائے جس کا وہ اہل ہے اور پھر ہر رکن اپنے دائرے کار میں رہ کر اپنا کام کرے تاکہ شہری اور ملکی سطح پر اسلام کے قوانین کا عمل کرنا اور کرانا آسان ہو اور امن عامہ کے قیام کو ممکن بنایا جا سکے۔

۱۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۱۵۸/۴

۲۔ الکاندھلوی، معارف القرآن، ۳۴۴/۲

۳۔ اثری، عروۃ الوثقی، ۱۴۵/۸

مبحث سوم

تدریج وتنفیذ کی حکمت عملی اور اس کے تفسیری اطلاقات

انسان کی تخلیق کا واحد مقصد اللہ تعالیٰ کی پہچان ہے۔ اس پہچان اور معرفت کے طریقے عبادات، معاملات اور اس کی قدرت کی نشانیاں کو سمجھنے سے ملتے ہیں۔ زمین پر انسان اللہ کی معرفت اس کے ان خاص بندوں کی اطاعت اور اتباع کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا جن کی طرف اللہ تعالیٰ کا پیغام مختلف وقت میں زمانے، وقت اور حالات کے پیش نظر پہنچتا رہتا ہے،انبیاء کرام علیہم السلام نے زمین پر اللہ تعالیٰ کے نظام اور اس کے قوانین کو رائج کرنے اور اس کے نفاذ کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے اور اس کوشش میں ان مقدس ہستیوں نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے نظام کو نافذ کرنے کا عمل جاری رکھا حتی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری نبی ﷺ کی طرف آخری پیغام پہنچا دیا گیا۔

احکامات کے نفاذ میں تدریج کی نبوی حکمت عملی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو دو چیزیں سامنے آتی ہیں جو احکامات کے تنفیذ میں ضروری ہیں۔ اخلاق حسنہ میں صبر و تحمل اور نرمی کا پہلو اور ہر ایک کے لیے دعوت کا وسیع میدان مہیا کرنا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مومنوں پر بہت زیادہ حریض، حلیم الطبع اور اپنے بیان میں نرمی اور لطافت میں بے مثال تھے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اقوال وافعال سے اپنے آخری پیغام کو زمین میں نافذ کرانا تھا۔ آپ ﷺ کو وصف لینت[1] سے سرفراز کرنے کی جہاں عنداللہ اور بھی حکمتیں ہوں گی وہاں عقل انسانی میں جو حکمت ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے جس کی وضاحت ابن عاشور نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ”فَكَانَ لينه رَحْمَةً مِنَ اللهِ بِالْأُمَّةِ فِي تَنْفِيذِ شَرِيعَتِهِ بِدُونِ تَسَاهُلٍ وَبِرِفْقٍ وَإِعَانَةٍ عَلَى تَحْصِيلِهَا“[2]

> تاکہ آپ ﷺ اپنے خلق عظیم اور اپنی زبان جو اللہ تعالیٰ کی وحی کی ترجمان ہے، اس سے امت پر آسانی سے بغیر کسی تردد اور مشکل کے اللہ کے نظام کو نافذ کر سکیں۔

پھر آپ ﷺ کو کافة للناس[3] کے وصف سے نمایاں کیا تاکہ آپ ﷺ کی شریعت پورے خطہ زمین پر جاری ہو سکے۔ قرآن کریم میں اسی تدریج کی وضاحت کی گئی ہے۔

---

۱ ۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آل عمران: ۱۵۹/۲)

۲ ۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۱۴۵/۴

۳ ۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (سبا: ۲۸/۳۴))

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا﴾ [1]

اور کہنے لگے وہ لوگ جو منکر ہیں کیوں نہ اترا اس پر قرآن سارا ایک جگہ ہو کر اسی طرح اتارا تاکہ ثابت رکھیں ہم اس سے تیرا دل اور پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر۔

قرآن کریم جو شریعت اسلامیہ کا مآخذ اول ہے اس میں تدریج کا پہلو ہے اسی طرح نبی کریم ﷺ کی سنت میں، آپ ﷺ کا امت کو دعوت دینے میں اور احکامات کو نافذ کرنے میں بھی تدریج کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

جغرافیائی حدود اور اسلامی حدود کی اہمیت

جن ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کی حکمرانی ہے وہاں کے علماء اور حکماء دونوں کی ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اسلامی ممالک کی جغرافیائی حدود کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اسلام کے قوانین کی بھی نہ صرف حفاظت کریں بلکہ اس کو عملاً راسخ کرانے میں بھرپور اقدام کریں۔

ملکی قوانین میں ترامیم کر کے اسلامی قوانین بنانا اور ان فرسودہ نظام کی جگہ اسلام کے نظام کو لانے کی کوشش کرنا انتہائی احسن اقدام ہیں لیکن ان قوانین کے اصل مقاصد اور حکمتیں تب ہی پوری ہوں گی جب ان پر عمل کروانے کے لیے عملی اقدام کیے جائیں گے۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت کتنے اہتمام اور تدابیر سے کی جاتی ہے لیکن اسلامی قوانین بنا کر چھوڑ دیے جاتے ہیں ان قوانین کی حفاظت اور ان کی تنفیذ بھی علماء اور اس سے زیادہ حکماء کی بھی ذمہ داری ہے، عبدالقیوم قاسمی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"میں صاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلامی قوانین کا نفاذ اور اسلامی مملکت کے قیام کا خیال حقیقی اسلامی سربراہ کے بغیر بے معنی ہے، گویا نظام کا سنگ بنیاد ہی سچے مسلمان اور عادل حکمران کی ذات ہے کوئی بھی اصلاحی قدم اس کے بغیر بے معنی ہے۔" [2]

آپ کی اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی حکومت جو اسلامی نظام کی دعوی دار ہے، اس وقت تک صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی جس وقت تک وہ اسلام کے قوانین کی تنفیذ کا مکمل حق ادا نہ کرے صرف قوانین میں ترامیم لانے سے مقاصد پورے نہیں ہوں گے۔ پاکستان کا آئین بھی قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ سے متصادم نہیں ہے لیکن اصولی طور پر پاکستان کے دستور میں یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے جس کو ڈاکٹر اسرار احمد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

۱۔ الفرقان: ۳۲/۲۵

۲۔ القاسمی، معارف الفرقان، ۳۹/۲

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah".

کوئی قانون اللہ اور اس کے رسول کی منشا کے خلاف نہیں بنایا جاسکتا لیکن اس کی تنفیذ و تعمیل کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے"[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے لکھے ہوئے قوانین اور اپنے بنائے ہوئے اصولوں سے روگردانی کی وجہ سے اسلامی مملکت صرف نام کی اسلامی مملکت رہ جاتی ہے۔ باقاعدہ طور پر اسلام کی حدود کو نافذ کرنا ہی سیاست مدن میں حکمت عملیہ کا تقاضا اور اس کی ضرورت ہے۔

احکام کی تنفیذ اور حدود کا قیام

شریعت کے احکام کو نافذ کرنے کے لیے حدود اور قیود کا قیام ناگزیر ہے۔ ان حدود کو اسلام کے بتائے ہوئے قوانین کے تحت نافذ کرنے میں ہی اسلامی نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔ حدود کو قائم کرنے میں مفسرین کا نزدیک حکمت یہ ہے کہ تاکہ ظلم وفساد کا قلع قمع وہ سکے اور اسلامی مملکت کے اندر جو لوگ فساد پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں ان کو خاتمہ ہو سکے، اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے عہد میں بھی اسلامی حدود کا نافذ کیا گیا اور یہی سلسلہ عہد خلفاء راشدین میں بھی جاری رہا۔ اگر حدود مکمل طور پر عہد نبوی اور عہد صحابہ میں نافذ نہ کی جاتی تو احکام کی تنفیذ کو کوئی نمونہ سامنے نہ رہتا لہٰذا اسلامی حکومت کے خلفاء کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی قوانین کے نفاذ کو بغیر کسی تفریق کے جاری کریں، اس لیے کہ پاکستان کے پورے فوج داری قانون میں اسلامی تعزیرات کا نفاذ بھی نہیں ہے اور نہ ہی اس پر عمل درآمد کرنے یا کرانے کی کسی قسم کی شق موجود ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذریعے احکام کی تنفیذ کسی پر لازم نہیں کرتا کہ وہ مجبور محض ہو جائے بلکہ احکام کو اپنی ذات اور اپنی رعایا پر لازم کرنے اور ان احکام کو نافذ کرنے میں اس کو اختیار دیا جاتا ہے۔ اور احکام کی تنفیذ میں حکمت یہ ہے کہ وہ کافروں پر بھی عذاب بغیر تنبیہات کے نہیں فرماتا بلکہ ان کو بھی ایمان لانے اور اپنے اعمال صالح بنانے کی مہلت فراہم کرتا ہے جب کہ جو عذاب کا مستحق ہو جائے اور کو عذاب دینے میں اس کی کمال حکمت یہ ہے کہ یہ عذاب بھی صالحین پر کمال رحمت ہوتی ہے اس لیے کہ جسم کا جو عضو گندہ اور ناکارہ ہو جائے تو اس کو باقی صالح جسم سے جدا کر دینا ہی عین حکمت الٰہی ہے اور ایسے لوگوں کو عذاب دینا ہی باقی جہاں کی امن وسلامتی کا ضامن ہے۔ احکام کی تنفیذ اور اس کو نافذ نہ کرنے والے عذاب کا مستحق بنتے ہیں۔ علامہ سعیدی ایسے لوگوں کو عذاب دینے کی حکمتیں درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ اسرار احمد، بیان القرآن، ۱۳۳/۳

۲۔ السواتی، معالم العرفان، ۱۲۱/۷

فصلوں کی زرخیزی اور زرعی پیداوار کی بہتات سے زیادہ نفع حدود کے قائم کرنے میں ہے ۔۔اگر قہر اور غلبہ میں کوئی فائدہ نہ ہوتا تو حدود کو مشروع نہ کیا جاتا (تو نظام الٰہی قائم نہیں ہو سکتا اور فساد کا خاتمہ ممکن نہ ہوتا) کیونکہ اگر نفاذ حدود کے ذریعہ معاصی ' فواحش اور جرائم کی روک تھام نہ کی جائے اور منکرات اور فواحش بڑھ جائیں تو پھر زمین میں پانی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ فصلیں ویران ہو جاتی ہیں اور رزق میں کمی ہو جاتی ہے۔[1]

ولایت تنفیذ احکام

اسلامی احکام کو نافذ کرنے کے حقوق مختلف اقسام اور نوعیت کے ہیں اور ان احکام کو نافذ کرنے والے افراد کے مختلف درجات ہیں۔ ایک گھر کے اندر شوہر کی حیثیت بھی گھریلو معاملات میں احکام کو نافذ کرنے کا حق رکھتا ہے اور یہ حق اس کو شارع کی طرف سے عطا کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس کی حیثیت قوام[2]، راعی[3]، زوج[4] یعنی شوہر کی ہے۔اللہ تعالیٰ نے شوہر کو بیویوں کے درمیان عدل کو نافذ کرنے کا حکم دیا ہے جب کہ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴾[5]

اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو جیسے ادھر میں لٹکتی اور اگر اصلاح کرتے رہو اور پرہیزگاری کرتے رہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

اس سے اشارہ ملتا ہے کہ شوہر کو گھر کے اندر احکام اسلامیہ کی تنفیذ کا حق حاصل ہے۔ شریعت اسلامیہ کے احکام کا صحیح نفاذ ایک مسلمان حکمران سے ہی ممکن ہے کیونکہ اسلامی معاشرے میں غیر مسلم حاکم نہ ہی اسلامی قوانین کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور نہ ہی ان قوانین کو احترام اور اہمیت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کا ارشاد[6] اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ کفار تو ایک دوسرے کے دوست ہیں لیکن اگر مسلمان اپنے قوانین کے نفاذ

---

١ ۔ سعیدی، تبیان القرآن، ۲۷۷/۸

٢ ۔ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (النساء: ۳۴/۴)

٣ ۔ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالْإِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ (بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس، باب العبد راع فی مال سیدہ ولا یعمل الا باذنہ، رقم الحدیث ۲۴۰۹)

٤ ۔ نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں، اور شوہر کے پیچھے بھی اس کی آبرو اور ہر امانت کی حفاظت کرتی ہیں، اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ فرمانبرداری تو امیر، حاکم، راعی کی ہی جاتی ہے، اس اعتبار سے مرد ہی خاندان کا حاکم قرار پاتا ہے۔

٥ ۔ النسآء: ۱۲۹/۴

٦ ۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (الانفال: ۷۳/۸)

میں ان کی پیروی کریں تو اس سے فتنہ وفساد پیدا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے کے اہم اصولوں میں سے یہ ہے کہ حاکم وقت خود مسلمان ہو اور دین اسلام پر کاربند ہو۔ ابو زھرہ مصری لکھتے ہیں:

"أن المسلمين الذين يكونون فى ولاية غيرهم يفتنون فى دينهم ، ولومن قبيل العدوى وعدم تنفيذ أحكام الإسلام فى الدولة"[1]

جو لوگ غیر مسلموں کے زیر سایہ کام کر رہے ہیں یا آباد ہیں وہ اپنے دین میں سخت تکالیف اور فتنے میں مبتلا ہوتے ہیں اور اگر وہ دشمن کے کنٹرول میں ہیں تو اسلام کے نفاذ میں ناکام رہتے ہیں۔

خلاصہ

اسلامی مملکت میں مسلمان حاکم کے لیے اسلامی قوانین کو نافذ کرنا اگرچہ تدریجی طور پر ہوں، آسان اور ضروری ہے۔ اور اس سے اقلیتی معاشرے میں بھی اسلام کی رغبت پیدا ہو گی اور اسی حکمت عملی کی وجہ سے اسلامی قوانین کا نفاذ مسلم اور غیر مسلم معاشرے میں راسخ ہو جائے گا۔

جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال کے اندر اسلام کے قوانین کا نفاذ کریں یہی ان کے لیے ضروری اور ان کی دنیا اور آخرت میں موجب سعادت ہے۔

۱۔ ابو زھرہ، زھرۃ التفاسیر، بیروت، دار الفکر العربی، ص ۱۰۹۶

فصل دوم

معیشت میں حکمت قرآنی کے تفسیری اطلاقات

مبحث اول: اکتساب مال میں حدود قیود کی حکمت کے تفسیری اطلاقات

اسلام نے اپنے پیروکاروں کو ایک خاص نہج پر معیشت کا نظام دیا ہے۔ اس نظام معیشت میں دو چیزیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں، ایک کا تعلق مال کے کسب یعنی حاصل کرنے کے ساتھ ہے اور دوسری کا تعلق مال کے مصرف اور اس کے خرچ کرنے کے ساتھ ہے، اسلامی نظام معاشیات میں دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں، اس لیے کہ اگر مال کو حاصل کرنے کے ذرائع حلال اور پاکیزہ ہیں تو مال کو خرچ کرنے میں بھی اسلام کی طرف سے حدود متعین کی گئی ہیں، ان حدود وقیود کی پابندی بہر حال ہر ایک پر لازم ہے۔ اس طرح مال کے حاصل کرنے کے ذرائع اور مال کو خرچ اور اس کے مصرف پر بھی گہری نظر کرنی ہو گی اور دونوں طرف سے اسلام کی حدود وقیود کا خیال رکھنا ہو گا۔ دونوں اعتبار سے شریعت اسلامیہ نے حکمتیں رکھیں ہیں اور ان حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ مال کے کسب اور مصرف دونوں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے تحت ہوں۔ اگر ایک شعبہ تو اسلامی قوانین کے مطابق ہے اور دوسرا حدود وقیود کی پاسداری نہیں کر رہا تو پھر بھی فتنہ وفساد لازم آئے گا لہٰذا دونوں طرف کی حکمتیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اسلام کے نظام معشیت میں بنیادی یہی فرق رہا ہے کہ اسلام دونوں طرف کے ذرائع میں حدود قیود رکھتا ہے جب کہ سرمایہ دارانہ نظام مصرف اور کسب ہر دو ذرائع میں کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کسی حرام ذریعہ سے رزق حاصل کرنے اور خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مدنی الطبع زندگی میں انسان کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھنا حکومتی سطح پر ضروری ہے۔ کھانے پینے کے آسان اور سادہ ذرائع اور تن ڈھانپنے کے لیے مکان وغیرہ کا بندوبست کرنا سیاست مدن میں حکومت پر لازم ہے اور اسی طرح علاج اور صحت کے سارے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر حاکم وقت مال کے ذرائع میں اور اس کے مصارف میں آسانیاں پیدا کرے اور لوگوں کو اس بات کا شعور دلائے کہ ان کے لیے حلال اور جائز ذرائع کون سے ہیں تو اس کے اندر بنیادی حکمت یہ ہے کہ تاکہ عوام اپنے اپنے حقوق کو پہچان سکیں کہ ایک طرف کمانے والا چوری، ڈاکہ، فراڈ سے مال نہ حاصل کرے اور بدامنی کو فروغ نہ ملے اور دوسری طرف مال

کے اندر مصارف کو بھی ضروری قرار دیا تاکہ معاشرے کے اندر مساوات، عدل، ایثار، دلجوئی، احسان کا جذبہ برقرار رہے۔[1]

قرآن کریم میں رزق سے مراد

مال کے نظام کسب اور نظام مصرف کو سمجھنے اور اس میں حکمت سے متعلق آگاہی حاصل کرنے کے لیے رزق کے قرآنی مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔

قرآن کریم کی اصطلاح (رزق) وسیع مفہوم کو شامل ہے۔ اس سے مراد صرف مال و دولت نہیں اور نہ ہی انسانی زندگی کی سہولتوں اور آرائشوں کے لیے کوئی ایک خاص قسم کی سہولت یا نعمت شامل ہے بلکہ ابن کثیر (۱۳۰۱ء-۱۳۷۳ء) لکھتے ہیں:

> ''جمعت هذه الدعوة كل خير في الدنيا، وصرفت كل شر فإن الحسنة في الدنيا تشمل كل مطلوب دنيوي، من عافية، ودار رحبة، وزوجة حسنة، ورزق واسع، وعلم نافع، وعمل صالح، ومركب هنيء، وثناء جميل، إلى غير ذلك مما اشتملت عليه عبارات المفسرين، ولا منافاة بينها، فإنها كلها مندرجة في الحسنة في الدنيا''[2]

> اس دعا میں تمام بھلائیاں دین و دنیا کی جمع کر دی ہیں اور تمام برائیوں سے بچاؤ ہے، اس لئے کہ دنیا کی بھلائی میں عافیت، راحت، آسانی، تندرستی، گھربار، بیوی بچے، روزی، علم، عمل، اچھی سواریاں، نوکر چاکر، لونڈی، غلام، عزت وآبرو وغیرہ تمام چیزیں آگئیں۔

یعنی رزق سے مراد ہر وہ نعمت جو انسان کو زندگی گزارنے میں مدد دے سکے اور اس کی مشکلات اور پریشانیاں دور کر سکے اور اس کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں بھی اور اور اپنے جان کی حفاظت اور درستگی کے لیے بھی آسانیاں فراہم کر سکے۔

رزق میں تفاوت اور حکمتیں

انسانی معاشرہ جس طرح مختلف طبقات اور درجات میں تقسیم ہے اور اس کی رنگ، نسل، وطن، اور قوم میں تفاوت ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے رزق میں بھی درجات رکھے ہیں، کچھ حکمتیں تو وہ ہیں جن کو قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے اور پھر مفسرین کرام نے ان کی وضاحت فرمائی ہے لیکن کچھ مصلحتیں اور حکمتیں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

۱۔ السواتی، عبدالحمید، معالم العرفان، ۲۸۸/۶

۲۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۵۵۸/۱

﴿وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ ۚ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾[1]

اور اللہ نے بڑائی دی تم میں ایک کو ایک پر روزی میں، سو جن کو بڑائی دی وہ ہیں پہنچا دیتے اپنی روزی ان کو جن کے مالک ان کے ہاتھ ہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں، کیا اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔

رزق میں تفاوت اور کمی بیشی اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ رزق یا دولت ہے وہ اپنے جیسے دوسرے بھائی کو دے تاکہ معاشرے میں دلجوئی کی فضا قائم ہو اور معاشرے کے غریب افراد بھی کھانے اور لباس وغیرہ کا اہتمام کر سکیں۔ رزق میں تفاوت کا مطلب یہ نہیں کہ جس کے پاس دولت نہیں ہے اس کے ہر طرح سے کم درجے کا سمجھا جائے بلکہ اس کو مال و دولت عطا کر کے اپنے جیسے رہن سہن کے برابر لایا جائے۔ اسی وجہ سے کوئی قرآن کریم کی اس آیت[2] کے بارے میں سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کسی تقسیم ہے کہ جس کو چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح بندوں کے اعمال اور ان کی طرف سے کی گئی اطاعت کے مختلف درجات ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اوصاف بھی بے شمار ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور تدبیر سے ان کی تقسیم میں تفاوت رکھی ہے، ہر ایک کے لیے اسی کی نیکیوں اور اطاعت کے اعتبار سے تقسیم رکھی گئی ہے، علامہ زمخشری (۱۰۷۵ء-۱۱۴۳ء) اس کی مزید وضاحت میں لکھتے ہیں:

"ویصیب هذا حظ له وصف لیس ذلك الوصف لحظ صاحبه، فمن قسم له منهم ما لا یقسم للآخر فقد رزقه"[3]

رزق میں ہر ایک کے لیے مقرر حصہ ہے جو اس کے حصہ میں ہے اس کے ساتھ والے کے حصہ میں اس جیسا نہیں (یا زیادہ ہوگا یا کم)، پس جو تقسیم ایک کے لیے ہے وہ دوسرے کے لیے نہیں ہے، یہی رزق کا مفہوم ہے۔

اسی طرح معاشرے میں رزق کے تفاوت کے اندر ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کے ساتھ دوسرے کئی غریب لوگوں کا رزق وابستہ کر دیا گیا، تاکہ کچھ لوگوں کو بغیر حساب کے رزق ملے اور کچھ لوگ رزق کی تلاش میں اسباب دنیا کو استعمال کریں اور اسی محنت میں ان کے لیے برکت اور وسعت رکھ دی گئی۔ علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

۱۔ النحل: ۱۶/۷۱

۲۔ اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ (الشوریٰ: ۴۲/۱۹)

۳۔ الزمخشری، کشاف، ۲/۶۲۰

"وذلك لحكمة بالغة تقصر عقول العباد عن تعقلها والإطلاع على حقيقة أسبابها وكما جعل التفاوت بين عباده فى المال جعله بينهم فى العقل والعلم والفهم وقوة البدن وضعفه والحسن والقبح والصحة والسقم وغير ذلك من الأحوال"[1]

یہ عظیم حکمت ہے جس کا انحصار بندوں کی عقلوں کے ساتھ منحصر کر دیا گیا ہے تاکہ اسباب پر انسان کی گہری نظر رہے اور دنیا میں پھیلے اسباب کو کماحقہ استعمال میں لایا جاسکے، جس طرح مال میں تفاوت ہے اسی طرح عقل، علم، فہم اور بدنی قوتوں اور حسن وقبح میں اور صحت اور بیماری میں اور ان جیسے باقی معاملات زندگی میں بھی تفاوت رکھا گیا ہے۔

اس فرق سے یہ حکمت سامنے آتی ہے کہ تاکہ معاشرے میں ہر ایک شخص کا تعلق اور ضرورت دوسرے کے ساتھ وابستہ رہے اور زمین میں پھیلے تمام اسباب وسائل بروئے کار لائے جائیں تاکہ ہر ایک ان اسباب کو اپنی حکمت وبساط اور تدبیر سے استعمال کر سکے اور پھر اس پر مزید یہ کہ معاشرے میں کمزور، طاقت ور، عالم، جاہل، بادشاہ، رعایا ہر ایک کی ضرورت اپنے اعتبار سے مختلف رہتی ہے۔ تو اس تفاوت کے اندر یہ بھی حکمت ہے کہ ہر ایک اپنی ضرورت کو حاصل کرنے میں تگ ودو کرے۔[2]

مادی وسائل اور معیشت کے تمام تر اسباب کا تعلق بھی رزق کے ساتھ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کی ذہنی اور جسم کی صلاحیتوں کا تعلق بھی رزق کے ساتھ ہے جیسا کہ ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

"رزق سے مراد مادی اسباب وسائل ہی نہیں بلکہ انسان کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں بھی شامل ہیں۔ مادی وسائل کی کمی یا زیادتی کے بارے میں کوئی شوسلسٹ یا کمیونسٹ اعتراض کر سکتا ہے کہ یہ غلط نظام اور غلط تقسیم ہے جس کا ذمہ دار خود انسان ہے مگر یہ اٹل حقیقت ہے کہ ہر انسان کی ذہنی استعداد اور جسمانی طاقت ایک جیسی نہیں ہوتی۔"[3]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ معیشت میں زیادتی یا نقصان کا تعلق انسان کی صلاحیتوں کے ساتھ ہے۔ انسان کی عقل اور جسم کی صلاحیتیں مختلف ہونے کے ساتھ ہی اس کے معاشی نظام پر بھی کمی یا زیادتی ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں میں تفاوت کا ہونا اور پھر اس کے نتیجہ میں رزق اور معیشت میں کمی یا زیادتی کا ہونا اللہ تعالیٰ کی حکمت کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر حکومتی مافیا کی طرف سے یا خود رعایا کے اندر ہی سے کچھ مافیا

۱۔ الشوکانی، فتح القدیر، ۱۷۸/۳

۲۔ امام فخر الدین رازی نے بھی رزق کی تقسیم میں تفاوت کی حکمتوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی وضاحت کی ہے کہ اگر یہ تفاوت اور تقسیم میں فرق نہ ہوتا تو حاکم اور محکوم کا تصور نہ ہوتا اور انسان دوسروں کی ضرورتوں اور حاجتوں سے نہ واقفیت حاصل کر سکتا اور نہ ان کو پورا کرنے کی سعی کرتا۔ (دیکھیے، رازی، مفاتیح الغیب، ۲۰۹/۲۸)

۳۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، بیان القرآن، ۲۵۰/۴

جان بوجھ کر کھانے پینے کی اشیاء جن کو عمومی زبان میں رزق کہا جاتا ہے ان کی قلت کا مصنوعی ماحول پیدا کریں جس سے یہ واضح کرانا مقصود ہو کہ امیری اور غریبی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن اس سلسلے میں ہر شخص کو یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے تا کہ معاشرے میں اعتدال کا توازن قائم رہے۔

نماز جمعہ کے بعد زمین میں پھیل جانے اور اللہ کا فضل تلاش کرنے میں بھی یہی حکمت ہے کہ اس کا رزق اور رزق کے وسیع اسباب تلاش کریں۔ اسلامی نظام کا ایک خاص توازن اور زندگی کی ضروریات کے لیے ایک خاص قسم کا اعتدال رکھا گیا ہے کام کاج کی تلاش اور معاش کی فکر بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کی یاد کی فکر بھی ساتھ ساتھ رہے۔ قطب شہید (۱۹۰۶ء-۱۹۶۶ء) لکھتے ہیں:

"والشعور بالله فيه هو الذي يحول نشاط المعاش إلى عبادة"[۱]

معاش کے لیے تگ ودو کرنا تو ضروری ہے لیکن جس معاش کی تلاش میں فکر الٰہی بھی ہو وہ معاش عبادت بن جاتی ہے۔

یعنی معاش کو حرام سے بچانے اور خالصتاً حلال کرنے اور اس میں وسعت اور برکت کے لیے روزی کے اسباب کو بروئے کار لاتے ہوئے بھی اللہ کا خوف اور اس کی یاد ضرور ہونی چاہیے۔ اور رزق کو حلال کرنے کی یہی اصل حکمت ہے۔

مال کی حفاظت

حکمت عملیہ کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ تمام نعمتوں کی قدر کی جائے۔ صحت، جان، آسانیاں وغیرہ سب کی حفاظت کی جائے۔ معاشرے میں تنگدستی، قرض اور محتاجی سے بچنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اپنے مال کی حفاظت کی جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ﴾[۲]

اے ایمان والو! ایک دوسرے کے مال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ، سوائے اس کے کہ آپس میں رضامندی سے تجارت ہو۔

ابن عاشور لکھتے ہیں:

۱۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۲۰۸/۷

۲۔ النساء: ۲۹:۴

”وَحِكْمَةُ إِبَاحَةِ أَكْلِ الْمَالِ الزَّائِدِ فِيهَا أَنَّ عَلَيْهَا مَدَارَ رَوَاجِ السّلع الحاجية والتحسينية، وَلَوْلَا تَصَدِّي التُّجَّارِ وَجَلْبُهُمُ السِّلَعَ لَمَا وَجَدَ صَاحِبُ الْحَاجَةِ مَا يَسُدُّ حَاجَتَهُ عِنْدَ الِاحْتِيَاجِ“[1]

اور زائد مال کے استعمال کی اجازت کے پیچھے حکمت یہ ہے کہ یہ ضرورت مندوں اور اچھی چیزوں کے رواج پر مبنی ہے اور اگر تاجروں کی مزاحمت اور ان کے پاس سامان نہ لانا ہوتا تو ان کے پاس ضرورت کا مالک نہ ہوتا۔ ضرورت پڑنے پر اس کی ضرورت کو پورا کیا گیا۔

کفار کو رزق عطا کرنے میں حکمت

اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والے اور زمین میں معاصی اور فتنہ فساد پھیلانے والے بھی اللہ تعالیٰ کے رزق سے محروم نہیں ہیں اس لیے کہ اس نے سب کو رزق عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔[2] حضرت ابراھیم علیہ السلام کی دعا قرآن کریم میں مذکور ہوئی جس میں آپ نے کافروں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کے رزق سے نفع اٹھانے کی دعا فرمائی تھی[3]۔ آپ علیہ السلام کی دعا کے اندر مومنین اور کفار ہر دو کے لیے دعا میں حکمت یہ تھی کہ مومنین تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے فائدہ اٹھائیں گے اور اس کی وجہ سے ان کی رزق میں مزید اضافہ ہو گا اور پھر جنت عطا کی جائے گی جب کہ کفار کے لیے رزق عطا کرنے میں حکمت یہ تھی کہ ایک تو وہ بھی اس کی مخلوق میں داخل ہیں، دوسرا ان کا دنیا سے فائدہ لینا عارضی ہے اور یہ فائدہ ان کو جہنم سے خلاصی نہیں دلا سکتا۔[4]

رزق کے معاملات میں انسانی افعال اور اس کی غلط تاویلات

معاشرے میں بیع اور تجارت کی جتنی بھی اقسام ہیں سب کی طرف نظر دوڑائیں تو انسان حرص اور طمع میں ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال بنانے کے لیے تگ و دو کرتا نظر آتا ہے، اس طرح جواز کی غلط صورتیں پیدا ہو رہی ہیں اور غلط تاویلات کے پیش نظر حرام کے ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں اور مال خرچ کرنے میں بھی مختلف قسم کی غلط تاویلات کو جواز کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

جس طرح یہود نے ہفتہ کے دن شکار تو نہ کیا[5] کیونکہ حکم الٰہی نہ تھا لیکن پھر غلط حیلے سے ہفتے ہی کے دن حرام کام کو حلال کرنے کے در پے ہونے لگے اور اس کی تاویل یہ کرنے لگے کہ ہم تو اطاعت الٰہی میں ہیں

۱۔ ابن عاشور، التحریر والتنویر، ۲۴/۵

۲۔ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (ھود: ۶/۱۱)

۳۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (البقرہ: ۱۲۶/۲)

۴۔ السعدی، تیسیر القرآن الکریم الرحمٰن، ص ۶۷

۵۔ وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ ۙ لَا تَأْتِيهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (الاعراف: ۱۶۳/۷)

تاکہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی قسم کی سرزنش نہ ہو لیکن ان کی اس غلط تاویل سے اللہ تعالیٰ کا عذاب اور اس کا عتاب نہ رک سکا، اسی وجہ سے جو شخص اپنی ضروریات پر قناعت نہ کرے پھر وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لیتا ہے اور اس طرح وہ جائز اسباب کی تمام صورتیں اور ذرائع اپنے لیے خود بند کر دیتا ہے اور سارے ناجائز ذرائع اپنے لیے محض غلط تاویلات سے کھول دیتا ہے جس کا نقصان معاشرے کے اندر عدم مساوات کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور بڑھتی ہوئی غربت کی وجوہات اور اسباب کے ذریعے سب کے سامنے ہیں۔[1]

حلال کمائی سے حاصل ہونے مال اور رزق کو حلال کاموں میں خرچ کیا جانا عین رضا الٰہی اور حرام کاموں میں خرچ کرنا اسراف اور تبذیر میں داخل ہے، حلال ذرائع سے کمانا مگر حرام جگہ پر خرچ کرنا، یعنی ایک صورت جائز اور دوسری ناجائز ہے تو یہ بھی اسراف اور تبذیر میں داخل ہے، امام قرطبیؒ (۱۲۱۴ء-۱۲۷۳ء) لکھتے ہیں:

"من أنفق درهما في حرام فهو مبذر"[2]

جس شخص نے ناجائز اور حرام امور میں ایک درہم بھی خرچ کیا وہ مبذر یعنی تبذیر کرنے والا ہے۔

قرآن کریم نے قرض حسنہ کی اصطلاح ذکر کرنے کی بھی اصل حکمت یہ ہے کہ تاکہ مال کے دونوں ذرائع کسب اور مصرف پر حدود وقیود کی پہچان کرائی جاسکے۔ کوئی شخص جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے وہ اس بات کا بغور جائزہ لے کہ یہ مال حلال ذرائع میں سے کتنے نفیس اور عمدہ ذرائع سے حاصل ہوا ہے کیونکہ حقیر ذرائع سے مال راہ خدا میں خرچ کرنے سے قرض حسنہ کی تعبیر اور اس حکم پر عمل پورا نہیں ہو سکتا، امین احسن اصلاحی (۱۹۰۴ء-۱۹۹۷ء) لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی راہ میں حقیر، کم وقعت اور ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا مال نہ دیا جائے بلکہ محبوب اور عزیز تر کمائی اور پاکیزہ کمائی میں مال اللہ کی راہ میں دیا جائے تاکہ مال کی اندر اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق برکتوں کا حصول ممکن ہو سکے۔"[3]

سرمایہ داری نظام اور سوشلزم نظام اسلام کے نظام معشیت کے مساوی نہیں ہو سکتے، انسان اسلام کو اپنا دین مان کر پھر اپنے اختیار سے اکتساب مال کے ذرائع متعین نہیں کر سکتا کہ حلال اور حرام کا تصور سرے سے ہی غائب ہو جائے، شریعت اسلامیہ نے جن ذرائع کو حلال کہا ہے انہی کے مطابق اور انہی کے اندر رہ کر مال کمانا اور خرچ کرنا ہی حسن کائنات ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ قبیح امور میں داخل ہے کہ ایک مسلمان

۱۔ دیکھیے: وحید الدین، تذکیر القرآن، ۱۶۳/۴

۲۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۲۴۸/۱۰

۳۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۱۳۳/۵

ہوتے ہوئے یہ کہے کہ مال کو کمانے میں اس کا اپنا اختیار ہے ، اس سے معاشرے اور نظام بگڑتے ہیں۔[۱] اسی طرح معاشرے میں اپنا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے یا اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے مال حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع بھی اسلام کے نزدیک منع ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اولاد کے مستقبل میں غربت اور افلاس کے ڈر سے ناجائز ذرائع حاصل کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے جس کے اندر حکمت یہ ہے کہ تاکہ توکل کا درجہ مسلمان کے اندر برقرار رہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حرص اور طمع میں آکر نیک اور شریف رشتے کو ٹھکرانا حکمت نہیں ہے بلکہ اصل حکمت اسی میں ہے کہ جب بھی نیک رشتہ آئے تو فوراً قبول کرنا چاہیے اور افلاس اور تنگی مال کا ڈر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ توکل کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ بہت زیادہ راستے کھول دیتا ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ فقر وفاقہ کو عارضی سمجھے اور اسی طرح امیری اور تونگری کو بھی وقتی خیال کرے۔[۲]

زمین میں موجود تمام چیزیں انسانوں ہی کی منفعت کے لیے پیدا کی گئی ہیں لیکن ان اشیاء میں حلال اور حرام کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ انسان اپنے اختیار اور شیطان کے ڈالے ہوئے زعم سے یہ گمان کرتا ہے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے جب کہ شریعت اسلامیہ اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اصل قانون اور حکمت یہ ہے کہ کسب مال میں ان تمام پاک چیزوں سے نفع حاصل کرنا جائز ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہو۔ جن میں تنگی ، ناجائز پابندی اور سخت گیری نہ ہو ، اور اس کے ساتھ یہ شرط ضرور ہے جس کو قطب شہید نے لکھا ہے:

"جعله له حلالا ، لا يقيده إلا أمر خاص بالحظر ، وإلا تجاوز دائرة الاعتدال والقصد. ولكن الأمر في عمومه أمر طلاقة واستمتاع بطيبات الحياة ، واستجابة للفطرة بلا كزازة ولا حرج ولا تضييق .. كل أولئك بشرط واحد ، هو أن يتلقى الناس ما يحل لهم وما يحرم عليهم من الجهة التي ترزقهم هذا الرزق. لا من إيحاء الشيطان الذي لا يوحي بخير لأنه عدو للناس بين العداوة."[۳]

اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کے تمام چیزوں کو انسان کے لیے پیدا کیا اس کے لیے ان کا استعمال حلال قرار دیا ہے سوائے اس کے کہ کسی چیز کے بارے میں ممانعت کا کوئی حکم آیا ہو ، یا یہ کہ کوئی حکم نہ بھی ہو تو بھی یہ عام حکم موجود ہے کہ کسی چیز کا استعمال حد اعتدال سے زیادہ نہ ہو۔ لیکن اصل پالیسی یہ ہے کہ دنیا کی تمام پاک چیزوں سے فائدہ اٹھانا

---

۱ ۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۷/۱۴۴

۲ ۔ الازہری، ضیاء القرآن، ۳/۳۲۱

۳ ۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۱/۱۲۶

جائز ہے، تقاضائے فطرت کے عین مطابق، تنگی، سخت گیری اور ناجائز پابندیوں کے بغیر۔ صرف ایک شرط ضرور ہے وہ یہ لوگوں کے لیے کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے ؟اس کا فیصلہ صرف اللہ کے پاس ہو، کیونکہ اللہ ہی نے ان طیبات کو پیدا کیا ہے، لہٰذا حلال و حرام کے احکامات وہ اس شیطان سے اخذ نہ کریں جو ان کا بین دشمن ہے۔ وہ تو انہیں صرف برائی اور فحش کا حکم دیتا ہے۔ اور بغیر کسی ثبوت و یقین کے یہ شیطان اللہ پر افتراء باندھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف کفر کی نسبت کر کے اس کی توہین کرتا ہے۔

حلال ذرائع میں بھی حد اعتدال ضروری ہے اور حلال کو حرام یا حرام میں سے حلال کی تلاش کے لیے شیطان کی پیروی ہے اور راہ حق سے بے راہ روی کی بنیادی وجہ ہے۔

ملکی معیشت کے استحکام کی حکمت عملی

حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ کا خواب سننے کے بعد یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ سات سال بعد ایک ایسا قحط برپا ہونے والا ہے جو تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے گا اور لوگ غذائی قلّت کا شکار ہو جائیں گے، آپ علیہ السلام ایک خزانے کے وزیر ہونے کی حیثیت سے یہ حکمت عملی طے فرمائی کہ سات سالوں میں قحط آنے سے پہلے تک مضبوط اور منظّم بنیادوں پر غذائی قلّت کا مقابلہ کرنے کے لیے حکمت عملی تیار کر لی جائے۔ ان سات سالوں میں عوام کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور مختلف قسم کے اجناس کو محفوظ کرنے کی حکمت عملی بھی تیار کر لی جائے۔ جب قحط نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا تو نہ صرف مصر کے عوام غذائی قلّت سے محفوظ رہے بلکہ ارد گرد کے علاقے بھی آپ علیہ السلام کی حکمت عملی کی وجہ سے قحط میں آپ سے غلہ لینے میں محتاج ہوئے۔

امام جصاص کے نزدیک اس واقعے سے ہر حاکم کو نصیحت لینی چاہیے کہ جب بھی ملک کے اندر غذائی قلّت اور قحط کا اندیشہ ہو تو اسی طرح اسی حکمت عملی کے تحت مال میں تصرف کرنا چاہیے تاکہ عوام کو بھی غذائی قلّت کا سامنا نہ ہو اور معیشت بھی متاثر نہ ہو۔[۲]

رزق اور اللہ تعالیٰ کا خوف

قرآن کریم میں رزق حاصل کرنے کے جتنے بھی اسباب اور ذرائع استعمال ہوئے ہیں ان میں سے تقویٰ سر فہرست ہے، اگر دل کے اندر اس کی ذات کا خوف ہے تو ایمان اور شکر بھی زیادہ ہو گا، جتنا بھی رزق ملے گا انسان اس پر شکر کرے گا، اس طرح سے مسلمان ناجائز اور حرام سے کنارہ کشی اختیار کرے گا اور حلال کی

۱۔ قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ. ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ(یوسف: ۱۲/۴۷-۴۸)

۲۔ الجصاص، احکام القرآن، ۱۷۶/۳

طرف رغبت حاصل کرے گا، اور ہر حال میں اس کا شکر بھی ادا کرے گا۔ شکر کی تلقین کرنے میں حکمت یہ رکھی گئی ہے کہ اس سے رزق میں مزید اضافہ ہوتا ہے، امام قرطبیؒ لکھتے ہیں:

"والآية نص في أن الشكر سبب المزيد في الرزق"[1]

آیت کریمہ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ شکر کرنے سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔

سورۃ الاعراف کی آیت کریمہ [2] میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کو حصول رزق کے لیے اور اس کی وسعت اور فراوانی کے لیے ضروری قرار دیا، شیخ ابو سعود ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لوسعنا عليهم الخير، ويسرناه لهم من كل جانب"[3]

(اگر وہ تقوی اختیار کرتے) تو ہم ان کی لیے خیر و برکت میں وسعت پیدا کرتے اور ان کے ہر کام میں آسانیاں پیدا کرتے۔

رزق اور استغفار کی کثرت

قرآن کریم میں کثیر مقامات پر توبہ اور استغفار کرنے کی تلقین کی گئی ہے جس میں حکمت یہ ہے کہ کثرت سے توبہ کرنے اور معافی چاہنا اور اس عمل میں دوام واستمرار رکھنا رزق میں برکت اور اضافے کا سبب ہے، جیسا کہ امام آلوسی (۱۸۰۲ء-۱۸۵۴ء) لکھتے ہیں:

"دائم المغفرة كثيرها للتائبين فوعدهم أنهم إن آمنوا يرزقهم الله تعالى الخصب ويدفع عنهم ما هم فيه"[4]

اللہ تعالیٰ کی ذات تو ہمیشہ بخشنے والے اور توبہ قبول کرنے والی ہے، اسی وجہ سے ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اگر وہ ایمان لائیں اور پھر توبہ اور استغفار کو اپنا شعار بنائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے رزق کے دروازے کھولے گا اور ان سے تکالیف دور فرمائے گا۔

مال کے کسب اور مصرف میں رشوت کا تدارک

سب سے پہلے حاکم وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے کے اندر رشوت کو حاصل کرنے کے تمام اسباب اور ذرائع کو ختم کرے اور پھر معاشرے کے ہر فرد کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ رشوت کے خاتمے کے لیے خود سے بھی کوششیں کریں اس لیے کہ رشوت دوسروں کے حقوق کو جائز طریقے سے سلب کرنے کا ذریعہ ہے۔ ابن عطیہ لکھتے ہیں:

"وأخذ الأموال على فعل ما يجب على الأخذ أو تركه، أو فعل ما يجب عليه تركه"[5]

۱۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ۳۴۳/۹

۲۔ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (الاعراف: ۹۶/۷)

۳۔ ابو سعود، إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم، ۲۵۳/۳

۴۔ الآلوسی، روح المعانی، ۸۱/۱۵

۵۔ ابن عطیہ، عبد الحق بن غالب، المحرر الوجیز، ۴۲۰/۳

کسی شخص کے ذمہ جس کام کا کرنا ضروری ہو اس کے عوض معاوضہ لینا یا جس کو چھوڑ دینا اس کے ذمہ ضروری ہو اس کو کر لینے پر معاوضہ لے لینا رشوت ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [1]

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ انکو حاکموں تک کہ کھاجاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔

اس آیت کریمہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کا حکم مال کے کمانے میں حدود قانون واضح کرتا ہے اور قانون کو بنانے والے حکام وقت ہوتے ہیں ہیں اس لیے ان کی دیانت داری اس طرح واضح ہو گی کہ یہ قانون کی ذریعے مال کی کمائی کے اس ناجائز طریقے کو روکیں اگر وہ اس کو نہ روکیں گے تو ان کی بد دیانتی واضح ہو جائے گی کیونکہ اس طرح تو جس کے پاس مال ہو گا وہ معاشرے میں استعمال کی چیزوں کو خرید سکے گے اور باقی جس کا جی چاہے جس کے حقوق ہڑپ کر لے اور معاملہ یہاں تک آپہنچتا ہے کہ معاشرے میں بسنے والے افراد کے وہ حقوق جو ان ذمہ پر واجب ہیں ادا نہیں ہوتے۔

خلاصہ

حاکم وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدل کے ذریعے ہر ایک تک ان کے حقوق پہنچائے اس لیے کہ رشوت جو کہ ایک چور دروازہ ہے اس کو اس احتیاط کے ساتھ بند کرنے کا بھی حکم دیا کہ حکام کو تحائف اور ہدیے پیش کرنے اور ان کو قبول کرنے میں بھی احتیاط کرنے کا حکم دیا گیا۔اس وجہ سے اسلام نے سب سے پہلے خود معاشرے کو یہ راہ اختیار کرنے سے روکا ہے کہ اپنے ہی پہرہ داروں کو خود اپنی ہی بد آموزی سے چور نہ بناؤ۔اور اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ حکام کو تحفے اور ہدیے پیش کرنے اور ان کے لیے ان کے قبول کرنے کو بھی بہت اچھا نہیں جانا ہے۔

رشوت کا ایک چور دروازہ ہے۔ رشوت کا گناہ ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو سب جانتے ہیں۔ عقل اس کی گواہ ہے۔ فطرت انسانی اس کی شاہد ہے، دنیا کا معروف اس پر حجت ہے اور تمام مذاہب و ادیان اس کی حرمت پر متفق ہیں۔

---

۱ ۔ البقرہ: ۱۸۸/۲

مبحث دوم:

صَرف مال میں حدود و قیود کی حکمت کے تفسیری اطلاقات

انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں سے اور اس کی طرف سے دی گئی نعمتوں سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے جو رزق اور مال حاصل کرتا ہے، کچھ لمحات کے لیے عقل یہ دھوکہ ڈالتی ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی زمین کا حقیقی مالک اور وہی حقیقی رازق ہے لیکن انسان نے مال اپنی عقل، محنت اور حکمت عملی سے کمایا ہے پھر اس کو خرچ کرنے اور اس کے اندر خاص قسم کے حصے کیوں مقرر کیے گئے ہیں۔ تو انسان کو چاہیے کہ عقل یو یہ جواب دے کہ قرآن کریم میں یہ حکم واضح ہے کہ اغنیاء کے اموال میں فقراء کے حق اور حصہ ہے اور یہ مال کو پاک کرنے کا ذریعہ اور سبب ہے لیکن اس کی دنیوی اور دینی فوائد، مصلحتوں اور حکمتوں پر گہری نظر دوڑائیں تو یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کے اندر کیا حدود اور کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

سید قطب شہید (۱۹۰۶ء-۱۹۶۶ء) مال کے خرچ کرنے کی حکمت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "إن قيمته هي الانعتاق من ربقة الحرص والشح والضعف والأثرة. انعتاق الروح من حب المال الذي يقبض الأيدي عن الإنفاق، ويقبض النفوس عن الأريحية، ويقبض الأرواح عن الانطلاق. فهي قيمة روحية يشير إليها ذلك النص على حب المال. وقيمة شعورية أن يبسط الإنسان يده وروحه فيما يحب من مال."[1]

> انفاق فی سبیل اللہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان لالچ، خود غرضی اور بخل کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مال کی محبت تو ہاتھوں کو انفاق سے کھینچ لیتی ہے۔ انسان بلند ہمتی، اولوالعزمی، جود و سخا اور داد و ہش کے مقام بلند سے گر جاتا ہے اور روح انسانی میں کشادگی نہیں رہتی۔ اسلامی نظام میں انفاق کا ایک روحانی مقام ہے۔ اس لیے یہ ان مسلمانوں کو بھی حکم دیا جاتا ہے کہ مال کی محبت کے باوجود اپنا محبوب ترین اور پسندیدہ ترین مال کو دل و جان کی آمادگی اور کشادگی کے ساتھ خرچ کریں۔

غرباء پر مال خرچ کرنے میں یہ حکمت بھی ہے کہ انسان کے اندر لالچ، خود غرضی اور بخل جیسی بیماریوں کو خاتمہ ہو جائے، مال کی محبت تو تقاضا کرتی ہے کہ انسان نے یہ اپنی محنت سے کمایا ہے بس یہی محبت اور غرض انسان کو جود و سخا جیسی عظیم صفات سے گرا دیتی ہے اور انسان روحانی طور پر پستی میں چلا جاتا ہے۔ اسلام کے صرف مال کا نظام حقیقی طور پر ایک روحانی نظام ہے اس روحانی نظام میں انسان کو ایک خاص حدود اور قیود کے تحت مال خرچ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور وہ اس طرح کہ مال میں سب سے اعلیٰ اور پسندیدہ چیز خرچ کریں اور دوسری قید یہ ہے

۱۔ قطب شہید، فی ظلال القرآن، ۱/۱۳۱

کہ خرچ کرتے وقت دل کی آمادگی اور کشادگی ضروری ہے،اس کا خاص فائدہ اور حکمت یہ ہے کہ تاکہ مومن مال کی محبت اور اس کی غلامی سے نکل جائے۔ لالچ اور حرص سے آزاد ہو جائے اس طرح وہ ذلت کے بجائے اللہ تعالیٰ کے بارگاہ میں عزت اور اکرام والا ہو جائے گا۔

صرف دولت یا صرف مال میں قرآن کریم کی تعلیمات عدل کی ہیں کہ مال کی کمائی بھی حلال کی ہو اور مال جائز اور شریعت کے قائم کردہ اور متعین کردہ مقامات پر مال صرف ہو۔ مال کا مالک بن جانے کے بعد انسان کو آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا کہ جس طرح جیسے چاہے مال کمالے اور جہاں جہاں چاہے خرچ کرے بلکہ دونوں اطراف سے اللہ کا قانون لاگو ہوتا ہے کہ مال کے کمانے کا بھی طریقہ حلال کا ہو اور خرچ کرنا بھی حلال اور جائز مقامات پر ہو اس طرح صاحب مال اور صاحب دولت کا بھی ایک خاص قسم کی ذمہ داری اور حقوق ہیں جن کو پورا کرنے اس کے لیے ضروری ہے۔[1] اس لیے ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ﴾[۲]

نیکی صرف یہی نہیں کہ اپنے چہرے کو قبلہ رخ کر لیا جائے بلکہ ایمانیات اور اس کے بعد اہم درجہ اور اہم ذمہ داری اپنی دولت میں اپنوں اور غیروں میں سے غرباء پر دولت خرچ کرنا اصل نیکی اور عنداللہ اجر کا کام ہے۔

جو صاحب حیثیت اور صاحب مال شریعت کے اصولوں کے مطابق مال کو خرچ کرے گا وہ ضرور اعتدال اور انفاق فی سبیل اللہ پر عمل کرنے والا ہو گا اور ایسی عادات جو عنداللہ معیوب ہیں اور انفاق فی سبیل اللہ کی ضد بھی ہیں ان سے بھی بچنے کا سبب یہی ہے کہ راہ اعتدال اختیار کر کے مال کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقوں پر خرچ کیا جائے۔ قرآن کریم میں کنجوسی کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾[۳]

تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے نہ رکھو اور نہ اس کو پوری طرح کھول دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہو۔

جب کہ اکتناز یعنی مال کما کر اس کو اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرتے رہنے کی بھی ممانعت آئی ہے، ارشاد ربانی ہے:

۱۔ مفتی شفیع، معارف القرآن،۶/۴۱۷

۲۔ البقرہ:۲/۱۷۷

۳۔ البقرہ:۲/۱۷۷

﴿يَّوْمَ يُحْمٰي عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰي بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾ [1]

جس دن دوزخ میں اس پر آگ دہکائی جائے گی پھر داغی جائیں گی اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پشتیں اور انھیں بتایا جائے گا کہ یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا تو اب چکھو سزا اس کی جو تم جمع کیا کرتے تھے۔

اسی طرح سورۃ التکاثر [2] میں مال جمع کرنے والے کو ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے۔اسی وجہ سے کسب کی ممانعت نہیں ہے بلکہ کسب کے ساتھ انفاق کو بھی شامل کیا گیا تاکہ معاشرے میں غربت کے خاتمے کے ساتھ امن وسکون اور اخوت اور بھائی چارہ کا رشتہ قائم ہو سکے،ابوالکلام (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک نظام معیشت کا تعلق ہے قرآن نے اکتساب مال کا معاملہ انفاق مال کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے وہ فرد کے حق اکتساب سے تعرض نہیں کرتا لیکن اس حق کو انفاق کی ذمہ داری کے ساتھ باندھ دیتا ہے۔ جس قدر کما سکتے ہو کماؤ لیکن کوئی کمائی جائز تسلیم نہیں کی جاسکتی اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتناز کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروزہ کھلا نہ رکھے قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک، اور مستحق عقوبت ہے۔" [3]

اکتناز کے ساتھ ساتھ بخل اور کنجوسی کی بھی ممانعت کی گئی ہے جس کا ذکر درج بالا آیات کریمہ میں بھی کیا گیا ہے کیونکہ بخل انفاق کی ضد ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی اخلاقیات پر بھی گہرا اثر ڈالتی ہے، یعنی ایک مسلمان کے اچھے اخلاق کی صفات میں یہ عمدہ صفت ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ بخیلی اور کنجوسی کی صفت والا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تبذیر اور اسراف کی بھی ممانعت ہے [4]، تبذیر کا مطلب بے محل اور بے جا خرچ کرنا اور اسراف کا معنی حدود سے تجاوز کرنے کے ہیں، قرآن کریم میں کھانے، پینے اور مال خرچ کرنے میں اسراف سے منع کیا گیا ہے۔اس طرح مفسرین نے اسراف کی بھی درج ذیل صورتیں درج فرمائی ہیں:

۱۔ واجب صدقات سے زیادہ خرچ کرنا کہ خود بھی محتاج ہو جائے۔

۲۔ گناہ (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں میں) خرچ کرنا، اگرچہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو۔ [5]

۱۔ التوبہ: ۳۵/۹

۲۔ (اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ) (التکاثر: ۱/۱۰۲)

۳۔ ابوالکلام، ترجمان القرآن، ۳۶۱/۲

۴۔ سورۃ الاعراف میں اسراف کی ممانعت میں ارشاد باری ہے: (وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ) (الاعراف: ۳۱/۷) اور تبذیر کی ممانعت سورۃ بنی اسرائیل میں وارد ہوئی ہے: (اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (الاسراء: ۲۷/۱۷))

۵۔ مفتی شفیع، معارف القرآن، ۵۰۷/۶

۳۔ غیر ضروری کام میں خرچ کرنا

۴۔ ذاتی ضروریات میں حد سے زیادہ خرچ کرنا۔[1]

اسراف سے ممانعت کی حکمت

بے جا خرچ کرنے کی ممانعت کی بھی ایک خاص حکمت بیان کی گئی ہے، نبی کریم ﷺ نے اسراف کو مال کی اضاعت یعنی مال کے نقصان اور اس کے زوال کی طرف اشارہ فرمایا ہے، عبد الحمید خان سواتی (۱۹۱۷ء-۲۰۰۸ء) لکھتے ہیں:

> ''اسلامی نظام میں کمانے پر بھی پابندی ہے۔اور خرچ کرنے پر بھی۔ اسلام حرام ذرائع سے مال اکٹھا کرنے سے منع کرتا ہے۔اور حلال ذرائع کی ترغیب دیتا ہے۔جب حلال راستے سے مال آجائے تو پھر سارے حقوق ادا کرو۔اس کے بعد جو بچ رہے اسے اپنے مصرف میں لاؤ، اور اگر حقوق ادا نہیں کئے صرف دولت جمع ہی کرتے رہے بیلنس برابر کرتے رہے۔ ذرائع آمدنی کی حلت و حرمت کا خیال نہیں کیا تو پھر خرچ کرنے میں کون سی پابندی قبول کرو گے۔ایک ایک بلڈنگ کے نقشہ تیار کرنے پر ستر ستر ہزار کی رقم اٹھ رہی ہے۔ کیا یہ اسراف وتبذیر کی حد نہیں ہے۔''[2]

اس آیت کریمہ سے اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے اور اسراف سے ممانعت کی حکمت بھی عیاں ہوتی ہے کہ لوگوں کے اندر راہ اعتدال کو پختہ کرنے کے لیے تبذیر اور اسراف کو منع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے مدینہ کی ریاست کو مکمل اسلامی اُصول وضوابط کے مطابق ڈھالنے کے لیے تمام ضروری دفعات شامل فرمائی ہیں۔ عیاشی اور فضول خرچی کی بہت ساری صورتوں کو حرام کیا گیا، اور قانونی طریقے سے مال کے بے جا تصرف اور اسراف کی ممانعت کی گئی، اسی عمل کی وجہ سے زکوۃ اور صدقات کے نظام متعارف کرائے گئے جن کے اندر اصل حکمت یہ تھی کہ بخل کا زور ٹوٹ جائے اور اس امر کو ذرا بھی امکان باقی نہ رہے کہ لوگ ذخیرہ اندوزی کر کے دولت کی گردش کو روک دیں گے اور اسلام کے اسی نظام کی وجہ سے بخیل ذلیل ہوئے اور اعتدال پسند عنداللہ اور معاشرے کی نگاہ میں بھی معزز ہوئے۔ مسلم معاشروں میں اب بھی اسی عمل یعنی زکوۃ اور صدقات ادا کرنے، راہ اعتدال اختیار کرنے، اسراف اور تبذیر سے بچنے جیسی صفات کو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور کنجوسی اور ذخیرہ اندوزی اور اکتناز جیسی حرکات کو معاشرے میں حقارت اور ذلت آمیز سمجھا جاتا ہے۔[3]

ایک خوشحال طبقے میں پائے جانے والے امراض میں تبذیر اور اسراف کے امراض بھی شامل ہیں ان امراض کا اثر صرف انہی پر نہیں بلکہ پورے معاشرے پر پڑتا ہے، اس لیے کہ یہ اُصول فطرت ہے کہ قوم کے امیر

۱۔ کیلانی، تیسیر القرآن، ۴۴۶/۱

۲۔ السواتی، عبدالحمید، معالم العرفان، ۴۵/۹

۳۔ المودودی، تفہیم القرآن، ۶۱۳/۲

اور غنی لوگ قوموں کی اصلاح میں اور بگاڑ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، ان کی اصلاح سے پوری قوم درست اور ان کے بگڑنے سے پوری قوم بگڑ جاتی ہے، اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام نے بھی دعوت دین میں اسی طبقے پر زیادہ توجہ دی اور جب تک ان کی اصلاح کی امیدیں باقی رہیں، انبیاء علیہم السلام مسلسل کوشش کرتے رہے [1]۔اس لیے ابوالکلام لکھتے ہیں:

> ''خوشحال اور ثروت کی حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اگر کسی جماعت میں پھیلی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی برکت نہیں اور اگر صرف چند افراد میں سمٹی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ کیونکہ جب دولت صرف چند افراد ہی کے قبضہ میں آگئی باقی افراد جماعت محروم رہ گئے تو قدرتی طور پر ہر طرح کا غلبہ و تسلط چند افراد کے ہاتھ آجائے گا اور ایسے غلبہ و تسلط کا نتیجہ غرور باطل اور استکبار عن الحق ہے۔''[۲]

خلاصہ

حکمت عملی اسی بات کی متقاضی ہے کہ سیاست مدنیہ میں جو شخص جس طریقے سے بھی معاشرے میں کسب مال اور صَرف مال کے اعتبار سے اپنے حق ادا کر سکتا ہے وہ ضرور کرے۔ اگر خاموش رہا گیا تو ابوالکلام آزاد کی بات جو کہ موجودہ مسائل کی عکاسی کرتی ہے نہ صرف درست ہو گی بلکہ ہر آنے والے نسل اس فتنے اور ان مسائل کا شکار رہے گی تو معاشرے میں جہاں رزق کے معاملے میں عدم توازن کی جو بھی صورت حال ہو اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی زمرے میں شامل سمجھا جائے اور ان مسائل کا تدارک کیا جائے۔ تاکہ معاشرے کی پسے ہوئے طبقے کو ان کے حقوق مل سکیں۔

۱۔ اصلاحی، تدبر قرآن، ۱۰۵/۵

۲۔ آزاد، ترجمان القرآن، ۵۶۶/۲

خلاصہ

قرآن کریم کی اصطلاح (الحكمة) حکمت (ح،ک اور م) کا مادہ جس کا لغوی معنی جہالت، سفاہت سے روک جانا، سیدھی راہ اور سچی بات کرنے کے آتے ہیں۔ حکمت کے اصطلاحی مفہوم میں اہل لغت کے نزدیک اعلیٰ علوم کے ذریعے اعلیٰ اشیاء کی معرفت حاصل کرنا مراد ہے۔ جب کہ مفسرین قرآن کریم میں حکمت کا اصطلاحی معنی مختلف انداز میں کرتے ہیں جس کے مطابق حکمت نبوت، فہم دین، اشیاء کی حقیقتوں کو جاننا، نبی کریم ﷺ کی سنت کا مکمل علم ہونا مراد لیتے ہیں۔

قرآن کریم میں ایسی صفات بطور اصطلاح استعمال ہوئی ہیں جن کے مفاہیم سے واضح ہوتا ہے کہ ان سب صفات یا ان میں سے بعض یا کسی ایک صفت سے موصوف شخص میں حکمت کے اوصاف میں بعض یا زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان صفات میں تیرہ صفات اس مقالہ میں ذکر کی گئی ہیں جو قرآن کریم میں ایک خاص اصطلاح اور صفت کو اپنی اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ان صفات میں (الإصلاح) اپنی اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کی دینی اور دنیوی معاملات میں اصلاح کرنا۔ (التدبر) زمیں اور آسمان میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کرنا، (التذکر) دل اور عقل کو ہوس اور شیطانی وسوسوں سے پاک کر کے صحیح اور صاف نیت سے بار بار اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر غور کرنا۔ (التفکر) اگر ایک مرتبہ قلب اور عقل سے آیات الٰہی کی معرفت اور حقیقت نہ سمجھ آئے تو اس میں بلا تعطل غور کرتے رہنا۔ (السدید) ہر ایسا عمل یا قول اختیار کرنا جو منکر سے روک لے اور معروف کی طرف لے جائے یا باطل سے بچالے اور حق کی طرف لے جائے۔ (العقل) ایسا علم جو نفع بخش ہو اور ایسی معرفت جس سے دارین کی سعادت نصیب ہو جو جہالت، حماقت اور سفاہت سے روک لے۔ (الفرقان) ایسا علم اور ملکہ جس کے ذریعے حق اور باطل کا فرق اور پہچان ہو سکے، ہدایت اور گمراہی کا فرق پتہ چل سکے اور حلال اور حرام کی معرفت حاصل ہو سکے۔ (القسط) افعال اور اُمور کے درمیان عدل اور انصاف قائم کرنے کی صلاحیت کا ہونا۔ (المتوسم) دل کی بصیرت سے مخلوقات کو دیکھ کر فوراً اس کی حقیقت کو جان لینا اور اس کے مقاصد اور اس کی حکمتوں سے شناسائی حاصل کرلینا۔ (النُّهى) جو حرام اور منکرات سے اپنے آپ کو روک لے اور تقویٰ حاصل کرلے۔ (أولو الالباب) اچھے اور برے کی تمیز کرنے والا۔ اپنی خواہشات کو مغلوب کرنے والا خواہشات کو قلب اور عقل کے تابع کرنے والا۔ (أولی الابصار) قرآن کریم کی آیات اور مظاہر قدرت میں غور و فکر کرنے کے بعد صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت کا ہونا۔ ایسے نتائج کا حاصل ہونا جس سے ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو۔ (الحلم) تنگی، مصیبت، سختی میں، دعوت دین میں زبان اور بیان میں نرمی اختیار کرنا، غصہ کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت کا ہونا

اصطلاح (الحکمۃ) قرآن کریم کی ایک مستقل اور ذو معنی صفت ہے جس سے قرآن کے حقائق اور معارف کے علوم مراد ہیں اور ساتھ ہی اس وصف سے شارع کی طرف سے احکامات، عبرت اور نصائح بھی مراد ہیں۔قرآن کریم کی صفت (الحکمۃ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کے لیے ایک نور اور زیور کی حیثیت رکھتی ہے۔اسی نور کی وجہ سے انسان زندگی کے ہر مرحلے میں محتاج ہوتا ہے۔ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کے بندوں نے اسی نور کی وجہ سے مشکلات اور مسائل کے حل تلاش کیے ہیں۔اسی صفت کی وجہ سے لوگ حکیم، بلیغ، اہل حکمت، اہل فراست، اہل کرامت اور محقق کی صفات سے متصف ہوتے ہیں۔قرآن کریم کی صفت (الحکیم) کا معنی یہ ہے کہ یہ ہر فصاحت سے فصیح تر اور ہر بلیغ کلام سے بلیغ تر کلام ہے۔ہر زمانے کے ہر شخص نے اپنی کلام، قول اور فعل میں حکمت، بلاغت اور فصاحت کا اثر قرآن حکیم ہی سے لیا ہے، اس حکمت والی کتاب میں غور وحوض کرنے والے پر بھی اس صفت کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

چونکہ حکمت کا اعلیٰ درجہ نبوت ہے جو نبی کریم ﷺ پر آکر اختتام ہوا اس لیے کہ آپ ﷺ پر نبوت اور رسالت کو ختم کر دیا گیا۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو حکمت کی صفات میں سب یا بعض صفات عطا فرماتا ہے۔

انبیاء علیھم السلام کے لیے حکمت بطور معجزہ اور اپنے وقت اور زمانے میں انسانیت کی دونوں جہانوں میں فلاح کے لیے بہترین حکمت عملی اختیار کرنے کا نام ہے۔اسی طرح دین کے دعوت میں اپنے اپنے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف لوگوں کو بلانے کا سب سے اعلیٰ اسلوب اور طریقہ جو انبیاء علیھم السلام کو سکھایا گیا تھا وہ یہی قرآنی حکمت ہے۔صوفیاء اس کو کرامت، تزکیہ، محبت الٰہی، کشف اور مشاہدات، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اخلاص کے ساتھ عبادات کرنے کا نام دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر نبی اور رسول کو حکمت کے اعلیٰ اوصاف عطا کیے گئے، اقوال میں قوی دلائل اور براھین قاطعہ فراہم کیے گئے، ہر نبی اور رسول کی دعوت کے انداز مختلف تھے ہر قوم کے معاشرتی، معاشی اور سماجی مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے انبیا نے دین کی دعوت دی۔ہر نبی حکمت کے تحت ہی دعوت دین دیتے رہے مگر ہر ایک کا انداز اور اسلوب جدا تھا۔اسی طرح ہر معاشرے کے بنیادی ضروری مسائل کے تمام ہنر اور فنون انبیاء علیھم السلام کو حاصل تھے۔لکڑی، لوہا، طب غرض ہر میدان میں سب سے اعلیٰ حکمت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو عطا فرمائی تھی۔انبیاء علیھم السلام نے اپنی امتوں سے حکمت سے مزین کلام فرمایا، پہلے ماحول کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور پھر صحیح حکمت عملی سے دین کی دعوت کے لیے میدان عمل میں تشریف لائے۔حکمت کے تیسرے رکن احسن طریقے سے مجادلہ کی مکمل صلاحیت اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو عطا فرمائی، ان میں حضرت ابراھیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے نہایت سبق آمیز اور حکمت سے لبریز ہیں۔انبیاء علیھم السلام کی دعوت کے

ابتدائی مراکزان کے اعزہ اور اقربا تھے۔ان کے ظلم وستم کے باوجود انبیاء علیہم السلام کو عطا گئی حکمت کاملہ کا نتیجہ تھا کہ کسی مقام پر حکمت عملی کے بغیر دعوت کا پیغام نہیں پہنچایا گیا۔ان داعین دین میں حسن اخلاق، حلم و محبت، ایثار جیسے اعلیٰ جذبے اور صفات شامل تھیں جو سب حکمت ہی کے مظاہر ہیں۔اس سے واضح ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی عطا سے حکمت کی دونوں صفات یعنی علمیہ اور عملیہ کے جامع تھے۔

اللہ تعالیٰ نے نیک لوگوں کو حکمت کی صفات میں سے کچھ صفات عطا فرمائی ہیں اسی حکمت کی وجہ سے وہ لوگ قبیح اور منکرات سے دور رہتے ہیں۔ حکمت کی وجہ سے ان کے قول، فعل اور علم میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے پھر ایسے لوگ ہی داعی کے حقیقی رتبے پر پہنچ جاتے ہیں اور ایسے لوگ ہی دین کی دعوت دینے کے اہل ہوتے ہیں۔حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت عطا فرمائی گئی ،آپ نے اس وقت کے حالات اور مسائل کے مد نظر رکھتے ہوئے لوگوں کی عقلوں کے مطابق دین کی دعوت دی۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکمت کے بدلے میں زیادہ سے زیادہ شکر کرنے کا حکم دیا گیا۔پھر جس نیک لوگوں کو یہ حکمت عطا کر دی جاتی ہے وہ انسانیت کو شرک سے دور رہنے ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کرتے ہیں۔اپنی ذات کا تزکیہ کرنے ، والدین کا ادب اور احترام کرنے،ان سے حسن سلوک کرنے کی تلقین کرتے ہیں جیساکہ حضرت لقمان علیہ السلام کی نصائح جو قرآن کریم میں مذکور ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے۔

مفسرین کرام نے حکمت کو اقسام میں منقسم کیا ہے۔حکمت عملیہ اور حکمت علمیہ۔حکمت عملیہ سے مراد ہے نفس کو برائیوں سے بچانا اور نیکیوں سے آراستہ کرنا اور حکمت علمیہ سے مراد ہے نفس الامر اور واقع کے حقائق کا علم اور ادراک کرنا ہے۔

اسی طرح مفسرین کرام نے حکمت عملی کی تین قسمیں درج فرمائی ہیں۔ اگر اس کا تعلق ایک فرد کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اس کو تہذیب اخلاق کہتے ہیں اور اگر اس کا تعلق ایک خاندان کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اسے تدبیر منزل کہتے ہیں اور اگر اس کا تعلق ایک شہر یا ملک کی اصلاح کے ساتھ ہو تو اس کو سیاست مدینہ کہتے ہیں۔

علم تہذیب اخلاق کا تعلق انسان کا اپنی ظاہری اور باطنی پاکیزگی اختیار کرنا ہے اور اس پہلو کا تعلق حسن اخلاق اور تزکیہ نفس کے ساتھ ہے۔ہر وہ عمل جس سے عبادات میں خلوص ، خشوع اور خضوع ہو اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معاملات میں قول، عمل وغیرہ میں حسن اخلاق کو تمام پہلوؤں کو حتی الوسع اپنانے کا نام تہذیب اخلاق ہے اور انہی اِمور کو صحیح طور پر جاننے ،اور پھر ان پر عمل پیرا ہونے کا نام حکمت ہے۔

حکمت عملیہ کی دوسری قسم علم تدبیر منزل کا تعلق ایک انسان کا اپنے والدین کے ساتھ ، بیوی اور اِولاد کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور ان کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کرنا ، بیوی کو تمام تر جائز حقوق دینا اور بیوی کے ذمہ خاوند کے تمام تر جائز حقو کا خیال رکھنا ، دونون کا اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانا ، بلا تفریق اِولاد کے ان کے حقوق ادا

کرنا جو قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں، شامل ہیں۔ ان حقوق اور ذمہ داریوں کا علم حاصل کرنا، ان حقوق اور ذمہ داریوں کی حکمتوں اور حقیقتوں کو سمجھنا اور پھر ان کو ادا کرنے کے لیے حکمت عملی اختیار کرنے کا نام علم تدبیر منزل ہے۔

علم سیاست مدن میں رشتہ داروں، پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں امن وسکون کے لیے ہر ممکن اقدام کرنا ہر فرد کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ حاکم اور رعایا دونوں سیاست مدن کے رکن ہیں۔ دونوں سے مل کر ہر ملک کے اندر امن واستحکام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ممکن ہوتا ہے جس کا مقصد ملک کے اندر بسنے والے ہر فرد کی دینی اور دنیوی فلاح اور نجات ہے۔ لہٰذا رعایا اگر حقوق لینے کی پابند ہے تو ذمہ داریوں کا بھی إحساس کرنا ضروری ہے اور حاکم کی اگر ذمہ داریاں ہیں تو عوام پر حاکم کی اطاعت وغیرہ جیسے حقوق بھی شامل ہیں۔ شہری اور ملکی زندگی کے خوش حالی کے اقدامات کرنا چاہے وہ عوام کی طرف سے ہوں یا حاکم کی طرف سے یا بدامنی اور فسادات کو ختم کرنے کے لیے تدبیر، حکمت عملی تیار کرنا اور اس پر عمل درآمد کرنے اور کرانے کے لیے اقدامات کرنا علم سیاست مدن ہے۔ اور اس کے لیے قرآن کریم میں قوانین بیان کر دیئے گئے ہیں جن کو مفسرین کرام نے تفصیلا درج فرمایا ہے اور جو اس مقالہ میں بھی شامل ہیں۔ علم سیاست مدن میں مال کے کمانے کے تمام جائز ذرائع اور مال خرچ کرنے کے ایسے تمام راستے جن کو شریعت نے لازم قرار دیا ہے، علم سیاست مدن کا حصہ ہیں۔ جو شخص ان سے واقف ہے وہ صاحب حکمت ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کثیر عطا کر دی گئی ہے۔

آسان پیرائے میں حکمت چارہ گری کرنا، درست بات اور سچی بات کرنا، سمجھ بوجھ رکھنا، عاقلانہ گفتگو اور عقل مند طرز زندگی اختیار کرنا، انسانی اعضاء کی ظاہری بیماریوں کا علاج و معالجہ کرنا، زندگی کے تمام معاملات میں اعتدال اور کفایت شعاری اختیار کرنا، ہر کام کی حقیقت جاننے کا علم حاصل کرنا، معاملات زندگی کا بہترین انتظام کرنا، بہترین حکمت عملی اختیار کرنا جس سے درست اور فائدہ مند نتائج حاصل ہو سکیں۔ ایسا علم جو اللہ تعالیٰ کی معرفت، خشیت، تقوی، انسانیت کے ساتھ شفقت اور مہربانی سکھائے یہ حکمت کا علم ہے۔

نتائج

۱۔ قرآنی اصطلاح (الحکمۃ) کا وسیع مفہوم ہے۔ ہر ایک مقام پر اس اصطلاح قرآنی سے الگ اور ممتاز مفہوم اور تشریح واضح ہوتی ہے۔

۲۔ تفسیر بالماثور کے تفسیری ادب میں غالب رجحان یہ ہے کہ کتاب کے بعد اصطلاح (الحکمۃ) سے مراد نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ اگر یہی اصطلاح الگ استعمال ہو اس کا مفہوم دین کی مکمل فقہ حاصل کرنا، دین پر اتباع کے طریقوں کی مکمل معرفت حاصل کرنا ہے۔

۳۔ جدید مفسرین نے حکمت کو عقل، نفسیات اور فطرت کے ساتھ منطبق کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حکمت نظریہ اور حکمت عملیہ (تہذیب نفس، تدبیر منزل اور سیاست مدن) کو بھی حکمت قرار دیا ہے۔

۴۔ قرآن کریم میں ایسی اصطلاحات موجود ہیں جن کے مفہوم سے مختلف اوصاف نمایاں ہوتے ہیں اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک وصف یا یہ سارے اوصاف حکمت کے اوصاف یا حکمت ہی کا پرتو ہیں اور یہ حکمت کی قریب المعنی قرآنی اصطلاحات بھی ہیں۔ حکمت جتنے اوصاف کو شامل ہے یہ اوصاف قرآنی اصطلاحات کی شکل میں قرآن کریم میں مذکور ہوئے ہیں۔

۵۔ حکمت کے مختلف اوصاف قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ انبیاء کرام کے اوصاف حکمت میں کامل توکل، کامل یقین، تہذیب واخلاق اور عمل وکردار کی مکمل معرفت مراد ہے۔

۶۔ نبی کریم ﷺ آخری نبی ہونے کے اعتبار سے حکمت کے جامع اوصاف جن میں قرآن کریم کا مکمل فہم اور اس کے ساتھ تدبیر تہذیب نفس، تدبیر منزل اور سیاست مدن میں حکمت کے جامع اوصاف اور کمالات بیان فرمائے ہیں۔

۷۔ وصف حکمت کا عطا کیا جانا صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ وصف اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اپنے اور نیک بندوں کو بھی عطا فرماتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت لقمان علیہ السلام کے وصفت حکمت سے ظاہر ہوتا ہے۔

۸۔ دین کی دعوت کے لیے قرآنی وصف (الحکمۃ) کو مد نظر رکھنا ضروری ہے یہ بہت وسیع المعنی اصطلاح ہے۔ ہر زمانے میں داعی کے اوصاف، مدعو کا انداز اور دعوت کا طریقہ کار مختلف رہا ہے لہٰذا تینوں ارکان کے اعتبار سے حکمت کو سمجھنے اور حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

۹۔ حکمت عملیہ کے تینوں شعبوں (تہذیب نفس، تدبیر منزل اور سیاست مدن) یعنی اپنی ذات کے ظاہر و باطن کی اصلاح کی مکمل رہنمائی اور پھر خاندان کے دارین کی فلاح کی حکمت عملی، معاشرے، ملک اور قوم کے دو اہم ستون حاکم اور رعایا کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین اور اصلاح اور ملک میں امن وامان کی بہترین حکمت عملی قرآنی اصطلاح (الحکمۃ) کے تحت داخل ہیں۔

سفارشات

۱۔ تفاسیر بالرائے المحمود میں اصطلاح قرآنی (الحکمۃ) کے مفہوم میں اختلاف پایا جاتا ہے لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ ان کی آراء میں کون سا پہلو غالب نظر آتا ہے؟ اس اعتبار سے صرف تفاسیر بالرائے المحمود کے مابین بھی اس اصطلاح کے مفہوم کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ قرآن کریم کی وہ اصطلاحات جو (الحکمۃ) کی ضد ہیں جیسے جہل، منکر، مفسد اور فاسد وغیرہ، ان پر تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ کی ضرورت ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں صفت (الحکیم) جن باقی صفات کے ساتھ بدل بدل کر تکرار کے ساتھ وارد ہوئی ہے ان میں ہر ایک مقام پر الگ الگ مقالہ لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ قرآن کریم کی آیات کے تاخر کا اسلوب اور اعجاز نمایاں ہو سکے۔

۴۔ حکمت عملیہ کا پہلا شعبہ تہذیب نفس کی تنفیذ کو عصری تقاضوں کے مطابق قدیم اور جدید مفسرین کی آراء تجزیاتی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔ حکمت عملیہ کے باقی دو شعبے تدبیر منزل اور سیاست مدن کی تنفیذ میں درپیش مسائل، اسباب اور ان کے حل کے لیے جدید تفسیری ادب کی روشنی میں مقالات لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان دو شعبوں کی حکمتوں اور ان کے مقاصد کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تنفیذ پر کام کیا جاسکے۔

۶۔ حکمت اور فلسفہ کے درمیان فرق میں مفسرین کی آراء کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

۶۔ قرآن کریم کی اصطلاح (الحکمۃ) کے مفہوم کو احادیث مبارکہ اور شروحات حدیث کی روشنی میں بھی سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ لہٰذا آنے والے محققین کو چاہیے کہ وہ احادیث مبارکہ میں حکمت کے مفہوم اور اس کے اطلاقات پر کام کرے۔تاکہ اس وسیع اصطلاح کے اس پہلو کو بھی واضح کیا جاسکے۔

فہارس (Indexes)

فہرست آیات

نمبر شمار	آیات	سورت کا نام	آیت نمبر	صفحہ نمبر
1.	قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَاۖ	البقرہ	۳۲	۱۴۱
2.	وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ	البقرہ	۵۳	۹۸
3.	وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا	البقرہ	۸۳	۲۴۳
4.	وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ	البقرہ	۱۰۲	۲۹،۲۳
5.	رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ	البقرہ	۱۲۹	۱۶۳،۲۲،۱۷
6.	قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ	البقرہ	۱۳۶	۱۷۵
7.	كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ	البقرہ	۱۵۱	۱۶۳،۲۳
8.	وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى	البقرہ	۱۷۷	۳۲۲،۲۶۵
9.	وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ	البقرہ	۱۷۹	۱۱۸
10.	وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ	البقرہ	۱۸۸	۳۲۰
11.	وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ	البقرہ	۱۹۷	۱۱۸
12.	فَإِن زَلَلْتُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ	البقرہ	۲۰۹	۱۳۴
13.	وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ	البقرہ	۲۱۳	۱۶۰
14.	إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ	البقرہ	۲۲۲	۲۳۳
15.	وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ	البقرہ	۲۳۱	۲۵،۲۰
16.	وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ	البقرہ	۲۳۳	۲۵۳
17.	فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ	البقرہ	۲۵۱	۱۷۸
18.	وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ	البقرہ	۲۵۱	۱۷۹،۳۷
19.	أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ	البقرہ	۲۵۸	۱۹۱
20.	قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ	البقرہ	۲۶۳	۲۳۷،۲۳۰

21.	يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ	البقرہ	۲۶۹	۱۲۹،۹۹،۹۷،۶۱،۱۷،۱۹،۱۶
22.	لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا	البقرہ	۲۷۳	۱۰۸
23.	هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ	آل عمران	۷	۱۷۲،۱۳
24.	وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ	آل عمران	۴۸	۲۰۶،۱۹۴،۳۱،۲۵
25.	ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ	آل عمران	۵۸	۱۶۴
26.	وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن	آل عمران	۸۱	۱۷۶،۱۷۵،۳۰،۲۴
27.	قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ عَلَىٰ	آل عمران	۸۴	۱۷۶
28.	وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا	آل عمران	۱۰۳	۲۸۲
29.	وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ	آل عمران	۱۰۵	۲۸۳
30.	كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ	آل عمران	۱۱۰	۲۷۸،۲۱۰
31.	وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ	آل عمران	۱۲۱	۱۶۹
32.	أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ	آل عمران	۱۵۹	۱۷۷
33.	لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ	آل عمران	۱۶۴	۱۷۳،۱۶۵
34.	إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ	آل عمران	۱۹۰	۱۱۷،۱۱۵،۱۲۷،۱۲۵
35.	الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ	آل عمران	۱۹۱	۸۲
36.	إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا	النساء	۱	۲۶۸
37.	وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً	النسآء	۴	۲۴۸
38.	وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً	النساء	۹	۸۶
39.	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا	النساء	۹	۸۷
40.	آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ	النسآء	۱۱	۱۴۲
41.	وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ	النساء	۱۵	۳۰۲
42.	فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوْا عَنْهُمَا إِنَّ اللَّهَ	النساء	۱۶	۳۰۱
43.	إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ	النساء	۱۷	۱۴۳،۹۲،۱۵۲،۹۹
44.	وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ	النسآء	۲۴	۱۴۴
45.	وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَي	النسآء	۳۲	۲۶۱
46.	الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ	النسآء	۳۴	۲۶۱،۲۵۱

47.	وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ	النسآء	۳۴	۲۴۱
48.	وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ	النسآء	۳۵	۲۹۸
49.	وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا	النساء	۳۶	۲۷۰
50.	أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن	النسآء	۵۴	۱۹۲،۳۷،۱۹
51.	فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ	النسآء	۵۵	۲۲۹
52.	إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا	النسآء	۵۶	۱۳۵
53.	رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ	النسآء	۶۳	۱۹۱
54.	فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا	النسآء	۶۴	۱۷۷
55.	أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ	النساء	۸۲	۷۵
56.	فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ	النسآء	۹۲	۱۴۵
57.	وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ	النسآء	۱۱۱	۱۴۶
58.	وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّت طَّائِفَةٌ	النساء	۱۱۳	۱۳۹،۲۷،۱۸۲
59.	وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِن بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا	النساء	۱۲۸	۲۵۵
60.	وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ	النسآء	۱۳۰	۱۴۰،۲۵۵،۱۵۰
61.	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ	النسآء	۱۳۵	۱۰۱
62.	رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ	النسآء	۱۶۵	۱۳۶
63.	يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن	النسآء	۱۷۰	۱۴۶
64.	وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا	المائدہ	۸	۲۹۳
65.	أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ	المائدہ	۴۱	۲۳۳
66.	فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ	المائدہ	۱۰۰	۱۱۸
67.	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ	المائدہ	۱۰۵	۲۲۸
68.	ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰي وَجْهِهَا	المائدہ	۱۰۸	۲۵۹
69.	إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي	المائدہ	۱۱۰	۱۹۶،۲۷،۲۵
70.	إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ	المائدہ	۱۱۸	۱۳۸
71.	وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ	الانعام	۴۸	۶۸
72.	وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ	الانعام	۷۵	۶۷
73.	وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ	الانعام	۸۰	۲۲۰

.74	فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ	الانعام	۸۱	۲۲۰
.75	وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا	الانعام	۸۴	۱۸۴
.76	أُولَئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ	الانعام	۸۹	۳۵
.77	وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ	الانعام	۱۵۲	۲۵۷
.78	وَٱلَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِٱلْكِتَٰبِ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ	الاعراف	۱۷۰	۷۲
.79	لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُونَ بِهَا	الاعراف	۱۷۹	۹۸
.80	إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ	الاعراف	۲۰۱	۷۹
.81	بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ	الاعراف	۲۰۳	۱۸۵
.82	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ	الانفال	۲۹	۹۸
.83	وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ	الانفال	۴۱	۹۶
.84	لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ	الانفال	۶۳	۱۶۸
.85	يَّوْمَ يُحْمٰي عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰي بِهَا	التوبہ	۳۵	۳۲۳
.86	أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ	التوبہ	۷۱	۱۳۹
.87	فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ	التوبہ	۱۰۸	۲۳۳
.88	لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ	التوبہ	۱۱۴	۱۲۸
.89	لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ	التوبہ	۱۲۸	۱۷۷
.90	الر ۚ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ	یونس	۱	۱۵۹،۱۵۶
.91	كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ	ہود	۱	۱۵۷،۱۷
.92	يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا	ہود	۵۱	۲۲۱
.93	اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ	ہود	۷۵	۱۲۹
.94	قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي	ہود	۸۸	۷۱
.95	وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ	ہود	۸۸	۷۱،۲۳۲،۲۲۲
.96	لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا	التوبہ	۱۲۸	۱۶۷
.97	وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ	یوسف	۲۲	۲۳۸،۲۰۴،۱۸۶
.98	يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ	یوسف	۳۹-۴۰	۱۸۷،۲۰۰
.99	قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ	یوسف	۴۴	۱۲۶
.100	قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ	یوسف	۸۳	۱۵۹

.101	وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًاۖ	یوسف	۱۰۰	۱۵۱
.102	قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ۚ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا	یوسف	۱۰۸	۲۱۸،۲۲۸،۲۱۴
.103	هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا	ابراھیم	۵۲	۱۱۹،۲۱۷،۱۲۹
.104	إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ	الحجر	۷۵	۱۰۵
.105	أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ	النحل	۱۷	۷۸
.106	وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ	النحل	۷۱	۳۱۲
.107	وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ	النحل	۷۲	۲۶۴،۲۷۳
.108	إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ	النحل	۱۲۲	۱۹۳
.109	أُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	النحل	۱۲۵	۲۱۶،۲۱۱،۲۰
.110	ٱدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلْحِكْمَةِ وَٱلْمَوْعِظَةِ	النحل	۱۲۵	۲۳۳،۲۲۹،۲۲۶،۲۰۶
.111	وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا	النحل	۱۲۷	۲۴۰
.112	وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ	الاسراء	۳۱	۲۶۰
.113	وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ	الاسراء	۳۳	۲۹۴
.114	ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ	الاسراء	۳۹	۱۸۳،۶۱
.115	تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن	الاسراء	۴۴	۱۹۸
.116	وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ	الاسرآ	۷۰	۲۸۶
.117	وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ	الاسرا	۷۰	۲۹۲
.118	وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن	الکھف	۲۹	۲۹۲
.119	حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ	الکھف	۹۳	۸۵
.120	فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا	الکھف	۹۴	۸۵
.121	يَا يَحْيَى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ	مریم	۱۲	۳۵
.122	إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا	مریم	۴۲-۴۵	۱۸۹
.123	قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ	مریم	۴۷	۱۸۹
.124	فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ	مریم	۹۷	۱۶۸
.125	فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ	طٰہٰ	۴۴	۲۲۶،۲۳۰
.126	قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ	طٰہٰ	۵۱	۲۲۶
.127	قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۖ لَّا يَضِلُّ	طٰہٰ	۵۲	۲۲۶

128.	إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ	طٰہٰ	۵۴	۱۲۲،۹۷
129.	كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ	طٰہٰ	۵۴	۱۱۲
130.	أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ	طٰہٰ	۱۲۸	۱۱۳،۱۲۴،۱۲۳
131.	إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ	طٰہٰ	۱۲۸	۱۱۴
132.	وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ	الانبیاء	۵۱	۲۰۳،۲۰۲
133.	فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا	الانبیاء	۷۹	۱۸۲
134.	وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّن	الانبیاء	۸۰	۱۸۱
135.	فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ	الانبیاء	۹۰	۷۰
136.	وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ	الانبیاء	۱۰۷	۱۷۸
137.	الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ	الحج	۴۱	۱٦۷،۳۰۴،۲۸۴،۲۸۰
138.	فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ	الحج	۴٦	۱۲۳
139.	وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا	الحج	۵۲	۱۳
140.	أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ	النور	۱۰	۱۴۹
141.	وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ	النور	۱۸	۱۷۱
142.	قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ	النور	۳۰	۲۳٦
143.	وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً	الفرقان	۳۲	۳۰٦
144.	إِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ	النمل	٦	۱۳
145.	قَالَ سَنَنظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْكَاذِبِينَ	النمل	۲۷	۱۸۳
146.	قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ إِنِّي أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيمٌ	النمل	۲۹	۲۲۴
147.	قَالَ الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ	النمل	۴۰	۱۸۳،۲۰۲،۱۹٦
148.	قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ	القصص	۲٦	۳۰٦
149.	وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا	الروم	۲۱	۲٦۲،۲۵٦،۲۴٦
150.	تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ	لقمان	۲	۱٦۰
151.	وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ	لقمان	۱۲	۱۹۷،۳۴،۳۲،۲۹،۱۸
152.	وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ	لقمان	۱۵	۲۰۰،۱۹۹
153.	يَا بُنَيَّ إِنَّهَا إِن تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ	لقمان	۱٦	۲۰۰
154.	يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ	لقمان	۱۷	۲۰۱

.155	وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ	لقمان	١٩	٢٣٠
.156	يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ	الاحزاب	١	١٤٧
.157	لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	الاحزاب	٢١	١٧٤
.158	وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ	الاحزاب	٣٣	٢٥٢
.159	ذَلِكَ مِمَّا أَوْحَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ	الاحزاب	٣٤	٢٦٤،١٨٣،٢٥
.160	وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا	سبا	١٠	١٨١
.161	إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ	فاطر	٢٨	٦٤
.162	ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبادِنا	فاطر	٣٥	٢٢٨
.163	يس وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ	یٰسین	٢	١٦٠،١٥٥
.164	وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ	یٰسین	١٧	٢١٧،٢٢٧
.165	فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ	الصافات	١٠١	١٣٠
.166	وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ	صٓ	١٧	١٨٠
.167	وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ	صٓ	٢٠	١٨٠،٣٨،٣٤
.168	كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا	صٓ	٢٩	٧٩
.169	وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا	ص	٤٣	١٩٧
.170	وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا	صٓ	٤٤	١٩٧
.171	قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا	الزمر	٩	١١٩
.172	أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ	الزمر	٢٢	٥٨
.173	رَبَّنَا وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدتَّهُمْ وَمَن	غافر	٨	١٤٠
.174	وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ	فصلت	٣٣	٢٢٢
.175	فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا	الشوریٰ	٤٨	٢١٧،٢٢٨
.176	وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُم	الزخرف	٦٣	١٩٥،١٧٢،٣٢
.177	هٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ	الجاثیہ	٢٠	١٨٦
.178	وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا	الاحقاف	١٥	٢٤٤
.179	وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَاهُمْ	محمد	٣٠	١٠٨
.180	هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ	الفتح	٤	١٣٦،١٥٨،١٤٨
.181	وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ	الفتح	٧	١٣٦

182.	وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا	الفتح	۱۹	۱۳۷
183.	سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ	الفتح	۲۹	۱۰۶
184.	يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ	الحجرات	۱۳	۲۹۳،۲۴۷
185.	أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُم بِهَٰذَا ۚ أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ	الطور	۳۲	۱۲۶،۹۱،۱۳۵،۹۸
186.	مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ	النجم	۱۱	۹۸
187.	حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ ۖ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ	القمر	۵	۱۸،۱۵،۲۰
188.	لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي	الممتحنہ	۱	۲۹۴
189.	رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا	الممتحنہ	۵	۱۴۹
190.	هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو	الجمعہ	۲	۱۸،۲۰
191.	أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فَاتَّقُوا اللَّهَ	الطلاق	۱۰	۱۱۸
192.	هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ	الحشر	۲	۱۷۰
193.	يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ	الجمعہ	۱	۱۵۳
194.	هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو	الجمعہ	۲	۱۶۸،۱۷۹
195.	عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ	التغابن	۱۸	۱۸
196.	فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُواالْعِدَّةَ	الطلاق	۱	۳۱۰
197.	قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ	التحریم	۲	۱۵۲
198.	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا	التحریم	۶	۲۳۲
199.	وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ	القلم	۴	۱۷۴
200.	بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ	القیامہ	۱۴	۱۳۳
201.	وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ	الدھر	۳۰	۱۴۹
202.	قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ	الاعلیٰ	۱۴	۲۳۱
203.	هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ	الفجر	۵	۹۸
204.	وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا	الفجر	۲۰	۲۸۹
205.	أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ	التین	۸	۱۷
206.	فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ . وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ	الزلزلہ	۸-۷	۳۰۸

فہرست احادیث

نمبر شمار	حدیث کا متن	کتاب کا نام	صفحہ نمبر
1	إِنَّ اللهَ يُحِبُّ ثَلَاثَةً وَيُبْغِضُ ثَلَاثَةً، فَأَمَّا مَا يُحِبُّ	شعب الایمان	۵۷
2	اللهُمَّ اهْدِنِي وَسَدِّدْنِي، وَاذْكُرْ، بِالْهُدَى هِدَايَتَكَ	صحیح مسلم	۹۷
3	اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ، فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ	سنن ترمذی	۱۰۹
4	إن لله عبادا يعرفون الناس بالتوسم	معجم الاوسط	۱۱۰
5	إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ، وَإِنَّمَا الْحِلْمُ بِالتَّحَلُّمِ	العمجم الكبير	۱۲۷
6	إِذَا سَمِعْتَ جِيرَانَكَ يَقُولُونَ: أَنْ قَدْ أَحْسَنْتَ	ابن ماجہ	۲۷۳
7	رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللَّهِ	شعب الایمان	۴۵
8	كَلَّا وَاللَّهِ مَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ	صحیح بخاری	۲۶۵
9	كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ	صحیح بخاری	۳۰۸
10	لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فسلَّطه	صحیح بخاری	۴۵

فہرست اعلام

نمبر شمار	اعلام	صفحہ نمبر
1.	ابراھیم بن موسی الشاطبیؒ	۱۰
2.	ابن اثیر	۳
3.	اسماعیل حقی	۶۳
4.	اسرار احمد	۵۴
5.	ابواسحاق خواص	۶۰
6.	اشرف علی تھانوی	۱۲
7.	آلوسی	۳۸
8.	بغوی	۲۲
9.	ثعلبی	۲۱
10.	ابن جوزی	۱۰
11.	جلال الدین قاسمی	۲۹
12.	خازن	۲۶
13.	دامغانی	۱۸
14.	رشید رضا	۳۶
15.	راغب اصفہانی	۱۰
16.	زحیلی	۲۱
17.	زمخشری	۳۵
18.	امام شوکانی	۲۴
19.	ابوطالب مکی	۵۹
20.	سید طنطاوی	۳۰
21.	عبیداللہ سندھی	۵۰
22.	عبدالرحمٰن السلمی	۶۱
23.	فواد عبدالباقی	۱۶
24.	قطب شہید	۴۷

.25	ابن کثیر	۲۲
.26	لقمان	۳۳
.27	مجدالدین فیروزآبادی	۵
.28	ماوردی	۲۱
.29	ابن منظور	۵
.30	مراغی	۳۶
.31	مودودی	۵۲
.32	ہروی	۹
.33	ابن ہمام	۱۲

اصطلاحات

نمبر شمار	اصطلاحات	صفحہ نمبر
1.	عاقلہ	۹۹
2.	مشکلات فواصل	۱۴۸
3.	نزاج	۱۷۸
4.	مادی عطیات	۲۶۷

فہرست مصادر و مراجع (Bibliography)

القرآن الحکیم

1. ابہری، اثیر الدین، ہدایۃ الحکمۃ، انجمن اسلامی حکمت، تہران
2. الآلوسی، سید محمود آلوسی حنفی، (م ۱۲۷۰ھ)، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۳ھ
3. اثری، عبدالکریم ()، تفسیر عروۃ الوثقیٰ، فاران فاؤنڈیشن، لاہور
4. احمد بن حنبل، احمد بن محمد بن حنبل، (م ۲۴۱ھ)، المسند، بیروت، ۱۴۱۹ھ
5. اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور
6. الاصفہانی، علامہ حسین بن محمد راغب، (م ۵۰۲ھ)، المفردات فی غریب القران، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ
7. اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور
8. اعوان، محمد اکرام، اسرار التنزیل، ادارہ نقشبندیہ اویسیہ، لاہور، ۲۰۱۸ء
9. اسرار احمد (۲۰۱۰ء)، ڈاکٹر، منتخب قرآنی نصاب، بک فُیر پبلیشرز، لاہور
10. اسرار احمد، ڈاکٹر، بیان القرآن، بک فُیر پبلیشرز، لاہور
11. آزاد، ابوالکلام محی الدین احمد، (م ۱۹۵۸ء) ترجمان القرآن، بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ۔
12. البخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل، (م ۲۵۶ھ)، الجامع الصحیح المختصرمن امور رسول اللہ، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۲ھ۔
13. البدوی، عبدالرحمٰن، موسوعۃ الفلسفہ، الموسسۃ العربیہ، بیروت، ۱۹۸۴ء
14. البغوی، ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء، (م ۵۱۶ھ)، معالم التنزیل، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ۔
15. البقاعی، ابراھیم بن عمر بن حسین الرباط، (م ۸۵۵ھ)، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، القاھرہ،
16. اَبوالبقاء، اَیوب بن موسی الحسینی الحنفی، (م ۱۰۹۴ھ)، الکلیات معجم فی المصطلحات والفروق اللغویة، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ۔
17. البھوپالی، نواب صدیق حسن خان بھوپالی، (م ۱۳۰۷ھ)، فتح البیان، مطبع امیریہ کبریٰ بولاق مصر، ۱۳۰۱ھ۔
18. البیضاوی، ناصر الدین عبداللہ بن عمر (۶۸۵ھ) أنوار التنزیل وأسرار التأویل، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۱ھ۔
19. پانی پتی، قاضی ثناء اللہ، متوفی ۱۲۲۵ھ، تفسیر مظھری، بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ۔
20. الترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، (م ۲۷۹ھ، الجَامِعُ الْمُخْتَصَرُ مِنَ السُّنَنِ عَن رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومَعْرِفَۃُ الصَحِیْحِ وَالْمَعْلُوْلِ وَمَا عَلَیْہِ العَمَلُ، دارالفکر، بیروت ۱۴۱۴ھ۔

21. التستری، سہل بن عبداللہ،(م ۲۷۳ھ)،تفسیر القرآن العظیم(تفسیر التستری)، مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۲۳ھ

22. التھانوی، مولانا اشرف علی،(م ۱۹۴۳ء)بیان القرآن،لاہور

23. الثعلبی، احمد بن محمد بن ابراہیم،(م ۴۲۷ھ)،الکشف والبیان عن تفسیر القرآن،القاھرہ، ۱۴۱۳ھ

24. الثعالبی، عبدالرحمٰن (م ۸۷۵ھ)،الجواهر الحسان في تفسیر القرآن، مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۲۳ھ

25. الجرجانی، علی بن محمد بن علی،(م ۸۱۶ھ)، کتاب التعریفات، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ

26. ابن الجوزی، عبدالرحمٰن بن علی بن محمد حنبلی،(م ۵۹۷ھ)،زادالمسیر، مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۱۱ھ

27. الجصاص، احمد بن علی ابو بکر الحنفی (م ۳۷۰ھ)احکام القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ

28. جعفر، ڈاکٹر محمد کمال، من قضایا الفکر الاسلامی، دار العلم بیروت، ۱۴۰۴ھ

29. الجوہری، اسماعیل بن حماد،(م ۳۹۷ھ)الصحاح، دار العلم بیروت، ۱۴۰۴ھ

30. ابوالحیان، محمد بن یوسف اندلسی،(م ۷۵۴ھ)، البحرالمحیط، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۹

31. الحقی، اسماعیل بن مصطفیٰ،(م ۱۱۲۷ھ)،روح البیان في تفسیر القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ

32. ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد (م ۴۵۶ھ)،الفصل في الملل والأهواء والنحل

33. الخازن، علاء الدین،(م ۷۴۱ھ) لباب التاویل فی معانی التنزیل، دار العلم بیروت، ۱۴۰۴ھ

34. الدامغاني، حسین بن محمد،(م ۴۷۸ھ)،قاموس القرآن أو إصلاح الوجوه والنظائر في القرآن الکریم، بیروت، ۱۰۸۵ھ

35. الدرویش، محی الدین بن احمد (م ۱۹۸۲ء)،اعراب القرآن وبیانه، دار العلم بیروت، ۱۴۰۴ھ

36. دریاآبادی، عبدالماجد،(م ۱۹۷۲ء) تفسیر ماجدی، مجلس نشریات قرآن، کراچی

37. دنیا، سلیمان، التفکیر الفسلفی الاسلامی، مکتبہ الخانجی، مصر، ۱۳۸۷

38. الدیبور، تاریخ الفلسفۃ فی الاسلام، مترجم: ابوریدہ، محمد عبدالہادی (م ۱۹۵۷ء)

39. الرازی، محمد بن ضیاء الدین عمر رازی،(م ۶۰۶ھ)،مفاتیح الغیب، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ۔

40. ابن رشد، محمد بن احمد بن محمد (۵۹۵ھ)فصل المقال، دار المعارف، بیروت

41. الزبیدی، سید محمد مرتضیٰ حسینی حنفی،(م ۱۲۰۵ھ)،تاج العروس، المطبعہ الخیریہ مصر

42. الزجاج، ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن سہل،(م ۳۱۱ھ)،معانی القرآن واعرابہ، المطبعہ الخیریہ مصر

43. الزحیلی، وھبہ زحیلی (م ۲۰۱۵ء)،التفسیر المنیر في العقیدة والشریعة والمنهج، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۲ھ۔

44. الزمخشری،(م ۵۳۸ھ)، الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الأقاویل في وجوه التأویل ،داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۷ھ۔

45. الزنجانی، علی بن ہارون، رسائل اخوان الصفا، دار الکتاب الاشاعۃ، مصر، ۱۹۲۸ء

46. الزرکشی، عبداللہ بدر الدین (۷۹۴ھ)،البرهان فی علوم القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ۔

47. السلمی، ابو عبدالرحمٰن،(م ۴۱۲ھ)،،حقائق التفسیر (تفسیر السلمی)، بیروت، ۱۴۲۰ھ

48. السعیدی، علامہ غلام رسول سعیدی، (م۱۴۳۸ھ)، تبیان القرآن، فرید بُک سٹال لاہور
49. السمرقندی، ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی، (م۳۷۵ھ)، بحرالعلوم، مکتبہ دارالبازمکہ مکرمہ، ۱۴۱۳ھ۔
50. سندھی، عبیداللہ (۱۹۴۴ء)، تفسیر قرآن، بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ۔
51. السواتی، عبدالحمید خان (۲۰۰۸ء)، معالم العرفان فی دروس القرآن، پشاور۔
52. السعدی، عبدالرحمٰن بن ناصر (۱۹۵۶ء) تیسر الکریم الرحمان فی تفسیر کلام المنان، مکتبہ دارالبازمکہ مکرمہ، ۱۴۲۶ھ۔
53. سید قطب شہید، (م۱۳۸۵ھ)، فی ظلال القرآن، کراچی
54. السیوطی، جلال الدین سیوطی، (م۹۱۱ھ)، الدرالمنثورفی التفسیر بالماثور، مکتبہ آیت اللہ العظمی، ایران
55. السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، مکتبہ دارالبازمکہ مکرمہ، ۱۴۲۶ھ۔
56. السیوطی، تفسیر جلالین، مکتبہ دارالبازمکہ مکرمہ، ۱۴۱۳ھ
57. السیوہاروی، حفظ الرحمٰن، (۱۹۶۲ء) قصص القرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور
58. ابن سینا، علی الحسین بن عبداللہ (م۱۰۳۷ء)، عیون الحکمۃ، مطبع نظام دکن، حیدرآباد
59. ابن سینا، تسع رسائل فی الحکمة والطبیعات، مطبع نظام دکن، حیدرآباد
60. الشربني، محمد بن احمد (۹۷۷ھ، السراج المنير في الإعانة على معرفة بعض معاني كلام ربنا الحكيم الخبير، مکتبہ دارالبازمکہ مکرمہ، ۱۴۱۳ھ
61. الشیرازی، ابو محمد البقلی (م۶۰۶ھ)، عرائس البيان في حقائق القرآن، بیروت، ۱۴۱۴ھ
62. الشیرازی، شیخ ناصر مکارم، تفسیر نمونہ، جوزہ علمیہ قم
63. الشوکانی، محمد بن علی شوکانی، (م۱۲۵۰ھ)، فتح القدیر، دارالمعرفہ بیروت، ۱۴۱۸ھ۔
64. الصابونی، محمد علی، روائع البیان تفسیر الآیات الاحکام، دارالمعرفہ بیروت، ۱۴۱۴ھ
65. صدیقی، عبدالقادر، روح القرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور
66. الطبری، ابو جعفر محمد بن جریر طبری، (م۳۰۷ھ)، جامع البیان عن تاویل ای القران، دارالمعرفہ بیروت، ۱۴۰۹ھ۔
67. الطنطاوی، الجوہری (م۱۹۹۹ء)، الجواهر فی تفسیر القرآن، مصطفیٰ البابی الحلبی اولادہ بمصر، ۱۳۵۰ھ
68. الطوسی، ابو جعفر محمد بن حسن (۴۶۰ھ)، التبیان فی تفسیر القرآن، دارالمعرفہ بیروت، ۱۴۰۹ھ۔
69. الطوسی، خواجہ نصیر الدین، اخلاق ناصری، دارالحکمۃ، تہران، ۱۳۵۱ء
70. ابن عابدین، محمد امین بن عمر الشامی، (م۱۲۵۲ھ)، رد المختارعلی الدر المختار، دارالفکر، بیروت
71. ابن عاشور، محمد طاہر بن عاشور، (م۱۳۸۰ھ)، التحریر والتنویر، مطبوعہ تونس۔
72. ابن عربی، محی الدین (۶۳۸ھ)، تفسیر ابن عربی، دارالفکر، بیروت
73. عبدالعزیز، شاہ، (۱۸۲۳ء) تفسیر عزیزی، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۳۹۷ھ۔
74. عبدالرزاق، شیخ، تمہید لتاریخ الفلسفة الاسلامیة، قاہرہ، ۱۹۵۹ء

75. عثمانی، مولانا شبیر احمد، (م۱۳۵۶ھ)، تفسیر عثمانی، لاہور

76. العمادی، ابو سعود محمد بن محمد (۹۸۲ھ) إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۶ھ،

77. غلام اللہ، خان، (۱۹۸۰ء) تفسیر جواہر القرآن، راولپنڈی، مکتبہ مدینہ مارکیٹ، ۱۴۱۳ھ

78. الغرناطی، احمد بن ابراھیم، البرھان فی تناسب سورالقرآن، وزارۃ الاقاف، کویت، ۱۴۲۲

79. عادل، سراج الدین نعمانی، اللباب فی علوم الکتاب

80. ابن العربی، ابو بکر محمد بن عبداللہ المالکی، (م۵۴۳ھ)، احکام القرآن، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت۔

81. العسکری، ابوھلال (م۳۹۵ھ)، الفروق اللغویہ، دار العلم، مصر

82. ابن عطیہ، ابو بکر قاضی عبدالحق بن غالب اندلسی، (م۵۴۶ھ)، المحرر الوجیز، مکہ مکرمہ

83. ابن الفارس، احمد بن فارس بن زکریا، (م۳۹۵ھ)، مجمل اللغۃ، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۶ھ

84. الفارابی، ابونصر، کتاب تحصیل السعادۃ

85. الفارابی، ابونصر، رسالۃ فی العقل

86. الفراہیدی، خلیل احمد (م۱۷۵ھ) کتاب العین، انتشارات اسوہ ایران، ۱۴۱۴ھ۔

87. فیروزآبادی، مجد الدین محمد بن یعقوب، (م۸۱۷ھ) بصائر ذوی التمیز فی لطائف الکتاب العزیز، قاہرہ، ۱۴۱۶ھ

88. فیروزآبادی، مجد الدین محمد بن یعقوب، (م۸۱۷ھ)، القاموس المحیط، دار احیاء التراث العربی، بیروت

89. القشیری، مسلم بن حجاج، (م۲۶۱ھ)، المسنَدُ الصحيح المختصر من السنن بنقل العدل عن العدل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ۔

90. القشیری، ابوالقاسم، (م۴۶۵ھ)، لطائف الإشارات، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۳ھ

91. القرطبیؒ، ابو عبداللہ محمد بن احمد (م۶۷۱ھ) الجامع لاحکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت

92. ابن کثیر، عماد الدین اسماعیل بن عمر الشافعی، (م۷۷۴ھ)، تفسیرالقرآن العظیم، ادارہ اندلس، ۱۳۸۵ھ۔

93. ابن کثیر، عماد الدین اسماعیل بن عمر الشافعی، (م۷۷۴ھ)، البدایہ والنہایۃ، ادارہ اندلس، ۱۳۸۵ھ

94. الکیاہراسی، علی بن محمد بن علی، (م۵۰۴ھ)، احکام القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت

95. الکاندھلوی، محمد مالک، منازل العرفان فی علوم القرآن، ناشران قرآن لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۸ء

96. الکاندھلوی، محمد ادریس، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۳۹۹ھ۔

97. الکرمانی، محمود بن حمزہ، أسرار التكرار في القرآن (البرهان في توجيه متشابه القرآن)، دار الاعتصام، قاھرہ، ۱۴۱۱ھ

98. کراوس، بول، مختار رسائل جابر بن حیان، دار الحکمۃ، تہران، ۱۳۵۱ء

99. الکیلانی، عبدالرحمٰن، تیسیر القرآن، مکتبہ دار السلام، لاہور، ۱۴۳۲ھ

100. گھمن، الیاس، تفسیر دروس القرآن، مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ

101. الماتریدی، محمد بن محمد بن محمود، (م۳۳۳ھ)، تاویلات اهل السنة، بیروت ۱۴۲۶ھ

102. الماوري، أبوالحسن علي بن محمد بن محمد، (م۳۶۴ھ)النکت والعیون،دارالکتب العلمیہ، بیروت

103. محمد کرم شاہ، پیر محمد کرم شاہ الازہری، (م۱۴۱۸ھ)، ضیاءالقرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور

104. محمود، عبدالحلیم،التفکیر الاسلامی فی الاسلام،دارالمعارف،۱۴۱۱ھ

105. مدکور، ڈاکٹر ابراھیم،فی الفلسفة الاسلامية ، مناهج وتطبيقه،دارالمعارف،۱۴۱۱ھ

106. المراغی،احمد مصطفیٰ المراغی،تفسیر المراغی،داراحیاء التراث العربی، بیروت۔۱۳۹۷ھ۔

107. مفتی محمد، شفیع (م۱۳۹۶ھ)، معارف القرآن،ادارۃ المعارف، کراچی،۱۳۹۷ھ۔

108. ملاجیون،احمد بن ابوسعید بن عبداللہ،(م۱۰۴۷ھ)التفسیرت الاحمدیه فی بیان الآیات الشرعیه،بیروت،۱۳۸۲ھ

109. ملاصدرا، صدرالدین محمد ابراھیم،اسفار اربعه،انجمن اسلامی حکمت، تہران

110. المناوی، زین الدین محمد عبدالرؤوف (م۱۰۳۱ھ)، التوقیف علی مهمات التعاریف،بیروت،۱۳۸۲ھ

111. منظور افریقی، جمال الدین محمد بن مکرم، (م۷۱۱ھ،)لسان العرب، دارالحدیث قاہرہ

112. المودودی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، (م۱۳۹۹ھ)، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔

113. مورس بوکائے،، بائبل، قرآن اور سائنس: مترجم: ثناء الحق صدیقی، وقاص پبلیشرز، سیالکوٹ

114. نجفی، سید صفدر حسین، (م۱۴۰۶ھ)، تفسیر نمونہ، لاہور

115. ندوی، محمد حنیف ندوی، (م۱۳۹۰ھ)، تفسیر سراج البیان، لاہور

116. نعیمی، احمد یار خان (۱۹۷۱ء) تفسیر نعیمی، نعیمی کتب خانہ، گجرات

117. النیشاپوری، علی بن احمد واحدی الشافعی، (م۴۶۸ھ)،الوسیط فی تفسیر القرآن المجید، دارالکتب بیروت۔

118. النیشاپوری، نظام الدین حسن بن محمد القمی (م۸۵۰ھ)، غرائب القرآن ورغائب الفرقان، بیروت۱۴۱۶ھ

119. وحیدالدین خان (۲۰۲۱ء)، تذکیر القرآن، مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی